بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہ القرآن

حدود و تعزیرات اور قصاص

مؤلفہ

مولانا عمر احمد عثمانی

ادارۂ فکر اسلامی

کاشانۂ حفیظ ۲۴۰، ایسر داس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی ۔۳

زندگی کے متفرق مسائل کو فقہ قرآن کریم کی روشنی میں سمجھنے کے لیے

''فقہ القرآن''

کے سلسلے کی دس کتابیں

۱۔ ''فقہ القرآن'' : عبادات (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ)

۲۔ ''فقہ القرآن'' : خاندانی معاملات (نکاح و طلاق وغیرہ)

۳۔ ''فقہ القرآن'' : حقوقِ نسواں اور باہمی حقوق

۴۔ ''فقہ القرآن'' : شہادت و دیتِ نسواں

۵۔ ''فقہ القرآن'' : حدود و تعزیرات اور قصاص

۶۔ ''فقہ القرآن'' : رجم اصل حد ہے یا تعزیر

۷۔ ''فقہ القرآن'' : وصیت و وراثت

۸۔ ''فقہ القرآن'' : عدلیہ اور اجماع

۹۔ ''فقہ القرآن'' : سیرتِ طیبہ کے ازدواجی معاملات

۱۰۔ ''فقہ القرآن'' : بغاوت و خارجیت اور قصاص و بیعتِ رضوان

۱۱۔ ہماری مذہبی جماعتوں کا فکری جائزہ

ادارۂ فکر اسلامی

کاشانۂ حفیظ، ۲۴۰، ایسر داس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی ۔۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فقہ القرآن

حدود و تعزیرات اور قصاص

مؤلفہ
مولانا عمر احمد عثمانی

ادارۂ فکر اسلامی
کاشانۂ حفیظ ۲۴۰، ایسر داس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ، کراچی ۔۳

طبع اوّل : مارچ ۱۹۸۴ء

طبع دوم : مارچ ۱۹۸۴ء/ اپریل ۲۰۰۳ء

مطبع : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی

ناشر : **ادارۂ فکر اسلامی**

کاشانۂ حفیظ نمبر ۲۴۰

گارڈن ایسٹ، ایسرداس اسٹریٹ، کراچی

﴿نوٹ از ناشر﴾

پہلی اشاعت میں موجودہ کتاب **"حدود و تعزیرات اور قصاص"** کو **فقہ القرآن** کی جلد چہارم کے طور پر شائع کیا گیا تھا لیکن اب چونکہ ہم ہر حصے اور ہر جلد کو مستقل عنوان کے تحت شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام جس عنوان سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ متعلقہ کتاب خرید سکیں۔ اور ذہن پر بوجھ نہ رہے کہ جب تک ہم تمام جلدیں نہ خریدیں، تسلسل باقی نہیں رہے گا، لہٰذا اب یہ کتاب جلد اوّل نہیں سمجھی جائے گی بلکہ اپنے عنوان **"حدود و تعزیرات اور قصاص"** کے تحت دستیاب ہوگی۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خان

(صدر ادارۂ فکرِ اسلامی)

(فہرست مشمولات)

سرنامہ	۸
انتساب	۹
تشکر	۱۰
عرض ناشر	۱۱
عرض مؤلف	۱۴
حضرت عائشہ رضؓ کی عمر کے متعلق علمائے دیوبند کی اہم کتاب	۱۶
تعارف کتاب از جناب خالد اسحٰق ایڈووکیٹ	۲۴
کتاب الحدود	۲۹
دو سوال اور ان کا جواب	۳۳
جہالت اور لاعلمی	۳۳
پشیمانی اور ندامت	۳۸
جرائم حدود کی شہادت نہ دینا افضل ہے۔	۴۴
حد کا مجرم عادی ہونا چاہیئے	۴۸
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۴۹
مجبوری کے ماتحت جرائم	۵۱
مجرم کی ذہنی و جسمانی حالت	۵۲
ناگوار فریضہ	۵۵
صحابہ کی طرف سے پردہ پوشی کی تلقین	۵۸
مجرم کو انکار کی تلقین	۵۹
ہمارا رجحان	۶۳
اسلامی حکومت	۶۳
حد زنا	۶۸
پہلی آیت زنا	۷۱
دوسری آیت زنا	۷۱
تیسری آیت زنا	۷۲
محصنات کے معنے	۷۳
عذاب کے معنے	۷۴
چوتھی آیت زنا	۷۴
پانچویں آیت زنا	۷۷
باب حد القذف	۸۰
گالی گلوچ	۸۲
تعزیر	۸۳
افسانہ افک	۸۴
جھوٹی تہمتیں دھرنا	۸۴
افکؔ کے معنے	۸۹
شان نزول کی روایات	۹۲
اس سلسلہ میں شان نزول کی روایات	۹۳
تنقید حدیث (قرعہ اندازی)	۱۰۶
مشرکانہ فال گیری	۱۱۵
توہمانہ فال گیری	۱۱۶
مالکیہ اور حنفیہ کے ہاں قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں	۱۲۴

قسطلانیؒ اور ابن حجرؒ کا بیان ۱۲۴
محمد بن مسلم بن شہابؒ زہری کی تحقیق ۱۲۸
شیعہ اسماء رجال سے ۱۲۹
روایت کا درایتی تجزیہ نمبر(۱) ۱۳۵
〃 〃 نمبر(۲) ۱۳۷
〃 〃 نمبر(۳) ۱۳۹
〃 〃 نمبر(۴) ۱۴۰
〃 〃 نمبر(۵) ۱۴۱
〃 〃 نمبر(۶) ۱۴۱
〃 〃 نمبر(۷) ۱۴۳
〃 〃 نمبر(۸) ۱۴۴
〃 〃 نمبر(۹) ۱۴۵
〃 〃 نمبر(۱۰) ۱۴۶
〃 〃 نمبر(۱۱) ۱۴۷
〃 〃 نمبر(۱۲) ۱۴۹
〃 〃 نمبر(۱۳) ۱۴۹
〃 〃 نمبر(۱۴) ۱۵۰
〃 〃 نمبر(۱۵) ۱۵۱
〃 〃 نمبر(۱۶) ۱۵۳
〃 〃 نمبر(۱۷) ۱۵۵
〃 〃 نمبر(۱۸) ۱۵۶
〃 〃 نمبر(۱۹) ۱۵۸
〃 〃 نمبر(۲۰) ۱۶۰
〃 〃 نمبر(۲۱) ۱۶۲
〃 〃 نمبر(۲۲) ۱۶۵
〃 〃 نمبر(۲۳) ۱۶۶
روایت کا درایتی تجزیہ نمبر(۲۴) ۱۶۹
〃 〃 نمبر(۲۵) ۱۷۰
〃 〃 نمبر(۲۶) ۱۷۳
〃 〃 نمبر(۲۷) ۱۷۵
〃 〃 نمبر(۲۸) ۱۸۳
〃 〃 نمبر(۲۹) ۱۸۶
〃 〃 نمبر(۳۰) ۱۸۸
〃 〃 نمبر(۳۱) ۱۹۰
شان نزول کی دوسری روایت ۱۹۲
حاکم کی اس روایت پر پہلا اعتراض ۱۹۹
〃 〃 دوسرا اعتراض ۱۹۹
〃 〃 تیسرا اعتراض ۲۰۰
کتاب السرقہ ۲۰۲
قطع ید ۲۰۷
قطع کے معنے ۲۰۷
یدؔ کے معنے ۲۱۰
قطع ید کی صورتیں ۲۱۲
مختلف روایات ۲۱۴
دو قابل غور نکتے ۲۱۹
اگر چور گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے ۲۲۲
سارق کے لئے معافی کیوں نہیں؟ ۲۲۳
استثناء کی مثالیں ۲۲۴
دوسری چوری میں بایاں پاؤں کاٹا جائے ۲۲۸
باب قطع الطریق ۲۳۳
باب القصاص والجنایات ۲۳۹

قصاص امم سالفہ میں ۲۴۴
دیت زمانۂ قبل از اسلام میں ۲۵۲
دیت کی مقدار ۲۵۷
دیت کی موجودہ صورت ۲۵۸
القصاص ۲۶۱
قتل عمد ۲۶۹
آزاد آدمی غلام کے بدلے میں ۲۷۱
ذمی کے بدلے میں مسلم ۲۷۲
مستأمن کے بدلے میں ۲۷۴
قصاص میں کوئی امتیاز نہیں ۲۷۹
بیٹے کے بدلے میں باپ ۲۸۰
احادیث کا شان نزول ۲۸۳
اپنے غلام مدبّر اور مکاتب کے بدلے میں ۲۸۶
دوسرے کے غلام کے بدلے میں ۲۸۹
اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو ۲۹۰
مقتول کے ورثاء اگر نابالغ ہوں ۲۹۱
پانی میں ڈبو کر مار ڈالنا ۲۹۲
قصاص میں سزائے موت کا طریقہ ۲۹۳
کسی نے ہل مار کر قتل کر دیا ۲۹۸
مختلف اسباب سے موت کا وقوع ۳۰۰
جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہو جائے ۳۰۱
کوئی مسلمان پر تلوار سونت لے ۳۰۱
قصاص فیما دون النفس ۳۰۳
پہونچے، کہنی یا بغل سے ہاتھ کاٹ دینا ۳۰۷
اگر آنکھ نکال دی جائے ۳۰۸
دانت توڑ دینا ۳۱۱
ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں ۳۱۴
مادون النفس میں شبہ عمد نہیں ۳۱۵
عورت اور مرد، آزاد اور غلام، اور دو غلاموں میں قصاص ۳۱۵
کافر اور مسلم میں قصاص ۳۱۸
نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینا یا زخم جائفہ پہنچانا ۳۱۸
کسی لونجے یا ناقص الید نے اچھے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا ۳۱۹
قتل عمد میں قصاص حق حکومت ہے ۳۲۰
ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۳۲۴
حضرت ابن عباسؓ کی روایت ۳۲۴
ورثاء میں سے اگر کوئی معاف کر دے ۳۳۱
جماعت کسی کو قتل کر دے ۳۳۲
کسی فرد نے جماعت کو قتل کر دیا ۳۳۳
قاتل اگر اپنی موت سے مر جائے ۳۳۴
دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا ۳۳۵
کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی گولی لگ گئی ۳۳۶
قصاص حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۳۳۸
قانون کی بالاتری ۳۳۸
قانون کی عملداری احادیث نبوی کی روشنی میں ۳۴۳

حضرت عثمانؓ کے لافانی مناقب ۳۴۶
بیعت الرضوان کا واقعہ ۳۴۷
سفارت کیلئے حضرت عثمانؓ کا انتخاب ۳۵۱
شان یداللّٰہی ۳۵۴
قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی ۳۵۶
دوسری پیشین گوئیاں ۳۵۹
مزید شہادت ۳۶۲
حضرت علیؓ کی پوزیشن ۳۶۵
حضرت فاطمہؓ کا مطالبۂ وراثت ۳۷۳
مال فئے رسول اللہ کی تحویل میں مملکت کی ملکیت تھا ۳۷۴
انبیاء کرام قوم سے اجر یا صلے کے طلبگار نہیں ہوتے ۳۷۵
ایک سنہری اصول ۳۷۷
سبائی تحریک ۳۸۰
شہادت فاروق اعظمؓ ۳۸۲
عہد عثمانی ۳۸۳
عثمانی فتوحات کی وسعت ۳۸۵
خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت ۳۸۶
حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک ۳۸۹
یہودیوں کی خفیہ تنظیم ۳۹۰
اسلام کے خلاف یہودی تحریک ۳۹۷
ابن سبا کا کردار ۳۹۸
ابن سبا کی بدعتیں اور گمراہیاں ۳۹۹
شیعی عقائد ۴۰۰
وصایت کا عقیدہ یہودیت سے ماخوذ ہے ۴۰۲
اصول کافی شیعہ عقائد کی بنیادی صحیح ترین کتاب ۴۰۲
امامت کے متعلق شیعوں کے عقائد ۴۰۳
امام قائم الزمان آل داؤد کی شریعت کے مطابق حکومت کرے گا ۴۰۵
یہودی عہد نبوی میں ۴۰۶
یہودی اور خلافت صدیق اکبرؓ ۴۰۶
یہودی اور شہادت عمرؓ ۴۰۷
یہودی اور شہادت عثمانؓ ۴۰۸
قاتلین عثمانؓ ۴۰۹
اندرونی عوامل جو یہودی سازش کے ممد و معاون ہوئے ۴۱۴
تحریک ابن سبا اور القوۃ الخفیۃ ۴۲۴
کتاب الدیات ۴۳۳
شبہ عمد کی دیت کیا ہے ۴۴۲
قتل خطاء میں دیت ۴۴۲
دیت عاقلہ پہ ۴۴۴
اجماع کی بحث ۴۴۸
دیت کی مقدار ۴۵۲
اسلامی درہم کا وزن ۴۶۴
عورت کی دیت ۴۶۹
کافر کی دیت ۴۷۲
اعضاء میں دیت ۴۷۴
زخموں کے بارے میں ۴۷۶
حمل ساقط کر دینا ۴۷۶
اگر حمل ساقط ہو اور ساتھ ہی ماں بھی مر گئی ۴۷۷

باب البغاۃ ۴۸۰
ایک ضروری توضیح ۴۸۸
خلیفہ کی ممانعت کے باوجود مفسدین سے قتال ۴۹۰
باغیوں کی تحصیل ووصول ۵۰۱
باب الخوارج ۵۰۲
عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے باغیوں کی تفصیل ۵۰۲
خوارج صدیق اکبرؓ ۵۱۵
خوارج فاروق اعظمؓ ۵۳۲
خوارج عثمان ذوالنورینؓ ۵۳۹
خوارج کون تھے؟ ۵۴۰
خوارج علیؓ ۵۴۰
کتاب التعزیر ۵۴۷
شراب کی تعزیر ۵۵۱
شراب کا حکم ۵۵۳
کیا شراب حرام ہے؟ ۵۵۵
شراب نوشی پر حد ۵۵۹
تعزیر کا مقصد ۵۶۲
حد نہیں بلکہ تعزیر ہے ۵۶۷
احکام مرتدین ۵۶۹
لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ ۵۸۰
قتل مرتد کا نظریہ کیسے پیدا ہوا ۵۹۱
ابتداء اسلام میں ارتداد کے ساتھ بغاوت ۵۹۴
سادات حنفیہ کی تصریحات ۵۹۶
قتل ارتداد کی نہیں بلکہ بغاوت کی سزا ہے ۵۹۷
مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ کے معنے ۶۱۲
روایات نبویہ میں محاربہ کی شرط ۶۱۴
شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا استدلال ۶۱۹
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا استدلال ۶۲۱
باب الرجم ۶۳۲
رجم اصل حد ہے یا تعزیر ۶۳۲
اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ متفقہ طور پر عام ہے ۶۳۳
عام کی تخصیص جائز نہیں ۶۳۴
خبر مشہور سے عام کی تخصیص ۶۳۷
خبر مشہور خبر واحد ہی ہوتی ہے ۶۴۰
سورۂ نور کا سال نزول ۶۴۲
علامہ محمد سلام مدکور پروفیسر قاہرہ یونیورسٹی کی تائید ۶۴۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سرنامہ

فقہ القرآن کی اس جلد میں حد قذف بیان کرتے ہوئے افک نامی افسانے کی تردید کی گئی ہے، اور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ام المؤمنین سیدۂ کائنات حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دامن پر گرائے ہوئے چھینٹوں کو صاف کیا گیا ہے۔ نیز قصاص کی بحث میں خلیفۂ مظلوم شہید اعظم خلیفۂ ثالث امیر المؤمنین حضرت عثمان غنی ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے المناک قتل کے قصاص نہ لئے جانے اور تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ قانون کی بالاتری برقرار نہ رہنے پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اس لئے ناچیز مؤلف فقہ القرآن کی اس جلد کو حضرت سیدہ کائنات رضؓ اور حضرت ذی النورین رضؓ کے حضور بطور نذرانۂ عقیدت و اخلاص پیش کرتا ہے۔

عمر احمد عثمانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انتساب

میں قرآن کریم کی اس خدمت کو جو میری نسبت سے نہایت ہی عظیم المرتبت ہے۔ حسب سابق فقہ القرآن کی اس جلد کو بھی اپنے جد امجد حضرت حکیم الامۃ مجدد الملۃ مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نیز محدث العصر حضرت الاستاذ الشیخ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ شارح مؤطا و بخاری کے اسماءِ گرامی سے معنون کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جن کی دعاؤں اور توجہاتِ عالیہ نے مجھے قرآن کریم کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

پر تقصیر و ناکارہ
عبد من عبادہ عمر احمد عثمانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(تشکر)

من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ

(ترمذی)

میں صمیم قلب کے ساتھ ادارۂ فکر اسلامی کراچی کے تمام اراکین خصوصًا ادارہ کے چیرمین اور صدر جناب محترم ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب (ایس۔ ایس۔ ایم۔ ڈی۔ ایف۔ سی سی پی امریکہ) اور ادارہ کے سکریٹری جنرل مولانا قاری طاہر المکی (ناظم جامعۃ مدینۃ العلوم کراچی) کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہوں کہ اول الذکر موصوف کی مالی جدوجہد اور ثانی الذکر کے علمی تعاون اور زریں مشوروں سے فقہ القرآن جلد چہارم ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

فجزاھما اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

آمین

عمر احمد عثمانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(عرض ناشر)

ھٰذَا کِتٰبُنَا یَنۡطِقُ عَلَیۡکُمۡ بِالۡحَقِّ

(یہ ہماری کتاب ہے جو تمہارے سامنے حق بات ہی بیان کرے گی)

فقہ القرآن جلد سوم کو ہدیۂ ناظرین کئے ہوئے ایک سال ہوا ہے۔ اور اب میں نہایت ہی مسرت اور فخر کے ساتھ چوتھی جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جس پر میں حق تعالیٰ کا جتنا شکر بھی ادا کروں کم ہے۔ فقہ القرآن کی یہ جلد اسلامی تعزیری قوانین پر مشتمل ہے۔ حسن اتفاق ہے کہ نظام اسلامی کی جدوجہد میں جو آجکل ہماری حکومت اور عوام کے پیش نظر ہے ان تعزیری قوانین کی بڑی اہمیت ہے۔ ان میں سے کچھ قوانین حکومت نافذ کر چکی ہے اور کچھ قوانین زیر ترتیب ہیں۔ اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ یہ جلد بھی وقت کی پکار کا موزوں ترین جواب ہے تو غالبًا بیجا نہ ہوگا۔

اس جلد میں مولانا عمر احمد عثمانی نے اسلامی تعزیراتی قوانین سے بحث کی ہے۔ اس میں سرفہرست وہ قوانین ہیں جو اسلامی حدود کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد تعزیرات سے بحث فرمائی ہے اور حسب سابق اس جلد میں بھی مولانا نے

یہ التزام فرمایا ہے کہ جہاں کہیں انہیں فقہ حنفی سے اختلاف کرنا پڑے وہ فقہائے اسلام میں سے کسی نہ کسی مسلمہ مکتب فکر کی تائید و توثیق سے اپنی رائے اور اپنے استنباط کی صحت کا ثبوت پیش کر دیں تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ مولانا موصوف نے کسی تجدد پسندی کا سہارا لیا ہے۔

حسب سابق ضمناً اس جلد میں بھی دو مباحث ایسے آگئے ہیں جو نہایت ہی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور جن کی وجہ سے ملت میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک تو حد قذف کے سلسلہ میں یہ بات مشہور چلی آرہی ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ سیدۂ کائنات حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کچھ منافقین اور ان کے زیر اثر کچھ صادق الایمان مسلمانوں نے بھی نشانۂ تہمت بنایا تھا جس پر حق تعالیٰ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی برأت میں سورۂ نور میں پورا ایک رکوع نازل فرمانا پڑا۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر کسی آدمی کی ماں کے متعلق سچ مچ اس قسم کی تہمت لگا دی جائے تو کوئی شریف آدمی اس کا تذکرہ اشارۃً بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس کو کتابوں کی زینت بنا دیا جائے اور اس کا یوں کھلے عام چرچا کیا جائے۔ لیکن ہمیں حیرت ہے کہ مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو کیا ہو گیا کہ حضرت ام المؤمنین سیدۂ کائنات رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق اس بے اصل اور بے بنیاد بیہودگی کا چرچا ہماری صحاح کی کتابوں میں

بھی خوب شرح و بسط سے کیا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں نہ حضرت ام المؤمنین کا اشارۃً بھی نام لیا ہے اور نہ کسی اور مسلمان کا۔

مولانا عمر احمد عثمانی نے بخاری کی اس مشہور زمانہ روایت پر درایت و روایت کے نقطۂ نظر سے بڑی تفصیل سے بحث فرما کر ثابت کیا ہے کہ یہ روایت قطعاً اس قابل نہیں کہ اس پر ذرا سی توجہ بھی کی جائے۔ جب بخاری جیسی اصح الکتب بعد کتاب اللہ کی روایت کا یہ حال ہے تو دوسری کتابوں کی روایات کا آپ خود ہی اندازہ فرما لیں۔

دوسری بحث قصاص کے ضمن میں حضرت امیر المؤمنین خلیفۂ ثالث شہید اعظم ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے واقعۂ فاجعہ پر فرمائی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جو غلط فہمیاں عرصۂ دراز سے پھیلائی جا رہی ہیں ان کے جواب کے ساتھ صحیح صورت حال پیش کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں مباحث اس جلد کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین ان دونوں مباحث کو کما حقہ پورے غور و خوض سے ملاحظہ فرمائیں گے۔

آخر میں میں اپنے پریس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس نے فقہ القرآن کی سابقہ تینوں مجلدات کا بڑی عمدہ آرا سے استقبال کیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ حسب معمول جلد چہارم کا بھی اسی طرح خیر مقدم فرمائے گا۔

والسلام مخلص

(ڈاکٹر) حسب الرحمٰن خاں۔

(عرضِ مؤلف)

ایک حقیر و ناکارہ ضعیف البنیان خاکپائے صاحبان علم و عرفان اس رب ذوالمنن کی بارگاہ میں سپاس گذاری کے لئے پیرایۂ بیان کہاں سے لائے جس نے اس ذرۂ ناچیز کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ اس کے دین حنیف کی خدمت کے لئے فقہ القرآن جیسی کتاب کی چوتھی جلد ہدیۂ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کر سکا۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہتِ گل نسیم صبح تیری مہربانی

یہ حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہی تو ہے جس کا میں کسی طرح بھی شکر ادا نہیں کر سکتا کہ اس نے فقہ القرآن کو وہ مقبولیت عطا فرمائی جو میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھی کہ لوگوں کا اصرار پیہم ہے کہ فقہ القرآن کی مجلدات کا عربی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ کتنے ہی لوگوں نے زبانی اور تحریری اعتراف کیا کہ ہم فقہ القرآن کو پڑھنے کے بعد نئے سرے سے مسلمان ہوئے ورنہ اس سے پہلے تاریخ و سیرت کی کتابوں کے مطالعہ سے ہمارا ایمان بالکل ہی متزلزل ہو گیا تھا۔ اور اگرچہ زبان و قلم سے اظہار کی جرأت نہیں تھی لیکن قلبی شکوک و شبہات کی وجہ سے معاذ اللہ

معاذ اللہ یوں نظر آتا تھا کہ خدانخواستہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے دنیا دار فاتحین سے کچھ مختلف نہیں تھے جنہوں نے دوسرے انقلابیوں کی طرح (خاکم بدہن) جزیرہ نمائے عرب میں ایک انقلاب کی داغ بیل ڈالی اور اس انقلاب میں کامیابی سے ہمکنار ہونے کے بعد انہوں نے بھی وہی کچھ کیا جو دوسرے دنیادار کرتے ہیں۔ یعنی وہ بھی دادِ عیش دینے کے لئے زمانہ کے ایک خاص وقت میں جزیرۂ عرب میں پیدا ہو گئے تھے۔ فقہ القرآن نے ان شکوک و شبہات کے سیاہ بادلوں کو یوں صاف کر دیا کہ ہم دولتِ ایمان سے از سرِ نو مشرف ہوئے۔

ایک عالم و فاضل بزرگ اور شیخ طریقت نے یوں دادِ تحسین و آفرین دی کہ "عثمانی صاحب آپ نے تو اپنی مغفرت کا پورا سامان کر لیا۔ آپ نے ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کی سیرتوں خصوصاً سیدۂ کائنات ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ام المؤمنین سیدہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سیرتوں سے اس گرد و غبار کو بالکل صاف کر دیا جو معاندین اسلام نے ان کے خلاف ایک منظم سازش کے ماتحت اڑایا تھا۔ جزاکم اللہ تعالےٰ خیر الجزاء۔"

یہ بھی حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہی تو ہے کہ فقہ القرآن کی اشاعت کے بعد بہت سے محققین علمائے حق کو یہ جرأت و جسارت ہونے لگی ہے کہ وہ بھی کھل کر سامنے آنے لگے ہیں اور اسی نہج پر دادِ تحقیق دینے لگے ہیں۔ فقہ القرآن جلد دوم میں میں نے نکاح اور

رخصتی کے وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عمر کے متعلق سیر حاصل بحث کی تھی۔ اس پر جہاں ہمارے کچھ علماء کرام نے ناک بھوں چڑھائی وہیں بے شمار اہل علم بزرگوں نے میری ہمت افزائی بھی فرمائی چنانچہ اس بحث کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کچھ درد مند دوستوں نے فرمائش کی کہ اس حصّہ کا انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ایک دوست اس کا ترجمہ فرما رہے ہیں جو عنقریب ہدیۂ ناظرین کیا جا سکے گا۔

اس سلسلہ میں بڑی اہم اور مسرور کن خبر یہ بھی ہے کہ حال ہی میں جناب مولانا حکیم نیاز احمد صاحب اور مولانا الیف اللہ صاحب عثمانی پانی پتی سرگودھا (فاضل دیوبند) اور مولانا عظمت اللہ صاحب تفہیمی (فاضل دیوبند) مہتمم مدرسہ تفہیم القرآن جھنگ کی مشترکہ کوششوں سے ایک نہایت مہتم بالشان کتاب سامنے آئی یہ حضرات شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کی اس کتاب کا نام "کشف الغمہ عن عمر اُمِّ الاُمّہ" ہے۔ کتاب بڑی تقطیع کے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں ان حضرات نے ان تمام روایات کا استیعاب کر کے جن سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صغر سنی پر استدلال کیا جاتا تھا محدثین کے اصول پر تنقید فرمائی ہے اور ایک ایک راوی کے متعلق اسماء الرجال کی کتابوں سے پوسٹ مارٹم کر کے ثابت فرمایا ہے کہ ۱۴۳ھ تک بخاری شریف کی ہشام بن عروہ والی اس روایت کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جو اس سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

اور جو متعدد سندوں سے صحیح بخاری میں جگہ پا گئی ہے۔

محترم مولانا حکیم نیاز احمد اپنے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"پہلے خیال تھا کہ اسے شائع نہ کیا جائے کیونکہ اس سے احادیث کی صحت پر حرف آئے گا اور منکرین حدیث کو تقویت ملے گی۔ مختلف علماء سے تبادلۂ خیال کیا گیا اکثر کی رائے یہی تھی۔ لہٰذا کتاب کے مسودے میں بار بار ترمیم کرنی پڑی۔

روایت کو پرکھنے کا راستہ بھی خود ہی پیدا کیا۔ منقول ذخائر میں اس کے لئے مواد بہت ہی کم ملا۔ جن ہم عصر علماء سے مشورہ لیا ان میں سے بعض نے فرمایا کہ جب سابق علماء نے کچھ نہیں لکھا تو آپ کو گڑے مردے نکالنے کی کیا ضرورت وغیرہ وغیرہ۔

------ شروع میں تو اپنے اطمینان قلب کے لئے اس تاریخی روایت کو دیکھا اور پرکھا۔ مگر اب جب اس روایت پر محنت کر کے دیکھا اور شرح صدر ہو گیا تو ارادہ کر لیا کہ اہل علم کے سامنے اپنی اس کاوش کو پیش کیا جائے۔ عند الامتحان یکرم الرجل او یہان الخ۔

بہر حال اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے اس عظیم دور کا یہ بڑا ہی خوش آئند موڑ ہے جو علمی میدان میں نمودار ہوا ہے کہ اب قدیم الخیال علمائے کرام بھی تحقیق کی طرف مائل ہونے لگے ہیں۔ یہ احساس کس قدر خوش آئند و خوش گوار ہے کہ اس تحقیق کی وادیٔ پر خار و پر خطر میں

یہ فقیر اب تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ہم نفس اور ہم نوا اور بھی اچھے اچھے لوگ ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔

فقہ القرآن کی تیسری جلد حقوق و فرائض سے متعلق تھی جس میں حقوقِ نسواں کی بحث بھی آئی تھی۔ اس جلد کے شائع ہونے پر قانون داں پڑھے لکھے طبقوں نے اس کا جہاں شاندار طریقہ پر خیر مقدم کیا وہیں بعض علمائے کرام اور مفتیان عظام نے سخت اختلاف و مزاحمت کا اظہار کیا اخبارات میں موافق و مخالف بیانات سے ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ علمائے کرام کی طرف سے دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے بجائے حسب عادت سب وشتم اور فتاوی کا بازار گرم ہوگیا۔ طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور طرح طرح کے القابات سے نوازا گیا۔

متانت و سنجیدگی سے فروتر غوغا آرائی کا جواب دینا نہ میرے بس کی بات تھی نہ یہ اہل علم کے طریقہ سے کوئی مناسبت رکھتا تھا۔ البتہ ایک پروفیسر صاحب کے مضمون کا نوٹس لینا پڑا جو روزنامہ جسارت کراچی کی چودہ قسطوں میں شائع ہوا تھا کیونکہ ان کے مضمون کا انداز بیان کسی حد تک گوارا تھا۔ الحمد للہ ہمارا جوابی مضمون بھی اسی روزنامہ جسارت کراچی کی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اور توفیق الٰہی شامل حال رہی تو کتابی صورت میں بھی انشاء اللہ شائع ہوگا۔

بحیثیت مجموعی اس جلد نے علمی حلقوں میں بہت اچھا اثر چھوڑا حتیٰ کہ فیڈرل شریعت کورٹ کے اجلاسوں میں بھی فقہ القرآن کی صدائے

بازگشت بار بار سنی گئی اور جا بجا اس کے حوالے دیئے گئے۔ چنانچہ انصار برنی ایڈووکیٹ کراچی کی پیٹیشن میں کم از کم پانچ مرتبہ فقہ القرآن کا نام لیا گیا اور اس کے حوالے دیئے گئے۔ اسی پیٹیشن میں جہاں میرے والد ماجد حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی مایۂ ناز تصنیف اعلاء السنن کے حوالے دیئے گئے وہیں پانچ مرتبہ اس ناچیز کی کتاب کا نام بھی لیا گیا۔ یہ فخر و سعادت میرے لئے کچھ کم نہیں۔

(ملاحظہ ہو پی۔ ایل۔ ڈی ۱۹۸۳ء فیڈرل شریعت کورٹ ۷۳)

بلبل ہمیں کہ فاقیۂ گل شود بس است

کتاب کی یہ مقبولیت حق تعالیٰ کا کرم بے پایاں ہے جس کا میں حقیقۃً شکر ادا نہیں کر سکتا۔

اللھم اسبغ علینا نعمك ظاھرۃ وباطنۃ وتب علینا انك انت التواب الرحیم۔ وتقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

ہمارے علمائے کرام اور مفتیان عظام عورتوں کو ان کے جائز حقوق دینے کے لئے تیار نہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ میں نے عورتوں کو سروس کرنے کی کھلی چھٹی دیدی ہے۔ حالانکہ یہ چھٹی میں نے نہیں دی بلکہ خالق کائنات نے خود ہی دی ہوئی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ۔ (۴/۳۲)

ترجمہ۔ مردوں کا حصہ اس میں ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا اس میں حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

اگر اکتساب رزق کی عورتوں کو اجازت ہی نہیں تو اپنی کمائی میں عورتوں کا حصہ کہاں سے ہوگا۔

ہم اپنے بچپن میں اپنے بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ عورتوں کو زیادہ پڑھانا لکھانا نہیں چاہیئے۔ انہیں صرف قرآن شریف پڑھا دو یا بہت سے بہت بہشتی زیور پڑھا دو۔ لیکن انہیں ہرگز اتنا نہ پڑھاؤ کہ وہ خط لکھ سکیں۔

یقیناً ہمارے یہ بزرگ ہم سے زیادہ سمجھ دار تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اگر عورتیں لکھ پڑھ گئیں تو پھر انہیں اپنے حقوق کا شعور پیدا ہو جائے گا اور ہم انہیں دبا کر نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہمارے رؤسا اور جاگیردار اپنی ریاستوں میں کالج تو بڑی چیز ہے اسکول تک کھولنے کے روادار نہیں تھے کہ رعایا پڑھ لکھ کر ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اور وہ پھر اپنے حقوق مانگنے لگے گی۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ انہیں جاہل رکھا جائے۔

لیکن دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی ہم نے یہ غلطی تو کر لی کہ عورتوں کو تعلیم دلوائی لڑکیوں کے اسکول اور کالج کھول لئے اور اب تو عورتوں کی الگ یونیورسٹیاں تک قائم کرنے کی باتیں ہو رہی ہیں عورتوں کو لکھا پڑھا کر ان کا شعور ہم نے خود ہی بیدار کر دیا اور انہیں اپنے شعور کا احساس دلا دیا۔ اب اگر عورتیں گھروں میں باندیاں بن کر بلکہ پاؤں کی جوتی بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں ہو رہیں تو ہم ان کی راہوں میں تنکے کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور غلط قسم کی تاویلات سے ان کے احساس و شعور کو دبانا

چاہتے ہیں۔

ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ جب کسی انسان میں اپنے حقوق کا شعور بیدار ہو جاتا ہے تو اسے دبایا نہیں جا سکتا۔ اگر آپ بلاوجہ اسے زبردستی دبائیں گے تو جتنا دبائیں گے اس کا ردِ عمل اتنا ہی شدید ہوگا۔ اور اگر ان میں بغاوت کے جذبات بھڑک اٹھے تو وہ حدود کو بھی پار کر جائیں گی اور ہمارا حشر وہی ہوگا جو یورپین اقوام کا ہمارے سامنے ہے۔

یورپ کے سامنے وحی کی روشنی نہیں تھی۔ انہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی رہنمائی حاصل نہیں تھی۔ انہوں نے اپنی عقل اور تجربہ کی روشنی میں آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لہٰذا افراط و تفریط کا شکار ہوئے اور خاندانی ادارات کا تیا پانچا کر بیٹھے چنانچہ ان کے دانشور اور حکماء آج نوحہ کناں ہیں کہ یہ ہم نے کیا کر لیا۔ کاش ہم پھر پیچھے کی طرف لوٹ سکیں۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کے پاس وحی کی روشنی موجود ہے۔ انہیں اپنے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی حاصل ہے جس نے آزادی اور پابندی کی حدود متعین کر دی ہیں اور پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ حد بندی کر دی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جتنی حریت اور آزادی عطا فرمائی ہے وہ عورتوں کو دیجئے اور غلط تاویلات سے ناجائز قدغنیں نہ لگائیے ورنہ اگر اسلام اور مذہب کے نام سے ان کے حقوق کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ مذہب ہی سے باغی ہو جائیں گی اور پھر ہمارا حشر بھی وہی ہوگا جو آج یورپ

باسمہٖ تعالیٰ

تعارف کتاب

از جناب خالد ایم اسحٰق ایڈووکیٹ سپریم کورٹ پاکستان

[فقہ القرآن کی سابق تین جلدوں کے تعارف لکھنے کی سعادت راقم الحروف کو حاصل رہی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ "حدود و قصاص" کے مباحث پر مشتمل اس جلد کا تعارف لکھنے کے لئے کوئی جامع قدیم و جدید شخصیت نصیب ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔ اللہ کے فضل و کرم سے میری یہ آرزو پوری ہوئی اور محترم خالد اسحاق صاحب اس کے لئے تیار ہو گئے۔

خالد اسحاق صاحب ملک کے نامور قانون داں ہیں۔ عربی جاننے کی بنا پر اسلامی قانون کے اصل ماٰخذ پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ اپنی اسی جامعیت اور دستور اسلامی پر گہری نگاہ کے باعث انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری غالباً پاکستان کی سب سے گراں قدر لائبریری ہے۔ فقہ القرآن کی تصنیف میں بھی اس لائبریری کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کاش خالد صاحب کے انتہائی وسیع مطالعہ پر مبنی ان کا گہرا تفکر جو ابھی تک علم سینہ کی شکل میں ہے اگر علم سفینہ کی شکل اختیار کرے تو ملت اسلامیہ متعدد بیش قیمت اور معنویت سے پُر کتابوں سے استفادہ کا شرف حاصل کر سکتی ہے ع

یارب این آرزوئے من چہ خوش است طاہر المکی]

مولانا عمر احمد عثمانی کی ذات اپنی علمی و دینی خدمات کی وجہ سے کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اگر انہیں مولانا ظفر احمد عثمانی کی

ولدیت کا شرف حاصل ہے تو اس شرف کو خود مولانا نے اپنی دینی خدمات کے ذریعہ اور اجاگر کیا ہے۔

زیر نظر کتاب موضوع 'فقہ القرآن' میں مولانا کی پانچویں کاوش ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتابیں خصوصاً 'الرحم' اور 'حقوق نسواں' علمی حلقوں میں خاصی شہرت پا چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ دونوں کے موضوعات کا عمر احمد صاحب نے قرآن کی روشنی میں از سر نو جائزہ لیا ہے۔ سالہا سال کیا صدیوں کے تقدس کے غلافوں نے صاحب تصنیف کی تنقیدی نگاہ کو نہیں روکا۔ جہاں بھی مولانا نے تاریخی فقہ کو قرآن سے ٹکراتے پایا ہے وہاں اس مسئلہ کو بہت ہی محنت کے ساتھ دیکھا و پرکھا ہے اور جو کچھ صحیح سمجھا ہے اسے کھول کر بیان کیا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ بعض نکات پر اور صاحبان علم کو مولانا کے نتائج سے اختلاف بھی ہو۔ لیکن اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ جہاں بھی مولانا نے مروجہ فقہ سے اختلاف کیا ہے وہاں متعدد ٹھوس دلائل پیش کئے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ائمہ کے بہت سے ایسے اقوال بھی سامنے لائے ہیں جو متداول فقہ میں فراموش کر دیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ بہت سے اذہان میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ فقہ اسلامی کی کل کائنات اتنی ہی ہے جتنی متداول فقہ کی کتابوں میں نظر آتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جو کام عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ موجودہ حالات کا عین تقاضا ہے۔ گذشتہ کم و بیش پانچ سو سال میں فقہ و دستوری مسائل کے سلسلہ میں مسلمانان عالم کی سوچ جمود کا شکار

کا ہو رہا ہے۔

ایک مہربان دوست فرماتے ہیں کہ :۔

"موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ جو عورتیں گھر سے باہر جاتی ہیں وہ نیم عریاں لباس پہن کر جاتی ہیں تاکہ ان کے جسم کی پوری نمائش ہو سکے۔ مردوں سے دوستیاں بھی کرتی ہیں اور تنہائی میں ملاقاتیں بھی۔ اور تفریح بھی۔ کیا فرماتے ہیں وہ علماء جو ان تمام غیر اسلامی باتوں کی اجازت دینے کو تیار ہیں پانچ فی صد عورتیں بھی نوکریاں کرنے والیوں میں سے ایسی نہیں ہیں کہ جو بیوہ، بیکس، لاوارث اور فاقہ زدہ ہوں۔ کیا اللہ نے جو پردہ اور حیا کے احکامات قرآن کریم میں دیئے تھے ان کو یہ علماء منسوخ سمجھتے ہیں؟"

(ماہنامہ فاران بابتہ ماہ اگست ۱۹۸۳ء صـ۷۸)

حقائق و واقعات سے اغماض کی شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ نوکریاں کرنے والیوں میں زیادہ تر ایسی ہی عورتیں ہیں جن کے باپ مر گئے۔ بیوہ ماں اور چھوٹے چھوٹے بہن بھائی چھوڑ گئے۔ معاشرہ ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ اگر وہ نوکریاں نہ کریں تو پورا گھرانا فاقوں مر جائے۔ بیشمار لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں، ان کی عمریں ڈھلی جا رہی ہیں۔ کیونکہ ان کے والدین کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپئے جہیز دینے کے لئے نہیں۔ وہ ملازمتیں کر کے اپنا جہیز تیار کر رہی ہیں۔ قوم کو اور زعماء و علماء کو اس کا قطعاً احساس نہیں کہ اس نازک صورتِ حال کا کوئی علاج سوچے اور اس

حریص اور لالچی سوسائٹی کے خلاف کوئی تحریک چلائے اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑے جس نے شادی جیسے مقدس بندھن کو بھی ایک کاروبار بنا ڈالا ہے۔ موصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رف اندازے کے مطابق صرف ایک کراچی شہر میں بارہ ہزار جوان، خوبرو اور تعلیم یافتہ لڑکیاں کنواری بیٹھی ہیں کیونکہ ان کے والدین کے پاس جہیز دینے کے لئے خطیر رقم نہیں ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک ذمہ دار گورنمنٹ آفیسر میرے پاس یہ شکایت لے کر آئے کہ آپ نے فقہ القرآن میں تعدد ازدواج کے خلاف بڑا زور قلم دکھایا ہے۔ لیکن اس وقت کراچی میں بے شمار لڑکیاں ایسی بیٹھی ہیں جن کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں وہ ادھیڑ ہو چکی ہیں اب انہیں کنوارے لڑکے تو قبول کرنے سے رہے۔ ان کے لئے ضرورت ہے کہ جو لوگ صاحبِ حیثیت ہیں وہ ان لڑکیوں سے دوسری شادی کر لیں تاکہ وہ معاشرہ میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ اس وقت تعدد ازدواج کے خلاف نہیں بلکہ اس کے حق میں مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ اللہ کے لئے آپ تعدد ازدواج کے حق میں کچھ لکھئے۔ میں اس صورت حالات پر اور کیا کہوں۔ بس اللہ ہمارے معاشرے پر اپنا رحم فرمائے اور ہمارے علماء و زعماء کو صحیح صورت حال کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حقیر و ناکارہ

عمر احمد عثمانی

رہی۔ بہت سے وسیع علاقوں میں اسلامی ناموں والے ایسے بادشاہوں کا دور دورہ رہا جنہوں نے بجائے اسلامی اجتہاد کے اسلامی قانون کو زندگی کے کئی شعبوں سے ہٹا دینے کو زیادہ مفید پایا۔ مسلمان ریاستوں میں بہت سے ایسے قوانین رائج کئے جانے لگے جو شریعت کے ساتھ ساتھ رائج تھے۔ اور قضاۃ کے اختیار سے باہر تھے۔ اس طریقہ سے ان شاہوں نے اپنی قوۃ کو اخلاق و شریعت کے بندھنوں سے آزاد کرالیا۔ نیک نیت فقیہوں نے بھی فلاح کی راہ یہ دیکھی کہ بجائے اس کے کہ بادشاہوں کے بدکردار اور بے اخلاق کارندوں کے ہاتھوں فقہی ورثہ کا حلیہ بگڑے یہی بہتر ہے کہ اس قیمتی ورثہ کو لے کر الگ ہو جایا جائے۔ اور اچھے وقتوں کا انتظار کیا جائے جب اس فقہ کو دوبارہ بعینہٖ نافذ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ ابتلا کے زمانہ میں اس کے علاوہ ان نیک لوگوں کے پاس کوئی اور راہ کھلی نہ ہو۔ لیکن اگر ایک شریعت مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک گراں قدر ڈھال ہے وہاں اس کا اصل مصرف ایک ایسی تلوار کا تھا جس کے ذریعہ حق و باطل کے اصلی فرق کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ اور اسلام اور ملت اسلامیہ کے نمو کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔ یہ کام مدتوں نہ ہوا۔

صدیوں سے حجروں میں مقید، تصوف سے متاثر ذہنوں کے مشہور فقہی کتابوں پر حاشیئے قوۃ سے محروم قصبوں میں مقید امت کے افراد کے ذاتی مسائل کے حل میں تو کارگر ہو سکتے تھے لیکن حصول آزادی کے بعد نفاذ اسلام کی بنیادی کوششوں میں اتنے مفید

ثابت نہ ہوئے دنیا میں سینکڑوں تبدیلیاں بڑھتی ہوئی تیز رفتاری سے رونما پذیر ہو رہی ہیں۔ خیر و شر کی مسلسل جنگ میں کئی نئے ہتھیار زیر استعمال ہیں جن کے بارے میں آج سے سو سال پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں تیز رفتار سفر اور ابلاغ عامہ کی کثرت نے دنیا کو سکیڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج کے اہم مسائل گذرے ہوئے ادوار سے یکسر مختلف ہیں۔ کم سے کم زمانی و مکانی اعتبار سے ان حالات میں فقہی مسائل کی ایک نئی تبویب درکار ہے اور بہت سے میدانوں میں جرأت مندانہ اجتہاد کی بھی ضرورت ہے۔

کچھ ایسے ہی محرکات کے زیر اثر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

پاکستان اور اس کے علاوہ اور ممالک میں بھی نفاذ شریعت کا عمل جاری ہے اس سلسلہ میں بہت سے پیچیدہ مسائل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ ہے کہ کیا حدود کی سزاؤں میں کسی قسم کے اضافے یا تخفیف کی گنجائش ہے یا نہیں۔ عمر احمد صاحب اس سوال سے متعلق ایک خاص رائے رکھتے ہیں جس کا ذکر انہوں نے ابتدائے کتاب ہی میں کیا ہے اور اس کے جواز میں عقلاً اور نقلاً قوی دلائل پیش کئے ہیں۔ نیز لفظ "نَکَالًا" کے تعلق سے جو استدلال عمر احمد صاحب نے کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ اور مستقبل میں ہماری فقہی تفہیم پر بھرپور انداز سے اثر انداز ہو سکتا ہے کیونکہ حد اگر آخری سزا ہے تو حالات کے مطابق سزا میں تخفیف ہو سکتی ہے۔

حد زنا کی توجیہ میں دیئے ہوئے دلائل پر اضافہ ممکن ہے۔ نظر یہ آتا ہے کہ جن جرائم کی سزا قرآن میں مقرر کی گئی ہے وہ جرائم ہیں جن کی وجہ سے معاشرے کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ مثلاً چوری تو ایک

یادو کی ہوتی ہے لیکن راتوں کی نیند سینکڑوں کی اڑ جاتی ہے باہمی اعتماد کم ہو جاتا ہے اور یہی اعتماد تو بنیاد ہے اخلاق و تمدن کی۔ یہی کچھ صورت زنا کی ہے۔ خاندان و کنبہ اسلامی معاشرے میں کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔ زنا، یا شک زنا یا تشہیر زنا باہمی اعتماد و حسنِ ظن کو مٹا دیتے ہیں۔ سارے معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور تمام سوسائٹی تباہی کی طرف سرکنا شروع کر دیتی ہے۔

اس کتاب کا ایک مستحسن پہلو، واقعۂ افک، کے سلسلہ میں عمر احمد صاحب کی تحقیق ہے۔ علم حدیث کے تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کرب انگیز قصے کی تحقیق کی ہے جو حقیقت میں صاحب کتاب کے لئے توشۂ آخرت کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم علم حدیث کے سنہرے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے تاریخی ورثہ کو از سر نو جانچیں عین ممکن ہے کہ ہمیں بہت سی ایسی روایات سے چھٹکارا مل جائے جو لاتعداد نیک نیت مسلمانوں کے لئے نہ اٹھا سکنے والا بوجھ بنی ہوئی ہیں۔

یوں بھی نہیں کہ اس کتاب میں صرف اختلافی مسائل پر گفتگو ہے حقیقت میں جرم و سزا کہ موضوع پر یہ ایک بہت جامع کتاب ہے جس میں وہ تمام موضوعات بھی آجاتے ہیں جو اس فقہ اسلامی کی اس صنف سے متعلق ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اقوال ائمہ کی اہمیت بہر کیف ثانوی ہے۔ قرآن معیار اوّل۔ سنت معیار دوم اور اس کے بعد قدر و منزلت واضح دلیل کی ہے کسی اونچے نام کی نہیں۔

یہ کتاب پڑھنے والوں پر احسان اور عمر احمد صاحب کے لئے باعثِ تحسین ہے۔

کتاب الحدود

حُدُوْدٌ، حَدٌّ کی جمع ہے اس مادہ کے اصلی معنیٰ روکنے اور منع کرنے کے ہیں۔ حَدَّ الرَّجُلَ عَنِ الْاَمْرِ، آدمی کو اس معاملہ سے روک دیا۔ منع کر دیا حَدَدْتُ فُلَانًا عَنِ الشَّرِّ۔ میں نے فلاں کو شر سے روک دیا۔ اَلْحَدَدُ۔ رکاوٹ اور روک هٰذَا اَمْرٌ حَدَدٌ یہ امر ممنوع ہے۔ اَلْحَدِیْدُ (لوہا) کیونکہ وہ اپنی سختی کی وجہ سے (خصوصاً دشمن سے) روک بن جاتا ہے۔ تیز دھار حَدَّ اس نے دھار کو تیز کیا۔ کیونکہ آلات حرب کی دھار کی تیزی جنگ میں دشمن سے بچاؤ اور رکاوٹ کا سبب بنتی ہے۔ (تاج العروس و محیط)

بہر حال حَدٌّ کے معنیٰ روکنے کے ہیں، چند جرائم کی سزائیں حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں خود متعین فرما دی ہیں، جن کا مقصد ان جرائم کو روکنا ہے۔ اس لئے ان کو حَدٌّ کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم نے بعض جرائم کی جو سزائیں مقرر فرما دی ہیں وہ انتہائی (MAXIMUM) یعنی زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ہر موقعہ پر یہی سزائیں دی جائیں۔ عدالت جرم کی

نوعیت وکیفیت اور مجرم کے حالات وکوائف پر نظر کرتے ہوئے ان سے کم سزائیں بھی دے سکتی ہے۔ البتہ عام حالات میں انتہائی اور زیادہ سے زیادہ سزائیں جو دی جا سکتی ہیں وہ وہی ہیں جو قرآن نے مقرر فرمادی ہیں، ہاں اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں اور ان سزاؤں سے بھی جرائم کو روکا نہ جاسکے تو ہنگامی طور پر بطور تعزیر ان سزاؤں میں تشدید کی جاسکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جرائم کی نوعیت اپنے خصوصی حالات وکوائف کے ماتحت ہمیشہ یکساں نہیں ہوتی۔ بعض جرائم حالات سے مجبور ہو کر بھی کئے جاتے ہیں، مجرم کی عمر، تعلیم وتربیت، مالی حالات، معاشرہ کے حالات اور دیگر احوال وکوائف سے جرائم کی شدّت میں زیادتی اور کمی کی جاسکتی ہے اور تمام حالات میں یکساں سزائیں نہیں دی جاسکتیں۔ اگر قرآنی حدود کو کم سے کم سزا تصوّر کیا جائے تو آخر جرم کی نوعیت اگر شدید ترین ہو تو پھر کیا سزا دی جائے گی، لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سزائیں زیادہ سے زیادہ اور آخری سزائیں ہیں جو عام حالات میں دی جاسکتی ہیں۔ اور اگر جرائم کی نوعیت شدید قسم کی نہ ہو تو عدالت کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ سزا میں حالات کے مطابق کمی کر دے، ایک ہی لاٹھی سے تمام مجرموں کو نہیں ہانکا جاسکتا۔ سرقہ یعنی چوری کی سزا کے سلسلہ میں قرآن کریم نے جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (۵/۳۸) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سزا۔ ایک تو ان کے جرم کی جزا یعنی بدلہ ہے اور اس کے ساتھ ہی اللہ تعالےٰ کی طرف

سے دوسرے لوگوں کے لئے سامان عبرت بھی ہے وہ سزا جس سے دوسروں کو بھی عبرت دلانا مقصود ہو۔ انتہائی اور آخری سزا ہوا کرتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اصحابِ سبت کے واقعہ میں بھی یہی نَكَالًا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

(۲/۶۵-۶۶)

ترجمہ:۔ اور جن لوگوں نے تم میں سے سبت (ہفتہ کے دن) کے سلسلہ میں زیادتی کی تھی ان کا حال تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ، ہم نے اسے اس زمانہ کے لوگوں اور بعد میں آنے والوں کے لئے عبرت اور تقویٰ شعار لوگوں کے لئے نصیحت بنا دیا۔

ظاہر ہے کہ اصحابِ سبت کو پہلی مرتبہ سبت کی بے حرمتی کرنے پر یہ سزا نہیں دی گئی تھی، وہ اس کے عادی ہو چکے تھے اور مسلسل اس بے حرمتی کا ارتکاب کئے چلے جا رہے تھے۔ لوگوں نے انہیں منع بھی کیا تھا، ہر طرح سمجھانے کی کوشش کی جا چکی تھی۔ جب ان کی اصلاح کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو حق تعالےٰ نے انہیں یہ سزا دی جسے قرآن کریم نے نَكَالًا (عبرت) سے تعبیر فرمایا ہے اسی طرح فرعون کے سلسلہ میں یہ لفظ آیا ہے کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام نے اسے تبلیغ فرمائی۔ خدا سے ڈرایا، بڑے بڑے معجزات دکھلائے مگر وہ برابر جھٹلاتا رہا اور نافرمانی کرتا رہا۔

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی ○ فَحَشَرَ فَنَادٰی ○ فَقَالَ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی ○ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَکَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰی ○

(۷۹/۲۲-۲۵)

ترجمہ:۔ پھر وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا۔ اور (موسیٰ کو شکست دینے کی) کوشش کرتا رہا چنانچہ اس نے (ملک کے مشہور جادوگروں کو) جمع کیا اور پھر یہ اعلان کیا چنانچہ کہا کہ میں ہی تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں، آخر خدا نے اسے پکڑ لیا۔ اگلی پچھلی خطاؤں کی عبرتناک سزا کے لئے۔

فرعون نے سالہا سال تک موسیٰ علیہ السلام کو جھٹلایا۔ ہر طرح آپ کا مقابلہ کیا۔ بار بار قوم فرعون پر مختلف انواع کے عذاب نازل ہوتے رہے جن کی تفصیل خود قرآن کریم نے دے دی ہے آخر میں اسے پکڑ لیا گیا اور دریائے قلزم میں مع اپنی فوج کے غرق کر دیا گیا۔ اس آخری اور شدید ترین سزا کو نَکَالَ فرمایا گیا ہے اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ نَکَالَ وہ آخری سزا ہوا کرتی ہے جو اس وقت دی جاتی ہے جب پانی بالکل ہی سر سے گذر جائے سرقہ کی حد کے سلسلے میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری اور انتہائی سزا ہوتی ہے جب مجرم کی باز یافت کی کوئی امید باقی نہ رہے لہٰذا مقررہ حدود وہ آخری

اور انتہائی سزائیں ہیں جو ان جرائم پر دی جا سکتی ہیں۔ بہرحال رسول کے قانون میں یہ انتہائی سزائیں ہیں۔ لیکن ہنگامی حالات میں اگر یہ سزائیں بھی کافی ثابت نہ ہوں تو حکومت وقت جیسا کہ ہنگامی حالات میں رسول قانون کو معطّل کر کے فوجی قانون (مارشل لاء) نافذ کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اسی طرح وہ ان احکام میں مزید شدّت بھی کر سکتی ہے لیکن یہ مستقل قانون نہیں ہوگا۔ ہنگامی حالات جب رفع ہو جائیں تو اصل اور عام قانون پھر سے نافذ ہو جائے گا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی زنا کی حد پر ملک بدر کرنے کا اضافہ فرمایا تھا۔ جس کی توضیح ائمہ احناف نے اسے ہنگامی تعزیر کہہ کر کی ہے۔

دو سوال ۲

حدود کے سلسلے میں دو مسئلے غور طلب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کیا اسلام میں مقررہ حدود کی یہ حیثیت ہے کہ جہاں مجرم سے جرم صادر ہو اس پر ضرور ہی حد جاری کر دی جائے؟ اور اس میں کسی نرمی یا رورعایت کی گنجائش ہی نہ ہو؟

دوم یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ قرآن کریم کی مقررہ حدود زائد سے زائد انتہائی سزائیں ہیں ان میں کمی بھی کی جا سکتی ہے موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے تاکہ موضوع تشنہ نہ رہ جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ پورے ذخیرۂ احادیث میں ہمیں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ جرم کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفائے راشدین نے کسی مجرم کو زنا کے جرم میں بجائے سو کوڑوں کے ایک سو ایک کوڑے

مار دیئے ہوں۔ یا قذف کے جرم میں بجائے اسّی کوڑوں کے اکیاسی[81] کوڑے دیئے ہوں۔ مقررہ حدود پر ہمیں اضافہ کہیں نہیں ملتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تمام اسلامی احکام، مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ہر مرد، ہر عورت، ہر آزاد اور ہر غلام پر یکساں نافذ ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مرد پر پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوں اور عورت پر تین وقت کی یا آزاد آدمی پر ایک مہینے (رمضان) کے روزے فرض ہوتے ہوں اور ایک غلام و کنیز پر پندرہ دن کے روزے فرض ہوتے ہوں۔ لیکن جرائم کی سزا میں آزاد آدمی کو اگر سو کوڑے مارنے کا حکم ہے تو غلام اور باندی کو پچاس کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ تعلیم و تربیت کے پورے مواقع جو ایک آزاد آدمی کو حاصل ہوتے ہیں، غلام اور باندی کو حاصل نہیں ہوتے۔ نہ انہیں فیصلہ کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں اپنے آقا اور مالک کی مرضی کے مطابق ہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ پھر معاشرے میں ان کا وہ اسٹیٹس بھی (status) نہیں ہوتا جو آزاد آدمیوں کا ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی خودی بالکل دبی ہوئی اور کچلی ہوئی ہوتی ہے۔ ان میں عزتِ نفس کا وہ شعور بھی نہیں ہوتا جو معاشرہ میں آزاد آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھنے پر قدرت بھی نہیں رکھتے۔

اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ ایک آزاد عورت کے مقابلہ میں کنیز اپنی عفت و عصمت کی حفاظت پر قطعاً

قدرت نہیں رکھتی۔ یہی حال غلاموں کا ہے۔ غلاموں کے سلسلے میں تو قرآن کریم نے حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے پیش کردی ہے کہ وزیر خزانہ کی بیوی نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی اور حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے کو لغزش سے بچانے کی کوشش کی تو اس نے اپنی ساتھنوں سے برملا کہا:۔

لَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ

(۱۲/۳۲)

ترجمہ:۔ میں نے اُسے اپنے نفس کی حفاظت سے ورغلانا چاہا تھا تو اس نے اپنی عصمت بچالی۔ لیکن اگر اس نے وہ کچھ نہ کیا جس کا میں حکم دے رہی ہوں تو وہ یقیناً قید کردیا جائے گا اور ضرور ذلیل و خوار ہوگا۔

چنانچہ جو کچھ زلیخا نے کہا تھا وہ کرکے دکھا دیا اور بارہ سال تک حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں رہنا پڑا۔ ہر غلام یوسف نہیں ہوتا اور نہ ہر غلام سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کنیزوں کا حال تو اس سے بھی بدتر تھا۔ قرآن کریم نے ان کی اس مجبوری کو مدنظر رکھتے ہوئے خود ہی ان کی سزا میں تخفیف فرمادی۔ اور ان کی سزا نصف کردی۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے کیا گھروں میں کام کاج کرنے والی خدمت گار عورتوں کے لئے یہی رعایت نہیں ہونی چاہیئے؟ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی یقیناً اس تخفیف و رعایت کی مستحق ہیں۔

جہالت اور لاعلمی

ایسے ہی وہ لوگ بھی اس رعایت کے مستحق ہیں جو تعلیم و تربیت کی کمی کی وجہ سے یا معاشرہ میں موجودہ اونچ نیچ موجود ہونے کی وجہ سے اس رعایت کے مستحق ہوں۔ چنانچہ ہیثم بن بدر نے حرقوص سے روایت کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے شکایت کی کہ میرے شوہر نے میری باندی کے ساتھ زنا کیا ہے شوہر نے کہا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔ لیکن خود میری بیوی اور اس کا مال میرے لئے حلال ہے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا جاؤ، مگر آئندہ ایسا نہ کرنا۔ گویا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہالت کی وجہ سے اس سے حد ساقط کر دی۔

اس روایت کو ابن حزم نے محلّٰی (ج ۱۱ / ۱۸۸) میں، امام محمدؒ نے کتاب الآثار (ص ۹۱) میں بیان کیا ہے۔

(اعلاء السنن ج ۱۱ / ص ۶۲۳ - ۶۲۴)

نیز امام شافعی، عبدالرزاق اور بیہقی نے ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن حاطب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام غلاموں اور باندیوں کو جو نماز اور روزہ کے پابند تھے آزاد کر دیا تھا۔ ان میں ثوبیہ نام کی ایک کنیز بھی نماز روزہ کی پابند تھی۔ وہ بھی آزاد ہوگئی۔ وہ عجمی کنیز تھی کچھ دین کی زیادہ سمجھ بھی نہیں رکھتی تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن حاطب رضی اللہ عنہ کے بیٹے یحییٰ جو اس روایت کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ انہیں ثوبیہ کے حمل نے پریشان کر دیا۔ وہ زنا سے حاملہ ہوئی تھی اور کنواری بھی نہیں تھی۔ وہ پریشانی میں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور سارا واقعہ ان سے بیان کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا کہ "تم کبھی بھی کوئی اچھی بات لے کر نہیں آتے"۔ گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی پردہ پوشی نہ کرنے کو ناپسند کیا اور وہ بھی اس سے گھبرا گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ثوبیہ کو طلب کیا اور اس سے پوچھا تم حاملہ ہوگئی ہو؟ اس نے کہا ہاں، مرغوش سے حاملہ ہوگئی ہوں۔ اس نے مجھے دو درہم دیئے تھے۔ وہ اس کا علانیہ اقرار کر رہی تھی اور قطعاً نہیں چھپا رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سب سے کہا کہ مجھے اس معاملہ میں مشورہ دو۔ تو حضرت علی اور حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہما نے کہا اس پر حد واقع ہوگئی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا: عثمانؓ! تم اپنی رائے بتاؤ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ آپ کے دونوں بھائی آپ کو مشورہ دے چکے ہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں تم اپنا مشورہ دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری رائے تو یہ ہے کہ چونکہ وہ علانیہ اقرار کر رہی ہے، گویا وہ جانتی ہی نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور وہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن حد تو اسی پر نافذ ہوتی ہے جو اس کا علم رکھتا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہا کہ عثمانؓ! تم نے سچ کہا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے۔ واقعی حد اسی پر واجب ہوتی ہے

جو اس کا علم رکھتا ہو۔

(کنز العمال ص ۸۷/۳، اعلاء السنن ص ۵۱۱/۱۱)

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ جہالت اور لاعلمی ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے حدود ساقط کی جا سکتی ہیں۔

پشیمانی اور ندامت

ہمیں ایسی متعدد حدیثیں بھی ملتی ہیں جن میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مجرم اپنے جرم پر پشیمان اور نادم ہے اور اس سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کرے گا۔ آپ نے مجرم کو تنبیہہ فرما کر چھوڑ دیا اور کوئی حد جاری نہیں فرمائی۔ اگر حد ایسی سزا ہوتی کہ وہ متعین ہی ہوتی۔ اس میں مجرم پر حد نافذ کرنا ہی ضروری ہوتا اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکتی تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ یوں اللہ کی حد کو ساقط فرما کر مجرم کو معافی دیدیتے۔

چنانچہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے اور ہم بھی آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں نے حد کا ارتکاب کر لیا ہے۔ لہٰذا آپ مجھ پر حد قائم فرما دیجئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ وہی بات دہرائی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے متعلق پھر بھی خاموش رہے۔ اتنے میں نماز کی اقامت ہو گئی تو جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نماز سے

فارغ ہو گئے تو وہ شخص آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیا اور میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا کہ دیکھوں، حضور صلے اللہ علیہ وسلم اسے کیا جواب دیتے ہیں۔ تو آپ نے اس سے فرمایا: بتاؤ تو، جب تم اپنے گھر سے نکلے، کیا تم نے وضو نہیں کیا تھا۔ اور اچھی طرح وضو نہیں کیا تھا؟ اس نے عرض کیا: بے شک اے اللہ کے رسول! پھر آپ نے فرمایا: پھر تم ہمارے ساتھ نماز میں حاضر رہے؟ اس نے عرض کیا بیشک اے اللہ کے رسول! حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو یقیناً اللہ نے تمہاری حد کو بخش دیا (معاف کر دیا) ہے۔ یا یوں فرمایا کہ اللہ نے تیرے گناہ کو معاف فرما دیا ہے۔ یہ روایت ابوداؤد کی ہے اور بعینہٖ یہی الفاظ صحیح مسلم میں ہیں۔ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایسی ہی روایت مروی ہے۔

(جمع الفوائد ص ۵۲/۱، کتاب الصلوٰۃ، فضلہا)

یہ روایت اور اس کے الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ بعینہٖ ایک ایسی ہی روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو امام ابوداؤد نے بھی اپنی سنن میں جو صحاح ستہ کی مشہور کتاب ہے۔ نقل فرمایا ہے۔ اسے ضعیف روایت بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ حد نافذ نہیں فرماتے بلکہ ساتھ ہی اس کے جرم کی معافی کی بھی بشارت دے رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا ایک لازمی اور متعین سزا کے متعلق یہ طرز عمل اختیار کیا جا سکتا ہے؟ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ

یہ واقعہ قرآنی حد نازل ہونے سے پہلے کا نہیں ہے بلکہ بعد کا واقعہ ہے۔ کیونکہ مجرم صحابی، اعتراف کر رہے ہیں کہ میں حد کا مرتکب ہوگیا ہوں۔ مجھ پر حد قائم کر دیجئے جو اس کا ثبوت ہے کہ قرآنی حدود نازل ہوچکی تھیں۔ جب ہی تو وہ صحابی حد قائم کرنے کی درخواست فرما رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس کی صرف یہی توجیہہ ہوسکتی ہے کہ مجرم کا یہ غالباً پہلا جرم تھا اور وہ اپنے اس ارتکاب جرم پر نادم اور پشیمان تھا۔ چنانچہ وہ اعترافِ جرم کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور سزا کے لئے اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ایک ایسی ہی روایت مسند بزار میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی کسی عورت سے محبت کرتے تھے وہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور کسی اہم ضرورت سے آپ سے جانے کی اجازت چاہی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ وہ چلے گئے۔ اس وقت بارش برس رہی تھی یکایک ان صحابی کو وہی عورت ایک حوض میں غسل کرتی نظر آئی۔ وہ بیتاب ہوگئے اور اپنے پر قابو نہ رکھ سکے۔ تو جب وہ مجامعت کے لئے بیٹھے جیسے ایک مرد عورت کے سامنے بیٹھتا ہے تو پوری کوشش کے باوجود ان کو ایستادگی ہی نہ ہوسکی اور وہ کچھ کر نہ سکے آخر کھڑے ہوگئے۔ اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر سارا واقعہ آپ سے بیان کر دیا۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان سے فرمایا: جاؤ، نماز کی چار رکعتیں پڑھ لو۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ
اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴)

ترجمہ:۔ دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ حصّوں میں صلوٰۃ کو قائم کرو۔ یقیناً نیکیاں، برائیوں کے اثرات کو زائل کر دیتی ہیں۔

اس قصہ میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں یہ صحابی خوف وخشیت الٰہی کے ماتحت اگرچہ زنا کے مرتکب نہیں ہوسکے اور حق تعالےٰ نے انہیں محفوظ رکھا لیکن وہ ارادہ تو کر چکے تھے۔ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اقدامات بھی کر چکے تھے۔ وہ اگر حد کے مستحق نہیں تو تعزیر کے مستحق تو یقیناً تھے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمانے پر اکتفاء فرمایا کہ جاؤ، چار رکعتیں نماز کی پڑھ لو۔ (جمع الفوائد ص ۹۶ ج ۲)

ہمارے نزدیک اس کی توجیہہ بھی یہی ہے کہ غالباً ان صحابی کا یہ پہلا جرم تھا جو ان سے بیتابی کے ماتحت سرزد ہوگیا اور ساتھ ہی وہ اس پر سخت نادم اور پشیمان تھے۔ جب ہی تو وہ سارا واقعہ بے کم وکاست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیتے اور خود کو سزا کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور توبہ کیا ہوگی؟ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کا خوف اور خشیت پورے کمال کے ساتھ موجود تھی کہ تمام

اسباب و دواعی کی موجودگی میں وہ ارتکاب جرم پر قدرت حاصل نہ کر سکے۔ انہیں اس عورت سے محبت تھی۔ منظر شہوت آگیں تھا، محبوبہ بھی آمادہ تھی۔ وہ اپنے اوپر قدرت دے چکی تھی مگر محض خشیتِ الٰہی کے غلبہ کی وجہ سے وہ ارتکابِ جرم پر قادر نہ ہو سکے تھے۔ ان سے زیادہ اس رعایت کا اور کون مستحق ہو سکتا تھا۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد اور جامع ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مدینہ منورہ کے ایک کنارے پر میں ایک عورت سے ملا اور میں نے اس کے ساتھ بجز مجامعت کے سب ہی کچھ کیا۔ اب میں حاضر ہوں میرے متعلق جو آپ کا جی چاہے فیصلہ فرمائیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ اگر تو اپنی پردہ پوشی کر لیتا تو حق تعالیٰ نے تو تیری پردہ پوشی فرمالی تھی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آدمی کھڑا ہوا اور چلا گیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کو روانہ کیا جو اسے بلا لایا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے یہی آیت تلاوت فرمائی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ ۔۔۔ ذَاکِرِیْنَ تک۔ حاضرین میں سے ایک صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ حکم خصوصیت کے ساتھ اسی شخص کے لئے ہے؟ تو آپ نے فرمایا: نہیں سب کے لئے ہے۔

(جمع الفوائد ص ۹۶/۲)

یہاں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ ان صحابی نے بجز زنا کے اور کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر زنا کی حد نہیں تو کیا وہ کسی تعزیر کے بھی مستحق نہیں تھے؟ لیکن رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو بھی کچھ نہیں فرمایا بلکہ اقامتِ صلوٰۃ ہی کا حکم دیا ہے۔ اس کی توجیہ بھی اس کے سوا اور کیا کی جا سکتی ہے کہ آپ نے اس کی توبہ و انابت اور غالباً پہلا جرم ہونے کی بناء پر صرف اقامتِ صلوٰۃ کے حکم پر اکتفاء فرمایا کیا اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مجرم کے حالات و کوائف اس کی شرمندگی اور پشیمانی کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا کو معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کمی اور تخفیف بھی کی جا سکتی ہے ایسا نہیں ہے کہ جہاں جرم ثابت ہو جائے وہاں آنکھیں بند کر کے ضرور ہی سزا نافذ کر دی جائے۔ ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حدود میں سزائیں لازمی اور متعین نہیں ہیں کہ عدالتوں کو ان کا پابند بنا دیا جائے کہ وہ لازماً ان سزاؤں کو نافذ کریں۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوالیسر سے نقل کیا ہے کہ میرے پاس ایک عورت کھجوریں خریدنے آئی۔ میں نے اسے کھجوریں دکھائیں اور اس سے کہا کہ گھر میں اس سے بھی اچھی کھجوریں رکھی ہیں۔ وہ میرے ساتھ گھر کے اندر چلی آئی۔ میں اس پر جھک پڑا اور خوب اس کے بوسے لئے۔ پھر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: پردہ پوشی سے کام لو۔ پھر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کے پاس گیا اور ان سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ اپنے جرم کی پردہ پوشی کرو اور حق تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو۔ لیکن مجھ سے صبر نہیں ہوا۔ میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے ایک غازی کی بیوی کے ساتھ خوب نیابت کا فریضہ انجام دیا! حتیٰ کہ میرے دل میں یہ تمنا پیدا ہونے لگی کہ کاش میں اب سے پہلے مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا اور اب ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس تو تو قطعاً جہنمی ہو گیا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے دیر تک سر جھکائے رکھا۔ حتیٰ کہ آپ پر وحی نازل ہوئی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ (آخر آیت تک) آپ نے میرے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی تو آپ کے اصحاب نے عرض کیا کہ یہ حکم اسی کے لئے خاص ہے یا سب لوگوں کے لئے عام ہے۔ آپ نے فرمایا: نہیں، سب لوگوں کے لئے عام ہے۔

(بحوالہ جمع الفوائد ص ۹۶/۲)

اس روایت اور اس سے پچھلی روایت میں اس بات کی بھی صراحت ہو گئی کہ یہ رعایت ان دو اشخاص کے لئے مخصوص نہیں تھی۔ بلکہ قیامت تک آنے والا ہر شخص جو ان کی طرح اپنے فعل پر نادم اور پشیمان ہو اور اپنے کئے کی سزا بھگتنے کے لئے آمادہ ہو اس کا یہی حکم ہے۔

جرائم حدود کی شہادت نہ دینا افضل ہے

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ

ہے کہ ایک طرف تو مقدمات کے لئے شہادت ادا کرنے کا حکم ہے چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:۔

وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ط (۶۵/۲)

ترجمہ:۔ شہادت کو اللہ کے لئے قائم کرو۔

اور

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ط (۲۸۳/۲)

ترجمہ:۔ اور شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شہادت کو چھپاتا ہے تو اسی کا دل گنہگار ہے۔

اور

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ۔ (۱۴۰/۲)

ترجمہ:۔ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا کہ اللہ کی طرف سے شہادت اس کے پاس موجود ہو اور وہ اسے چھپائے۔

لیکن دوسری طرف ہمارے فقہائے کرام نے عمل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور عمل صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھتے ہوئے یہ تصریحات فرمائی ہیں کہ حدود میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"اگر یہ کہا جائے کہ زنا کے جرم کو قتل سے بھی زیادہ کیوں اہمیت دیدی گئی کہ ثبوت قتل کے لئے تو دو گواہوں کی

شہادت اور ایک مرتبہ کے اقرار ہی کو کافی سمجھ لیا گیا، لیکن زنا میں چار گواہوں کی شہادت سے کم شہادتوں کو اور ایک ہی مرتبہ کے اقرار کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ چار شہادتوں اور چار مرتبہ کے اقرار کو ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ تو مسلمانوں میں فواحش کے پھیلنے کو قطعاً پسند نہیں فرماتے؟

تو بات یہ ہے کہ زنا میں چار شہادتوں کو اس لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ زنا کے مجرمین کی پردہ پوشی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس جرم کا ستر اور اخفاء ہی حق تعالیٰ کو پسند ہے۔ حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ سوسائٹی میں فواحش کی اشاعت ہو۔

محقق ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں فرمایا ہے کہ:۔

"کہ چونکہ حق تعالیٰ کے نزدیک ان جرائم کی پردہ پوشی پسندیدہ امر ہے اس لئے زنا کی شہادت دینا خلافِ اولیٰ ہوگا۔ لیکن یہ فیصلہ مجرم کی نسبت سے کرنا ہوگا۔ ایسا مجرم جو اس جرم کا عادی نہیں ہے اور نہ اسے کوئی معمولی بات سمجھتا ہے۔ اس کے سلسلے میں شہادت نہ دینا ہی افضل ہے۔ لیکن جب صورتِ حال اس کی عام اشاعت تک پہنچ جائے اور لوگ اسے ایک معمولی بات سمجھنے لگیں بلکہ کچھ لوگ اس جرم پر فخر کرنا بھی شروع کر دیں تو ان حالات میں زنا کی شہادت ادا کرنا اور مجرموں کو کیفر کردار

تک پہنچانا اس کے چھپانے سے افضل ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا منشا اور مقصد یہ ہے کہ اس کی زمین معاصی اور فواحش سے پاک وصاف رہے۔ اگر یہ مقصد مفید خطاب (نصائح و تنبیہات) سے حاصل ہو سکتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں جرم کرنے والوں کی طرف سے توبہ اور ندامت کا اظہار ہو جائے تو اسے ہی اختیار کیا جائے گا اور انہیں تنبیہہ کر کے چھوڑ دینا چاہیئے۔ لیکن جب زنا کی گرم بازاری ہو جائے اور لوگ اسے معمولی بات سمجھنے لگیں اور اس کے پھیلنے کا خطرہ ہو تو اس وقت اللہ کی زمین کو تنبیہہ اور توبہ کے ذریعہ سے پاک رکھنا ممکن نہیں رہے گا۔ لہٰذا پھر اللہ کی زمین کو پاک رکھنے کا دوسرا ذریعہ یعنی حدود کو قائم اور نافذ کرنا ضروری ہو جائے گا۔

(فتح القدیر ص ۵/۵ مختصراً)

عبدالرزاق اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں نقل کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے زنا میں چار گواہ اس لئے رکھے ہیں کہ وہ پردہ پوشی چاہتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے فواحش سے تمہاری پردہ پوشی فرمائی ہے۔ لہٰذا اللہ نے جو پردہ ڈال دیا ہے اس کے پیچھے کسی کو جھانکنا نہیں چاہیئے۔ یاد رکھو اگر حق تعالیٰ چاہتے تو ایک ہی گواہ مقرر کر دیتے جو سچا ہو۔

(کنز العمال ص ۸۶/۲)

اس سے ہمارے اس قول کی تائید ہو جاتی ہے کہ چار گواہوں

کی شرط رکھنے سے مقصد پر دہ پوشی ہے (کہ ایسے مقدمات آسانی سے عام طور پر عدالتوں میں پیش نہ ہو سکیں) اس تائید و موافقت پر ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

(اعلاء السنن ص ۵۰۵-۵۰۶ ج ۱۱)

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ حدود کے سلسلے میں مسلمانوں کو یہی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ جہاں تک ہو سکے مجرموں کو حدود سے بچانے کی کوشش کریں۔ شیخ الاسلام علامہ عثمانی اور فقہائے حنفیہ میں سے محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہما کا خیال یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی ہے۔ اور اسی لئے حق تعالیٰ نے حدود کے جرائم کے ثبوت کے لئے بڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں۔ زنا کا جرم حالانکہ قتل سے زیادہ شدید نہیں ہے اور قتل کا جرم دو گواہوں اور ایک مرتبہ کے اقرار سے ثابت ہو جاتا ہے مگر زنا کے لئے حق تعالیٰ نے چار گواہ یا مجرم کا چار مرتبہ اقرار ضروری قرار دیا ہے۔

حد کا مجرم عادی ہونا چاہیئے

قاضی کو حدود کے سلسلے میں اس کا لحاظ بھی رکھنا چاہیئے کہ مجرم عادی ہے یا اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ اگر وہ عادی مجرم ہے اور یہ جرم یکے بعد دیگرے اس سے سرزد ہوتا رہا ہے تو اس پر حد جاری کرنی چاہیئے۔ اور اگر وہ عادی مجرم نہیں ہے۔ اس سے پہلی مرتبہ ہی یہ جرم سرزد ہوا ہے تو اس کے ساتھ حتی الامکان رعایت برتنی چاہیئے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ

امام ابن حزم نے "المحلّٰی" میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے سامنے ایک چور پیش ہوا اور اس نے کہا کہ امیر المؤمنین! میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی (یہ میرا پہلا جرم ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ عمرؓ کے پروردگار کی قسم تو جھوٹ بول رہا ہے۔ پہلے ہی گناہ پر حق تعالیٰ کبھی نہیں پکڑتے۔

ابن وہب نے عبد اللہ بن سمعان سے اسی واقعہ کو نقل کیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! حق تعالیٰ اس سے کہیں زیادہ حلیم اور بردبار ہیں کہ وہ اپنے بندہ کو پہلے گناہ ہی میں پکڑ لیں۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ کو کاٹ دینے کا حکم دیدیا۔ جب ہاتھ کٹ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو کر اس کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ اب تک تو نے کتنی مرتبہ چوری کی ہے؟ تو اس نے اقرار کیا کہ اکیس ۲۱ مرتبہ۔

(المحلّٰی ص ۱۵۸ ج ۱۱)

علامہ ابن حزم نے ایسی ہی ایک روایت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ دونوں روایتیں ضعیف ہیں۔ ان میں ایک مرسل اور دوسری بھی مرسل اور ناقابل اعتبار ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ والی روایت سند کے اعتبار سے

صحیح ہے۔

اس پر شیخ الاسلام علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں:۔

"میری گذارش یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ان دونوں مرسل روایات کی تائید ہو گئی جو حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے منقول ہیں۔ اور مرسل ہونا ہم حنفیہ کے نزدیک ضعف کی دلیل نہیں ہے۔ (حنفیہ کے ہاں مرسل روایات مقبول ہوتی ہیں)

(اعلاء السنن ص ۶۷۱-۶۷۲ ج ۱۱)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود الٰہی پہلے ہی جرم پر نافذ نہیں کرنی چاہئیں بلکہ یہ زائد سے زائد آخری سزائیں ہیں جو عادی مجرموں کو دی جانی چاہئیں۔

ان روایات میں مجرم کا یہ کہنا کہ میں نے اس سے پہلے کبھی چوری نہیں کی اور یہ میرا پہلا ہی جرم ہے اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا یہ فرمانا کہ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ اس بات کو ثابت کر رہا ہے کہ پہلے ہی جرم پر سزا نہیں دی جانی چاہیئے کیونکہ اگر پہلے ہی جرم پر بھی سزا دی جانی چاہیئے تھی تو مجرم خود بھی اس کا اظہار نہ کرتا اور یہ حضرات بھی بجائے اس کی تکذیب کرنے کے صاف صاف فرماتے کہ اس سے کیا ہوتا ہے ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تو نے جرم کیا ہے پہلی مرتبہ کیا ہو یا دوسری تیسری مرتبہ تو ہر حال میں سزا کا مستحق ہے۔ لیکن یہ سب حضرات ایسا نہیں فرماتے گویا وہ اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ واقعی اگر تیرا پہلا جرم ہوتا تو ہم

سزا نہ دیتے لیکن تو اپنے اس قول میں جھوٹا ہے۔ لہٰذا سزا کا مستحق ہے۔

مجبوری کے ماتحت جرائم

بعض جرائم کسی مجبوری کے ماتحت بھی سرزد ہوتے ہیں۔ مجبوری کے ماتحت جو جرم سرزد ہو اس کی حیثیت یقیناً وہ نہیں ہوتی جو طمع اور حرص یا عادت کے ماتحت سرزد ہونے والے جرائم کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قطع ید کی سزا کو معطل فرما دیا تھا۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل نے بہ سند ہارون بن اسمعیل عن علی بن المبارک عن یحیی بن ابی کثیر عن حسان بن ازہر نقل کیا ہے کہ ابن حدیر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کھجوروں کا پھل چرا لینے میں اور قحط سالی کے زمانہ میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ اس کو ابراہیم بن یعقوب جوزجانی نے اپنی جامع میں بھی نقل کیا ہے۔ ابراہیم کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ "عذق" کھجور کے پھل کو کہتے ہیں۔ اور "عام سنۃ" سے مراد قحط سالی کا زمانہ ہے۔ تو میں نے امام احمدؒ سے پوچھا کہ کیا آپ اس کے قائل ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا "ہاں میری جان کی قسم!" (التلخیص الجبیر ص ۳۵۸ ج ۴)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ کا اس سے استدلال فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اثر ان کے نزدیک ثابت ہے۔ اگرچہ مجھے حسان بن ازہر کا حال اسماء الرجال کی کتابوں میں نہیں ملا۔ نیز ابن حدیر بھی غیر معروف شخصیت ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد

عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ص ۱۱۵ ج ۳۔ (اعلاء السنن ص ۱۱۲ ج ۱۲)

ایسا ہی ایک واقعہ زنا کے سلسلہ میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے جسے سفیان ثوری نے اعمش سے بواسطہ ابن المسیب نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت کو لایا گیا جسے ایک بے آب وگیاہ میدان میں ایک چرواہا ملا۔ عورت بہت پیاسی تھی۔ اس نے چرواہے سے پینے کے لئے پانی مانگا اس نے پانی پلانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر تو مجھے اپنے اوپر قدرت دیدے کہ میں تجھ سے جماع کر لوں تو میں تجھے پانی پلا دوں گا۔ عورت نے اسے بہت اللہ کی قسمیں دیں مگر وہ نہ مانا۔ جب وہ پیاس سے بہت مجبور ہو گئی تو اس نے اسے اپنے اوپر قابو دیدیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ضرورت اور مجبوری کے ماتحت حد ساقط فرمادی۔ اس واقعہ کو عبدالرزاق نے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کنز العمال ص ۸۶ ج ۳۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن ص ۶۷ ج ۱۱)

بہرحال ان روایات و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت اور مجبوری کے ماتحت اگر کوئی جرم سرزد ہو جائے تو سزائے حد جاری نہیں کی جانی چاہیئے۔

مجرم کی ذہنی وجسمانی حالت

اسی طرح مجرم کی صحت اور جسمانی اور ذہنی حالت کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ حدود کا مقصد جرائم کا انسداد

ہے مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ چنانچہ انصار میں سے ایک صحابی کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہو گئے حتی کہ اتنے لاغر ہو گئے کہ ہڈی چمڑا لگ گیا۔ اسی حالت میں کوئی انصاری لڑکی ان کے گھر آئی۔ اسے دیکھ کر ان پر شہوت سوار ہو گئی اور انہوں نے ان سے مجامعت کر لی۔ جب ان کی مزاج پرسی کے لئے کچھ لوگ آئے تو انہوں نے ان سے یہ واقعہ بیان کر کے درخواست کی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے میرے متعلق فتویٰ پوچھو، کیونکہ میں نے اس لڑکی سے جو ہمارے گھر میں آئی تھی مجامعت کر لی ہے۔ لوگوں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان کیا اور بتایا کہ ہم نے اتنی بیماری جو اسے ہے کسی کو نہیں دیکھی۔ اگر ہم اسے آپ کی خدمت میں اٹھا کر لائیں تو اس کی ہڈیوں کی جوڑ جوڑ الگ ہو جائیں گے۔ اس کا ہڈی چمڑا لگ ہو چکا ہے۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ سو باریک شاخیں لے کر انہیں ایک مرتبہ اس سے چھوا دو۔ اس روایت کو ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ (ابوداؤد ص ۲۲۶ ج ۲)

اسی طرح کی ایک روایت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے ابن حزم نے المحلّٰی میں بیان کی ہے اور کہا ہے کہ سہل بن سعد کی حدیث درست ہے اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر کہا ہے کہ ہم نے اس کی سند کو عمدہ سند پایا ہے جس سے حجت

قائم ہوسکتی ہے۔ المحلّٰی ص ۱۷۵/۱۱ ۔

(بحوالہ اعلاء السنن ص ۶۱۷-۶۱۸)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کی بیماری اور جسمانی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں اس قدر تخفیف فرمادی جو درحقیقت قرآن کریم ہی سے ایک استدلال تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے تذکرۂ جلیلہ میں جب وہ کسی بات پر اپنی بیوی رضی اللہ عنہا سے ناراض ہوکر یہ قسم کھا بیٹھے کہ تندرست ہونے کے بعد وہ ان کو سو کوڑے ماریں گے۔ ان کی بیوی نہایت نیک، خدمت گزار اور صابر خاتون تھیں۔ انہوں نے بیماری و آزاری میں محنت مزدوری کرکے اٹھارہ سال تک حضرت ایوب علیہ السلام کی تیمارداری اور خدمت کی تھی۔ جب آزمائش کا زمانہ گذر گیا اور حضرت ایوب علیہ السلام تندرست ہوگئے تو انہیں اپنی قسم یاد آئی۔ سورۂ ص میں اسی واقعہ کے سلسلے میں حق تعالیٰ نے ان سے ارشاد فرمایا تھا:

وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِهٖ وَلَا تَحْنَثْ ؕ
اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ

(۳۸/۴۴)

ترجمہ: اپنے ہاتھ میں ایک شاخ لو (جس میں سو تنکے ہوں) اس سے انہیں مارو اور اپنی قسم پوری کرلو یقیناً ہم نے ایوب کو بڑا صابر پایا۔ کتنے اچھے بندے تھے اور یقیناً وہ اللہ کی طرف رجوع ہونے والے تھے۔

جو سزا حق تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی زوجۂ مطہرہ کے لئے تجویز فرمائی تھی بعینہٖ وہی سزا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصاری صحابی کے لئے تجویز فرمادی۔ اس روایت سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے مجرم کی جسمانی حالت کے پیشِ نظر سزا میں بڑی حد تک تخفیف فرمادی تھی لہٰذا حدود کی سزا میں ایسے حالات میں تخفیف کی جاسکتی ہے۔

ناگوار فریضہ

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے حدود قائم کرنے میں قطعاً کبھی سرگرمی نہیں دکھائی بلکہ انہیں ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر ہی ادا فرمایا ہے اور ہر ممکن کوشش فرمائی ہے کہ مسلمانوں کو حدود کا نشانہ بننے سے بچایا جائے۔ چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے کہ:

اِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ۔

ترجمہ: حدود کو شبہات کی بنا پر ساقط کردو۔

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، مستدرک حاکم، سنن بیہقی اور جامع صغیر میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ جہاں تک تم سے ہوسکے مسلمانوں سے حدود کو ساقط کرو۔ اگر مسلمان کے لئے خلاصی کی کوئی راہ نکال سکو تو اسے رہا کردو۔ کیونکہ امام معاف کرنے میں غلطی کرجائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی

کر جائے۔

یہی مضمون حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت علی، حضرت ابوہریرہ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے ملاحظہ ہو۔ (اعلاء السنن ص ۵۲۱-۵۲۳ ج ۱۱)

زنا کے سلسلہ میں حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے جنہیں آپ کے حکم سے سنگسار کیا گیا تھا۔ ان کے واقعہ میں حضرت ہزال (ماعز اسلمی کے آقا) کا بیان ہے کہ جب ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کے لئے (مدینہ کے سنگستان) حرّہ کی طرف لے جایا گیا اور ماعزؓ کو پتھر لگے تو وہ چلانے لگے اور وہاں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ عبداللہ بن انیس صحابی کے سامنے آئے تو چونکہ سنگسار کرنے والے کچھ نہ کر سکے تھے تو عبداللہ بن انیس نے اونٹ کی ہڈی انہیں ماری اور انہیں قتل کر دیا۔ پھر وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم نے انہیں چھوڑ کیوں نہ دیا؟ ممکن ہے وہ توبہ کر لیتے اور اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ اسے ابوداؤد نے نقل کیا ہے۔ اور اس پر کوئی تنقید نہیں فرمائی۔ (ابوداؤد ص ۲۵۸ ج ۲)

التلخیص الحبیر (ص ۳۵۲ ج ۲) میں ہے کہ اس کی سند عمدہ ہے۔

نیز زیلعی (ص ۷۷ ج ۲) میں بھی یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے اس میں یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ ہشام نے بتایا کہ یزید بن نعیم نے اپنے والد سے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

جب انہیں (یعنی نعیم کو جن کا لقب ہزال تھا) دیکھا تو فرمایا۔ اللہ کی قسم اے ہزال اگر تم اپنے کپڑے میں اسے چھپا لیتے (یعنی اس کی پردہ پوشی کر لیتے) تو تمہارے لئے اس سے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے۔ تنقیح میں ہے کہ اس کی سند درست ہے۔

(اعلاء السنن ص ۵۰۷-۵۰۸ ج ۱۱)

اس واقعہ میں آپ کا حضرت عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ "تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا۔ ممکن ہے وہ توبہ کر لیتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا" اور ہزال رضی اللہ عنہ سے یہ فرمانا کہ "اے ہزال اگر تم اسے اپنے کپڑے میں چھپا لیتے تو تمہارے لئے بہتر ہوتا جو تم نے کیا ہے" اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو رجم کرنے کا حکم کچھ خوشی سے نہیں دیا تھا۔ بلکہ ایک ناگوار فریضہ سمجھ کر دیا تھا۔

نیز عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ ان قاذورات (فواحش) سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اجتناب برتو۔ پھر جس سے کوئی لغزش ہو جائے تو وہ اسے چھپائے۔ اللہ بھی اس کی پردہ پوشی فرمائے گا اور اللہ سے توبہ کرے۔ البتہ جو اپنا چہرہ ہمارے سامنے کرے گا تو ہم اس پر اللہ کی کتاب (کا حکم) نافذ کر دیں گے۔ اسے حاکم نے مستدرک میں اور بیہقی نے سنن میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو الجامع الصغیر ص ۸ ج ۱۔ (اعلاء السنن ص ۵۱۲ ج ۱۱)

نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً منقول ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حدود کی اپنے آپس ہی میں معافی تلافی کر لیا کرو۔ حد کا کوئی مقدمہ میرے سامنے پیش ہوگا تو مجھے اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔"

یہ حدیث حسن ہے۔ (اعلاء السنن ص۵۳۶ ج۱۱)

صحابہؓ کی طرف سے پردہ پوشی کی تلقین

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی اسی تعلیم وتربیت کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرات صحابۂ کرام برابر کوشش فرماتے تھے کہ مجرم اپنی پردہ پوشی کریں اور خود ہی توبہ کر لیں اور معاملہ حکومت تک نہ پہنچنے پائے۔ چنانچہ حبیب بن ابی فضالہ بیان کرتے ہیں کہ صالح بن کریز نے ان سے بیان کیا کہ وہ اپنی کنیز کو لے کر حکم بن ایوب کے پاس گئے، میں وہاں بیٹھا تھا کہ حضرت انس ابن مالک رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے۔ وہ بیٹھ گئے تو انہوں نے پوچھا اے صالح! تمہارے ساتھ جو کنیز ہے اس کا کیا معاملہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہماری اس کنیز نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ اس پر حد جاری کردیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرو۔ اپنی اس کنیز کو واپس کردو اور اللہ کا خوف کرو۔ اس کی پردہ پوشی کرو۔ میں نے کہا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں تو اس کا معاملہ امام کے سامنے پیش کرکے رہوں گا۔ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔ ایسا نہ کرو، میری بات مان لو۔ صالح کہتے ہیں کہ وہ برابر مجھ سے یہی کہتے

رہے حتیٰ کہ میں نے ان سے کہا کہ میں اس شرط پر اسے واپس بھیج سکتا ہوں کہ اس پر جو تجھے گناہ ہوگا تو آپ اس کے ذمہ دار ہوں گے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں میں ذمہ داری لیتا ہوں چنانچہ میں نے اسے گھر بھیج دیا۔ اس روایت کو ابن حزم نے محلی (ج۱۱/۱۶۵) میں بیان کیا ہے۔ (اعلاء السنن ص۵۸۸-۵۸۹ ج۱۱)

مجرم کو انکار کی تلقین

حتیٰ کہ معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا تھا تب بھی وہ حضرات مجرم کو برسرعدالت تلقین کرنے سے نہیں چوکتے تھے تاکہ مجرم کی جان بچ جائے اور حد جاری نہ ہوسکے۔ چنانچہ ابن حزم نے موسیٰ بن معاویہ کی سند سے یزید زعافری سے روایت کی ہے کہ ایک مرد اور عورت مراد کے کھنڈرات میں پائے گئے۔ مرد نے عورت کو لہولہان کردیا تھا۔ وہ دونوں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کئے گئے۔ مرد نے کہا کہ یہ میری چچازاد بہن ہے۔ میں نے اس سے نکاح کر لیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عورت سے پوچھا۔ تو کیا کہتی ہے؟ لوگوں نے عورت سے کہا کہ ہاں کہہ دے۔ چنانچہ عورت نے ہاں کہہ دیا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے حد ساقط کردی۔ (محلّٰی ص۲۴۲ ج۱۱)

عبدالحسن بکالی نے بھی ادریس بن یزید اودی کی سند سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے جیسا کہ کنزالعمال ص۹۷ ج۳ میں بیان ہوا ہے۔ (اعلاء السنن ص۶۵۴-۶۵۵ ج۱۱)

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانیؒ نے اسی مضمون کی متعدد روایات نقل فرمائی ہیں جن میں سے ہم صرف چند روایات نقل

کرتے ہیں۔ مثلاً

ابن جریج کا بیان ہے کہ میں نے عطاءؒ بن ابی رباح (مشہور تابعی) کو کہتے ہوئے سنا کہ جو حضرات (صحابہ) گذر چکے ہیں ان کے سامنے چور کو لایا جاتا تھا تو وہ اس سے کہتے تھے۔ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہدے کہ نہیں! اور انہوں نے خصوصیت سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا نام لیا۔ اسے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو التلخیص الحبیر ص۳۵۷ ج۲۔
(اعلاء السنن ص۵۴۲ ج۱۱)

نیز معمر نے طاؤس سے، انہوں نے عکرمہ بن خالد سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا، کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہدے کہ نہیں! چنانچہ اس نے کہہ دیا کہ "نہیں" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے چھوڑ دیا۔ اسے عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں بیان کیا ہے دیکھئے التلخیص الحبیر ص۳۵۷ ج۲۔ اس کے رجال (راوی) صحیحین کے راوی ہیں۔ البتہ عکرمہ ابن خالد کا سماع حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں۔ (اعلاء السنن ص۵۴۲ ج۱۱)

نیز حماد نے ابراہیم (نخعی) سے نقل کیا ہے کہ ابو مسعود انصاریؓ صحابیؓ کی خدمت میں ایک عورت پیش ہوئی جس نے ایک اونٹ چرا لیا تھا تو حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا۔ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ "نہیں"۔ سفیان ثوری نے اسے اپنی جامع میں بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو التلخیص الحبیر بحوالہ سابق)

اس اثر کو نقل فرما کر علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

"میں کہتا ہوں کہ اس کی سند، استدلال کرنے کے قابل ہے اس کے باوجود کہ ابراہیم (نخعی) کی ملاقات ابو مسعود انصاریؓ سے ثابت نہیں۔ کیونکہ یہ انقطاع ہمارے نزدیک مضر نہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ابراہیم نخعی کی مراسیل صحیح ہی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ کتاب الحج میں گزر چکا ہے۔ (اعلاء السنن ص۵۴۳ ج۱۱)

نیز یہ روایت بھی کہ ہمیں ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبر دی کہ ہم سے ابراہیم بن محمد بن المنتشر نے اپنے والد سے حدیث بیان کی انہوں نے یزید بن کبشہ سے کہ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک حبشی کنیز پیش کی گئی کہ اس نے چوری کی ہے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ ان دنوں دمشق میں قضا پر متعین تھے۔ انہوں نے کہا: اے سلامہ! کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ "نہیں" اس نے کہہ دیا کہ "نہیں"۔ لوگوں نے کہا: اے ابو درداء! تم اسے تلقین کر رہے ہو؟ (یعنی جواب سکھا رہے ہو) حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں۔ تم میرے پاس ایک ایسی عورت کو لائے ہو جو بے چاری نہیں جانتی کہ تم اس کے متعلق کیا ارادہ کر رہے ہو کہ میں اس کا ہاتھ کاٹ دوں۔ اسے امام محمدؒ نے کتاب الآثار (ص۹۳) میں نقل کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی سند ایسی ہے جس سے حجت پکڑی جا سکتی ہے۔ اور راوی اس کے سب ثقہ ہیں۔ (اعلاء السنن ص۵۴۳ ج۱۱)

نیز ابن ابی شیبہ نے ابو المتوکل کی سند سے روایت کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک چور کو پیش کیا گیا۔ وہ ان

دنوں امیر تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا: کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہہ دے کہ "نہیں" دو یا تین مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس سے یہی کہا۔ ملاحظہ ہو التلخیص الحبیر ج ۲ ص ۳۵۷ (اعلاء السنن ص ۵۴۳ ج ۱۱)

ان تمام روایات میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین مجرموں کو برسر عدالت جبکہ ان کے سامنے ان کے مقدمات پیش ہیں خود تلقین فرما رہے ہیں کہ تم جواب میں انکار کر دو۔ یعنی تاکہ ہم تم پر حد جاری نہ کر سکیں۔ حالانکہ قاضی کو عدالت میں دیگر جرائم میں اس قسم کی تلقین کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان حضرات کا مقصد حدود کو نافذ کرنے کے بجائے ملزموں کو رہائی دلانا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہم مجرموں پر حد جاری کریں۔

صرف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسی کوششیں نہیں فرمائیں بلکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی متعدد موقعوں پر نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے بھی مجرموں کو معاف فرما دیا اور حد وغیرہ جاری نہیں فرمائی یا حد میں کافی تخفیف فرما دی اس قسم کی روایات جو زیادہ تر صحیحین یا صحاح ستہ کی ہیں ہم شروع میں پیش کر چکے ہیں۔

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حدود کے معاملات کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ ہمیں ان حضرات کی طرف سے ان جرائم کے اثبات اور حدود قائم کرنے میں کوئی بھی سرگرمی اور ذوق و

شوق نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاتھوں جن مجرمین پر حدود قائم کی گئی ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ انہوں نے بادلِ ناخواستہ ہی حدیں قائم فرمائی ہیں۔ ان کی طرف سے کسی ایک واقعہ میں بھی ہمیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کسی ذوق و شوق اور اشتیاق کا اظہار فرمایا ہو۔

ہمارا رجحان

لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام اور ہمارے عوام کا رجحان یہی ہے کہ وہ اسی کو اسلامی حکومت سمجھتے ہیں جس میں حدود کا نفاذ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہو۔ چنانچہ جب مسلمان مملکتوں کا تذکرہ چھڑتا ہے تو ہم بے تکلف ہر مملکت کو مسلمان مملکت کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت کسی ایک کو بھی نہیں کہتے۔ لے دے کر بڑی مشکل سے ہم سعودی عرب کی حکومت کو اسلامی حکومت کے لقب سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہاں اسلامی حدود نافذ ہیں۔ ہماری موجودہ مارشل لاء حکومت نے حدود کے نفاذ کا اعلان کیا تو ہمارے علماء کی طرف سے اس کی زبردست حمایت کے اعلان کیے گئے اور بعض حلقوں کی طرف سے برملا اظہار کیا گیا کہ اب ہماری حکومت اسلامی حکومت بن گئی ہے۔

اسلامی حکومت

قرآن کریم نے حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف و توصیف فرمانے کے بعد اسلامی حکومت کے جو خدوخال بیان فرمائے ہیں ان میں سرفہرست اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ کو رکھا ہے۔ سورۂ حج میں

ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط (۲۲/۴۱)

ترجمہ :۔ جنہیں اگر ہم نے زمین میں تمکن عطا فرمادیا تو وہ صلوٰۃ قائم کریں گے ، زکوٰۃ دیں گے ، نیک کاموں کو فروغ دیں گے اور برائیوں کو روکیں گے۔

اس آیت مقدسہ میں اسلامی حکومت کی چار خصوصیات بتائی گئی ہیں۔ سب سے اہم اور سب سے پہلی خصوصیت اقامت صلوٰۃ بیان کی گئی ہے۔ صلوٰۃ پڑھنا نہیں بلکہ صلوٰۃ کو قائم کرنا۔ اسلام میں صلوٰۃ ایک ایسا جامع لفظ ہے جس میں پورا اسلامی نظام آجاتا ہے۔ یہ وہ نگینہ ہے جس میں پوری مملکت سموئی ہوئی ہے۔ اس میں پورا اسلامی نظام جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں۔ مختصراً اتنا سمجھئے کہ مساواتِ انسانی اور عدلِ عمرانی اس کی پہلی منزل ہے۔ ہمارے ملّی شاعر نے شاید لاشعوری طور پر ہی کہہ دیا ہے ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ مصاف زندگی میں بندہ اور بندہ نواز کا فرق مٹ جائے۔ صرف مسجد میں پانچ منٹ کا مظاہرہ بے معنیٰ ہے۔ فکر و عمل کی مکمل ہم آہنگی اور یک جہتی اقامتِ صلوٰۃ کا دوسرا

سبق ہے۔ ڈسپلن اور مکمل اطاعت اس کا تیسرا سبق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان مقاصد کی نمود ہماری پوری زندگی میں ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اس کی نمائش صرف ہماری مسجدوں تک محدود ہو کر رہ جائے۔ جب تک عملی زندگی میں قدم قدم پر مقاصد صلوٰۃ کا مظاہرہ نہ ہو اور ہم اس کے مطابق اپنی پوری زندگی نہ ڈھال لیں اقامت صلوٰۃ کا فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ مگر ہم نے اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے معنے یہ کر لئے ہیں کہ وہ نماز پڑھیں گے۔ چنانچہ اس پر بڑا زور دیا جاتا ہے کہ نمازیں پڑھی جائیں۔ جو کام کرنے کے تھے انہیں ہم نے کرنے کے بجائے پڑھنا بنا لیا ہے اور ہم بالکل مطمئن ہیں کہ ہم دین کے تقاضوں کو صحیح صحیح پورا کر رہے ہیں۔ یہی کچھ ہم نے قرآن کریم کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ کتاب عظیم اس لئے نازل فرمائی تھی کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں اور اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال لیں مگر ہم نے عمل سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اسے پڑھنے کی ایک کتاب بنا لیا ہے۔ خیال تو فرمائیے کہ سربراہِ مملکت کی طرف سے آپ کے پاس کوئی ہدایت نامہ آئے کہ فلاں فلاں کام اس طرح انجام دیدو۔ لیکن ہم ان ہدایات پر عمل کرنے کے بجائے روزانہ اس ہدایت نامے کو آنکھوں سے لگا کر اور چوم چاٹ کر بڑی ترتیل و تجوید سے اس کی تلاوت کر لیا کریں تو کیا ہم اس طرح اس ہدایت نامہ کے ساتھ مذاق نہیں کرتے۔

یہی صورت ہم نے اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے ساتھ کی ہوئی ہے کہ بجائے قوم کے نادار اور معذور افراد کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے

اور انہیں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے چند سکے ان کی جھولی میں ڈالنے کو ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے ایتاء زکوٰۃ کا فریضہ ادا کر دیا۔

تیسری اور چوتھی خصوصیت کے ساتھ بھی ہم نے یہی مذاق کیا ہوا ہے۔ بنیادی چیز حریت و مساواتِ انسانی اور عدلِ عمرانی کو قائم کرنے کے بجائے محض چند رسمیں ادا کر دینے کو ہم نے اسلامی نظام سمجھ لیا ہے۔

یاد رکھیئے جب تک آپ عدل عمرانی قائم نہیں کرتے اور امیر و غریب کا فرق ختم نہیں کرتے اسلامی نظام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ کو چوتھے درجہ میں رکھا ہے مگر ہم نے اسے اول درجہ دیدیا ہے۔ قیام حدود کا تعلق نہی عن المنکر سے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس کا چوتھا درجہ تھا۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا پہلا اور دوسرا درجہ تھا جو ہماری نگاہوں سے قطعاً اوجھل ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے کرنے کا کام مساوات انسانی اور عدل عمرانی کا قیام ہے۔ پہلے تو آپ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کے لئے چوری کرنے کا جواز ہی نہ رہے۔ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی جنسی خواہشات جائز طور پر پوری ہو سکیں۔ ایسے حالات پیدا کیجئے کہ لوگوں کی عزت و آبرو محفوظ ہو جائے اور کوئی اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس کے بعد حدود کا نفاذ کیجئے۔

لیکن موجودہ حالات میں جبکہ لوگ نان شبینہ کو محتاج ہوں مہنگائی، گرانی، چور بازاری عام ہو، جوان لڑکیوں کا نکاح جوئے شیر

لانے سے کم نہ ہو[1] عزت و ناموس کوڑیوں کے مول بازاروں میں نیلام ہو رہی ہو۔ آپ حدود نافذ کر کے اپنے دل کو جھوٹا اطمینان تو دلا سکتے ہیں کہ ہم نے اسلامی نظام قائم کر دیا مگر حقیقت کا اس سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔

---

[1] یہ ہمارے معاشرہ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ صرف کراچی شہر میں نوجوان، تعلیم یافتہ، خوبرو لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ انہیں بر نصیب نہیں ہو رہا کیونکہ ان کے ماں باپ کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ نہیں ہے جس سے وہ اپنی بچیوں کا معمولی جہیز تیار کر سکیں۔ ان حالات میں اگر بے راہ روی کی صورتیں ظہور پذیر ہوں تو کیا تعجب ہے۔ کیا ان حالات میں حدود کا نفاذ عدل عمرانی کا تقاضا ہے؟

(مؤلف)

حد زنا

زنا اسلام کی نظر میں زنا انتہائی شدید جرم ہے۔ مال جان، اور آبرو ہر انسان کی متاع حیات ہوتی ہے۔ ہر شریف آدمی کے نزدیک ان کی ترتیب بھی یہی ہے۔ مال عزیز ترین متاعِ حیات ہے لیکن اسے جان کی حفاظت کے لئے قربان کیا جاسکتا ہے کیونکہ جان مال سے زیادہ قیمتی چیز ہے لیکن عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے جان کا نذرانہ پیش کیا جاسکتا ہے اور پیش کیا جاتا ہے کیونکہ سب سے اعلیٰ متاع حیات انسان کی عزت و آبرو ہی ہوتی ہے۔ زنا کا جرم انسان کی عزت و آبرو پر حملہ ہوتا ہے اس سے آدمی دوسرے کی عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اسے لوٹ لیتا ہے جو انتہائی گھناؤنا جرم ہے۔ اسلام نے اس کی سزا بھی اتنی ہی شدید رکھی ہے جتنا جرم شدید ہے۔ چنانچہ سورۃ النور

میں ہے:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○

(۲۴/۲)

ترجمہ:۔ ہر زنا کار عورت اور زنا کار مرد ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور تمہیں ان دونوں پر کوئی ترس نہ آنا چاہیئے اللہ کے دین میں۔ اگر تم واقعی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ اور ان دونوں کی اس سزا کا مسلمانوں میں سے ایک گروہ مشاہدہ کرے۔

یعنی یہ سزا مجمع عام میں دی جائے کہیں چھپ چھپا کر نہ دی جائے۔ کیونکہ مقصد صرف ان لوگوں کو سزا دینا ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کا سامان مہیا کرنا بھی ہے۔ عبرت و موعظت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہ سزا سب لوگوں کے سامنے مجمع عام میں دی جائے اسلام چاہتا ہے کہ اس جرم کی جڑ ہی کٹ جائے اور کسی کو آئندہ اس شنیع جرم کے ارتکاب کی جسارت ہی نہ ہو سکے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي (ہر زنا کار مرد اور زنا کار عورت) بالکل واضح الفاظ ہیں ان دونوں پر الف و لام استغراق کا ہو یا جنس کا، ہر اس شخص کو اپنے تحت لے آتا ہے جس سے زنا کا ارتکاب ہوا

ہو جوان آدمی زنا کرے، ادھیڑ آدمی زنا کرے، بوڑھا آدمی زنا کرے، کنوارا آدمی زنا کرے یا شادی شدہ آدمی زنا کرے سب کو زانی ہی کہا جاتا ہے اسی طرح ہر عورت جوان، ادھیڑ، بوڑھی، کنواری اور شادی شدہ جو بھی زنا کی مرتکب ہو وہ زَانِیَۃٌ ہی کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر زنا کار عورت اور ہر زنا کار مرد کی سزا بیان فرمادی ہے اور اس میں سوائے شادی شدہ کنیز کے جو زنا کی مرتکب ہو (اور جس کی سزا ۴/۲۵ میں بیان فرمادی گئی ہے) کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی گئی نہ کسی قسم کا کوئی استثناء فرمایا گیا ہے لہٰذا قرآن کریم کی رو سے ہر زنا کار کی سزا (سوائے شادی شدہ لونڈی) کے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہر دو صورتوں میں سو ۱۰۰ درے مارنا ہے، زنا کی سزا کے سلسلے میں قرآن کریم میں جتنی آیتیں آئی ہیں ان سے اگرچہ رجم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن تمام فقہائے اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد اگر کنوارے ہوں تو ایک سو درّے کی سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ شادی شدہ ہوں تو انہیں رجم (سنگسار) کیا جائے گا۔ تا آنکہ وہ مر جائیں۔ البتہ خوارج، معتزلہ، بعض زیدی شیعہ اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رجم کا انکار کیا ہے۔ (نظام التجریم والعقاب فی الاسلام ص ۱۸۲/ج ۱ اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مزید کچھ حوالے آگے آرہے ہیں و فتح الباری ص ۱۲۷/ج ۱۵ و نیل الاوطار باب الرجم)

ہم ان حضرات کی تائید نہیں کرتے جو رجم کا قطعاً انکار کر دیتے

ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے کہ رجم قرآنی حد ہے۔ ہم رجم کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن قرآنی حد کی حیثیت سے نہیں بلکہ تعزیر کی حیثیت سے۔ مملکت اسلامی زنا کی سزا رجم یا رجم سے بھی زیادہ بطور تعزیر کے دینا چاہے تو وہ دے سکتی ہے۔ تاہم رجم ہمارے نزدیک قرآنی حد نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں زنا کے متعلق۔

(۱) پہلی آیت تو وہی سورۃ النور کی مشہور آیت ہے۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ۔ (۲۴/۲)

ترجمہ:۔ ہر زنا کار عورت و مرد کو، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس میں اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ کلمہ عام ہے جس میں ہر زنا کار شامل ہے خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، پھر دونوں پر الف لام استغراق یا جنس کا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا عموم اور بھی صریح ہو گیا ہے جسے اصول فقہ کے مطابق خاص نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خاص کر لینے کے معنے اس کے عموم کو منسوخ کر دینے کے ہیں جو خبر واحد سے جائز نہیں۔

(۲) اس سے اگلی آیت میں ہے:۔

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (۲۴/۳)

ترجمہ:۔ اور زنا کار مرد نہ نکاح کرے مگر زنا کار یا مشرک عورت سے اور زنا کار عورت سے سوائے زنا کار

یا مشرک مرد سے کوئی اور نکاح نہ کرے۔ مسلمانوں پر یہ حرام کر دیا گیا ہے۔

اس آیت میں بھی اَلزَّانِیَۃُ اور اَلزَّانِیْ کلمہ عام ہے اور دونوں پر الف لام استغراق یا جنس کا لگا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس کا عموم دو آتشہ ہو گیا ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ کوئی زنا کار مرد بجز زنا کار اور مشرک عورت کے کسی دوسری عورت سے نکاح نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی زنا کار عورت سے بجز زنا کار اور مشرک مرد کے کوئی دوسرا مرد نکاح نہیں کر سکتا۔ یعنی زنا کار مرد اور عورت زنا کے بعد اس کی بھی صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ کسی سے نکاح کر سکیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہیں۔ سنگسار کر کے قتل کر دینا نہیں ہے۔ کیونکہ سنگسار کر کے قتل کر دینے کے بعد اس کا امکان ہی نہیں رہتا کہ کوئی زنا کار مرد و عورت کسی سے نکاح کر سکیں۔

(۳) تیسری آیت سورۂ نساء میں باندیوں کے متعلق آئی ہے کہ اگر وہ زنا کی مرتکب ہوں۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَۃٍ فَعَلَیْھِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴/۲۵)

ترجمہ: تو جب وہ شادی شدہ ہوں تو اگر وہ زنا کا ارتکاب کریں تو ان پر اس سزا کا نصف واجب ہے جو شادی شدہ آزاد عورتوں پر ہوا کرتی ہے۔

اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ محصنہ (آزاد شادی شدہ عورتوں) کو جتنی سزا دی جاتی ہے اس سے آدھی سزا کنیزوں کو دی جائے گی۔ یعنی مُحْصَنَۃ عورتوں (شادی شدہ آزاد عورتوں) کی سزا ایسی ہوتی ہے جسے آدھا کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رجم کی سزا کو تو آدھا کیا ہی نہیں جا سکتا۔ لامحالہ ان کی سزا سو درّے ہی ہونی چاہیئے کہ ان کے نصف یعنی پچاس درّے ان کنیزوں کو لگائے جا سکیں۔ چنانچہ تمام فقہائے امت متفقہ طور پر کنیزوں کے متعلق یہی فرماتے ہیں کہ ان کی سزا پچاس درّے ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت بھی رجم کی نفی فرما رہی ہے۔ کیونکہ رجم کی سزا کو آدھا کر لینا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس آیت کے مطابق مُحْصَنٰت کی سزا ایسی ہونی چاہیئے جسے آدھا کرنا ممکن ہو۔

مُحْصَنٰت کے ہمارے علمائے کرام کے نزدیک بھی تین معنے ہو سکتے ہیں (۱) شادی شدہ عورتیں (۲) پاک دامن عورتیں (۳) خاندانی وجاہت کی وجہ سے محفوظ و مامون عورتیں۔ اس آیت میں اس کے معنے پاک دامن عورتیں تو ہو نہیں سکتے کیونکہ یہ عورتیں سزایاب ہیں۔ لامحالہ اس کے معنے یا تو شادی شدہ عورتوں کے ہوں گے یا خاندانی صاحب وجاہت عورتوں کے ہوں گے جو اپنی ذاتی شرافت و وجاہت سے محفوظ و مصئون ہوں۔ اگر شادی شدہ عورتوں کے معنے ہوں تو ثابت ہوا کہ ان کی سزا قرآن سے رجم نہیں ہے بلکہ سو کوڑے ہے۔ کیونکہ اسی کو نصف کرنا ممکن ہے۔ اگر تیسرے معنے یعنی خاندانی صاحب

وجاہت عورتوں کے لئے جائیں تب بھی خاندانی صاحب وجاہت عورتیں کنواری بھی ہوتی ہیں اور شادی شدہ بھی۔ ایسا تو نہیں ہے کہ خاندانی وجاہت صرف آزاد کنواری عورتوں ہی کو حاصل ہوتی ہو اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں اس سے محروم ہوتی ہوں۔ لہٰذا اس آیت سے پھر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ کنواری اور شادی شدہ آزاد خاندانی عورتوں کی دونوں کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔ رجم نہیں ہے۔ کیونکہ سو کوڑوں ہی کو نصف کر لینا ممکن ہے۔ رجم کی سزا کو نصف کر لینا ممکن نہیں ہے۔

(۴) عَذَابٌ عربی زبان میں اس اذیت اور تکلیف کو کہتے ہیں جو بطور سزا کے کسی کو دی جائے۔ یہ اذیت اور تکلیف مار پیٹ کی شکل میں ہوتی ہے قتل کی صورت میں نہیں ہوتی۔ عَذْبٌ کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہوتی ہیں (۱) پانی کی خوشگواری اور شیرینی جو پیاس کو روک دے (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہو جاتی ہے۔ اور (۳) بندش منع کرنا اور رکاوٹ۔

ابن فارس نے لکھا ہے کہ:۔

خلیل نے بیان کیا ہے کہ عَذَّبْتُهُ تَعْذِيبًا کے معنے ہیں۔ میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا۔ یہ امتناع کے باب سے ہے یعنی کھانے پینے سے روک دینا۔ اس کے دوسرے معنے جو پہلے معنے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے، عذاب ہیں۔ کہا جاتا

ہے عَذَّبْتُهُ تَعْذِيبًا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اصل عذاب مار ناپیٹنا ہوتا ہے۔ زہیر کا شعر ہے ؎

وَخَلْفَهَا سَائِقٌ يَحْدُوا إِذَا خَشِيَتْ
مِنْهُ الْعَذَابَ تَمُدُّ الصُّلْبَ وَالْعُنُقَا

ترجمہ:۔ اس کے پیچھے اس کو ہانکنے والا حُدی پڑھ رہا ہے۔ جب اسے اس کی مار پیٹ کا اندیشہ ہوتا ہے تو کمر کی ہڈی اور گردن کو دراز کر لیتی ہے۔

(ابن فارس ص ۲۶۰ ج ۳ مطبوعہ دار احیائے الکتب العربیہ عیسیٰ البابی الحلبی، مصر)

امام راغب نے کہا ہے کہ عَذَّبْتُهُ کے معنے ہیں، میں نے اسے زندگی کی لذت اور خوشگواریوں سے محروم کر دیا۔ جیسے مَرَّضْتُهُ کے معنے ہیں، میں نے اس سے مرض کو دور کر دیا۔ قَذَّيْتُهُ کے معنے ہیں، میں نے اس کی آنکھ سے تنکا نکال دیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تَعْذِيبٌ کے معنے ہیں، کسی کو دُرّے کے سرے (عَذَبَةٌ) سے متواتر مارنا۔ چنانچہ بعض علمائے لغت نے تَعْذِيبٌ کے معنے مار ناپیٹنا ہی لکھے ہیں۔

(مفردات القرآن مع ترجمہ و حواشی شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہٗ فیروزپوری مطبوعہ اہلحدیث اکیڈمی لاہور)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ عَذَابٌ کے معنے زندگی کی وہ اذیت اور تکلیف ہے جو بطور سزا کے کسی کو دی جائے۔ بلکہ بعض اہل لغت نے اس کے معنے مار ناپیٹنا ہی لکھے ہیں

اور بعض علمائے لغت نے تو کہا ہے کہ اس کے معنے کوڑے (درّے) کے سرے سے متواتر مارنے کے ہوتے ہیں۔ اس کی تائید خود سورۂ نور کی اس مشہور آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں زانیہ اور زانی کو سو کوڑے مارنے کا حکم دے کر فرمایا گیا ہے۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ

(۲۴/۲)

ترجمہ: اور ان کے اس عذاب (کوڑوں کی سزا) میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو حاضر رہنا چاہیئے۔

اس آیت میں کوڑوں ہی کی سزا کو عذاب کہا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد لعان کے سلسلہ میں سورۂ نور ہی میں جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی مرد اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو دونوں میاں بیوی (لعان کریں یعنی) پانچ پانچ قسمیں کھائیں۔ اسی سلسلے میں ہے۔

وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ

شَهَادَاتٍ۔ (۲۴/۸)

ترجمہ: اور عورت اپنے سے عذاب کو اس طرح ٹلا سکتی ہے کہ وہ چار شہادتیں دے۔

لعان کرنے والی یہ عورت شادی شدہ ہے اور عذاب (یعنی کوڑوں کی سزا یا مار پیٹ کی سزا) کو پانچ قسمیں کھا کر ٹلا رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے علمائے لغت کی تصریحات سے ثابت کیا ہے عذاب کبھی بھی قتل کی صورت میں نہیں ہوتا۔ قرآن یہاں

شادی شدہ عورت کی سزا کو عذاب فرما رہا ہے جو مار پیٹ یا کوڑے مارنے ہی کی صورت میں ہوتا ہے۔ قرآنی سزائے زنا اگر رجم ہوتی تو قرآن کریم یہاں وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْعَذَابَ نہ فرماتا بلکہ کچھ اور فرماتا۔ مثلاً وَيَدْرَأُ عَنْهَا الرَّجْمَ۔ یا وَيَدْرَأُ عَنْهَا الْقَتْلَ۔

(۵) ازواج مطہرات کو خطاب فرماتے ہوئے سورۂ احزاب میں آیا ہے۔

يٰنِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (۳۳/۳۰)

ترجمہ: اے پیغمبر کی بیبیو! جو تم میں سے کھلی بیحیائی کا ارتکاب کرے گی تو اسے دوگنی سزا دی جائے گی۔

یہاں ازواج مطہرات شادی شدہ ہیں اور ان کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ (معاذ اللہ معاذ اللہ) اگر وہ کھلی بے حیائی کی مرتکب ہوں گی تو انہیں دوگنی سزا دی جائے گی۔ لہٰذا اس آیت کریمہ کی رو سے شادی شدہ عورت کی سزا زنا میں ایسی ہونی ضروری ہے جسے دوگنا کیا جا سکے۔ رجم کی سزا کو تو دوگنا نہیں کیا جا سکتا۔ لامحالہ کوڑوں ہی کی سزا متعین ہے جسے دوگنا کرنا ممکن ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت کریمہ میں بھی سزائے زنا کو قرآن کریم عذاب ہی سے تعبیر کر رہا ہے جو قتل کی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ عذاب کے معنے زندگی کی لذت اور خوشگوار یوں سے محروم کر دینا، مار پیٹنا، کوڑوں سے مسلسل مارنا ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

قرآن مجید کی یہ تمام آیات کریمہ اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے۔ رجم نہیں ہے۔ چنانچہ متقدمین میں سے خوارج، معتزلہ، بعض زیدی شیعہ اور بعض مغاربہ (مالکیہ) نے رجم کا انکار کیا تھا۔ اور متاخرین میں سے حضرت مولانا انور شاہؒ صاحب کشمیری شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند۔ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھیؒ، علمائے اہل حدیث کے سرخیل مولانا وحید الزمانؒ صاحب مترجم مؤطا۔ مصر کے مشہور فاضل علامہ ابو زہرہؒ، علامہ علی علی منصورؒ مصنف نظام التجریم والعقاب فی الاسلام، مصر کے جلیل القدر فقیہہ اور عالم استاذ مصطفیٰ زرقاء شیخ الازہر علامہ شیخ محمود شلتوت، عالم عرب کے مشہور علماء مثلاً علامہ شیخ علی خفیف اور علامہ شیخ عبدالوہاب خلاف مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ موسیٰ جاراللہ ترکی رحمہم اللہ اجمعین بھی رجم کو حد نہیں بلکہ تعزیر مانتے ہیں۔

ہم نے یہاں محض مختصر اشارات پر اکتفاء کیا ہے۔ تفصیل کے لئے ہماری کتاب "رجم حد ہے یا تعزیر" ملاحظہ فرمائیں جس کے دوسو سے زائد صفحات میں ہم نے اس پر مفصل و مدلل گفتگو کی ہے۔ کچھ بحث ہم نے اسی جلد چہارم کے باب الرجم میں بھی کی ہے۔ اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رجم چوں کہ حد نہیں بلکہ تعزیر ہے اس لئے حاکم وقت یا عدالت کو اس کا اختیار ہے کہ وہ معاشرہ اور مجرم کے حالات دیکھتے

ہوئے سیاستہً تشدید کر سکتی ہے اور وہ تشدید قتل اور رجم کی صورت میں بھی کی جا سکتی ہے۔

ھذا ما راٰیتہٗ واللہ اعلم

یہاں ہم نے محض ربط قائم کرنے کے لئے چند اشارات پر اکتفاء کیا ہے۔ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اپنی کتاب "رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟" میں کر چکے ہیں۔ تفصیل اس میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ رجم کے موضوع پر کچھ بحث ہم اس کتاب کے "باب التعزیر" میں بھی کریں گے۔ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

(باب حد القذف)

قذف کسی مرد یا عورت پر زنا کی تہمت لگانے کو کہتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی کسی آزاد، عاقل، بالغ، مسلمان اور پاک دامن آدمی پر، مرد ہو یا عورت، زنا کی تہمت لگا دے تو قرآن کریم نے اس کے لئے سزا میں اسّی کوڑے مقرر فرمائے ہیں۔ اسے حد قذف کہتے ہیں۔ لیکن قذف کی یہ اصطلاح فقہاء کی ہے۔ قرآن کریم نے قذف کے لفظ کو اس معنے میں استعمال نہیں کیا قرآن کریم نے پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت کیلئے رَمْیُ الْمُحْصَنٰتِ یعنی پاکدامن عورتوں کو زنا کا نشانہ تہمت بنانے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ سورۃ النور میں ہے:۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۲۴/۴)

ترجمہ:۔ جو لوگ پاک دامن عورتوں کو (زنا کی) تہمت لگاتے ہیں۔ پھر چار گواہ پیش نہیں کرتے تو انہیں اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی بھی قبول نہ کرو۔ اور یہ لوگ فاسق ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنے اعمال درست کرلیں تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

قرآن کریم میں یرمون المحصنات (محصنات کو تہمت

لگاتے ہیں) کے الفاظ آئے ہیں اور محصنات باندیوں کو نہیں کہتے باندیوں کے سلسلہ میں سورۂ نساء میں ہے۔

فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ (۴/۲۵)

ترجمہ:۔ پھر اگر وہ بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کا نصف ہے جو آزاد پاک دامن عورتوں کو دی جاتی ہے (یعنی پچاس کوڑے)۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ محصنات سے مراد قرآن کریم میں آزاد عورتیں ہوتی ہیں۔ اب چونکہ باندیاں نہیں ہوتیں۔ یہ سلسلہ ہی اسلام نے ختم کر دیا ہے اس لئے اب اس شرط کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ البتہ عاقل و بالغ نیز مسلمان اور پاک دامن کی شرط ضروری ہے۔ کیونکہ تہمت کی وجہ سے ایک شریف آدمی کو سوسائٹی میں جو عار لاحق ہوتی ہے۔ یہ حد اسی کی سزا ہے۔ لیکن ایک مجنون اور نابالغ، نیز کافر اور بدکردار آدمی کو اگر تہمت لگائی جائے تو ان کو کوئی عار لاحق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری شرط یہ بھی ہے کہ جس شخص پر تہمت لگائی گئی ہے وہ حد کا مطالبہ کرے اور عدالت میں اس کے لئے باقاعدہ مرافعہ داخل کرے۔ بغیر کسی مطالبہ کے حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ یہ حد اسی شخص کا حق ہے جس پر تہمت لگائی گئی ہے۔ یہ حق اللہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی طرف سے حد کا مطالبہ کیا جانا ضروری

تعزیر نیز ایسی گالیاں جن سے کسی کے والدین پہ زنا کی تہمت کا مطلب تو نہیں نکلتا البتہ اسے اذیت پہنچتی ہے اور عار لاحق ہوتی ہے مثلاً کسی کو چور، ڈاکو کہہ دینا یا کسی کو کافر، فاسق و فاجر، خبیث، دیوث وغیرہ کہہ دینا تو اس قسم کی گالیوں میں حد تو واجب نہیں ہوگی البتہ اگر وہ شخص جسے اس قسم کی گالیاں دی گئی ہیں عدالت میں مرافعہ کرے تو حاکم مجاز گالی دینے والے پر تعزیر جاری کر سکتا ہے۔ یعنی گالی کی مناسبت سے اس کے لئے اپنی صوابدید کے مطابق سزا تجویز کر سکتا ہے۔ فقہاء نے اتنی ہی رعایت رکھی ہے کہ وہ ہر صورت میں حد شرعی سے زیادہ نہ ہونی چاہیئے اس سے کم ہی ہونی چاہیئے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ کم از کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ کم سے کم حدِ شرعی قذف میں چالیس کوڑے ہوتی ہے یعنی اگر زنا کی تہمت لگانے والا آزاد آدمی نہ ہو بلکہ غلام یا باندی ہو تو اسے آزاد آدمی کی نصف سزا یعنی چالیس کوڑے مارے جاتے ہیں۔ تو کم سے کم تہمت زنا کی شرعی حد چالیس کوڑے ہوئی۔ لہٰذا حاکم مجاز چالیس سے ایک کوڑا کم یعنی انتالیس کوڑوں تک کی سزا دے سکتا ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ قذف کی اصل سزا تو اسی کوڑے مقرر کی گئی ہے۔ لہٰذا تعزیر میں حاکم مجاز پچھتر کوڑوں تک سزا دے سکتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تعزیر میں گالی کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاکم مجاز اپنی

وہ گناہ ہوگا جو اس نے کمایا ہے۔ اور ان میں سے جو شخص تہمت کے بڑے حصہ کا ذمہ دار ہوگا اس کے لئے بڑا عذاب ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب تم ایسی جھوٹی بات کو سنو تو مسلمان مرد اور عورتیں اپنے نفسوں کے متعلق نیک گمان ہی کریں اور کہہ دیں کہ یہ تو کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ (اس لئے کسی طرح قابل اعتبار نہیں)۔

ان آیات کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ جھوٹی باتیں گڑھ گڑھ کر لوگوں کے متعلق مشہور کر دینا انتہائی گناہ کا باعث ہے۔ خود مسلمانوں ہی میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کا مشغلہ ہی یہ ہو کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹی تہمتیں لگا کر بدنام کرنا چاہیں۔ چنانچہ خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسے منافق موجود تھے جو خود کو سچا مسلمان کہتے تھے لیکن ان کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ مسلمان مردوں اور عورتوں پر طرح طرح کی تہمتیں دھرتے اور انہیں معاشرہ میں بدنام کرتے تھے۔ تو ایسے لوگ بھی قرآن کریم کے نزدیک مجرم اور مستوجب عذاب آخرت ہونے کے علاوہ اس دنیا میں بھی سزا کے مستحق ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں جیسا کہ ظاہر ہے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس شخص پر کوئی جھوٹی تہمت یا جھوٹا بہتان لگایا گیا تھا۔ نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ تہمت لگانے والے کون لوگ تھے اور کس کس نے تہمت لگانے کا یہ فعل شنیع

صواب دید کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ اس میں اسے کسی سزا کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ اس کی اپنی مقرر کردہ سزا کم سے کم قرآنی سزا سے متجاوز نہ ہو۔ لیکن اگر حالات کا یہ تقاضا ہو کہ زیادہ سزا دی جائے تو ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔

افسانۂ افک

جھوٹی تہمتیں دھرنا

قرآنی تعلیمات کی رو سے تہمت کی بڑی اہمیت ہے۔ تہمت ہر اس بُری بات کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف جھوٹ منسوب کر دی جائے تہمتیں صرف زنا کے متعلق ہی نہیں ہوتیں بلکہ اس کا میدان بڑا وسیع ہے، جو تہمتیں زنا کے متعلق لگائی جاتی ہیں وہ اپنی اہمیت الگ رکھتی ہیں ان کے لئے قرآن کریم نے وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں (یعنی جو پاک دامن عورتوں کو نشانۂ تہمت بناتے ہیں) اس کے لئے قرآن کریم نے باقاعدہ حد مقرر فرمائی ہے کہ جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کریں اور اس پر چار گواہ پیش نہ کر سکیں انہیں اسی کوڑے مارے جائیں۔ لیکن تہمت صرف ایک زنا ہی کی تو نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی تو بہت سی تہمتیں ہوتی ہیں اور اپنے وزن میں بعض مرتبہ زنا سے بھی زیادہ وزنی ہوتی ہیں۔ تو کیا قرآن کریم نے زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ کسی بھلے آدمی پر چوری

کی تہمت دھر دینا، شراب نوشی کا اتہام لگا دینا، رقص و سرود کی تہمت دھر دینا، بد دیانتی اور خیانت یا پبلک فنڈز میں خرد برد کی تہمتیں لگا دینا، کسی کے دین و ایمان میں نقص نکالنے کے لئے کسی کے عقیدہ میں کیڑے ڈالنا، مثلاً کسی کو وہابی مشہور کر دینا، کسی پر منکر سنت اور منکر رسالت کے خطابات چسپاں کر دینا، کسی پر جھوٹی روایتیں گڑھنے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف انہیں منسوب کرنے کی تہمتیں دھرنا۔ ہزار طرح کی جھوٹی تہمتیں ہوتی ہیں اور جو مسلمانوں کے معاشرہ میں عام ہیں بلکہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ طبقوں تک میں ان کی ذہنی عیاشیوں کا مشغلہ ہیں۔ کیا یہ ساری باتیں قرآن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ؕ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ ۚ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا ۙ وَّقَالُوْا هٰذَاۤ اِفْكٌ مُّبِیْنٌ ○

(۲۴/۱۱-۱۲)

ترجمہ:۔ یقیناً جو لوگ جھوٹی تہمت بنا کر لائے ہیں وہ تمہارا ہی ایک گروہ ہے۔ تم اسے اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہی ہوگا۔ ان میں سے ہر آدمی کیلئے

ہے۔ اسّی کوڑے جو حد قذف میں مارے جائیں گے ان میں وہ تمام قیود اسی طرح ملحوظ رکھنی چاہئیں جن کا ذکر زنا کی حد میں آچکا ہے۔ یعنی کوڑے جسم کے مختلف حصوں پر مارے جائیں کسی ایک جگہ پر نہ مارے جائیں۔ نیز چہرہ اور نازک اعضاء پر نہ مارے جائیں۔ ننگا کرکے نہ مارے جائیں۔ جو کپڑے وہ پہنے ہوئے ہے۔ وہ پہنے رہے۔ البتہ روئی بھرا ہوا کوئی کپڑا یا فر اگر وہ پہنے ہوئے ہو تو اسے البتہ اتروایا جاسکتا ہے۔

گالی گلوچ عام طور پر آپس کے لڑائی جھگڑے اور گالم گلوچ میں اس قسم کے الفاظ زبان سے نکل جاتے ہیں جن سے دوسروں پر زنا کی تہمت لگ جاتی ہے اور حد واجب ہو جاتی ہے۔ حالانکہ کہنے والے کا مقصد تہمت لگانا نہیں ہوتا۔ ایسی بے احتیاطیوں سے مکمل پرہیز لازمی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کو یہ کہہ دینا کہ تم اپنے باپ کی اولاد نہیں ہو۔ کسی کو نطفۂ بے تحقیق کہہ دینا۔ حرام زادہ یا حرامی کہہ دینا۔ زانیہ کی اولاد کہہ دینا۔ یہ تمام الفاظ تہمت کے الفاظ ہیں۔ ان سے قذف لازم آجاتا ہے اور جس شخص کے متعلق ایسا کہا گیا ہے۔ اگر وہ مطالبہ کرے تو حد واجب ہو جاتی ہے۔ بہرحال ایسی تمام گالیاں جن سے کسی کے والدین پر زنا کی تہمت کا مطلب نکلتا ہو، ان سے حد قذف واجب ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ شخص جسے گالی دی گئی ہے حد کا مطالبہ کرے۔

اختیار کیا تھا۔ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے جھوٹی تہمت دھری ہے وہ ایک گروہ اور ایک جماعت ہے جو تم ہی میں سے ہیں۔ ان میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو ان سب کا سرغنہ ہے۔ لیکن اس سرغنہ کا نام بھی نہیں بتایا گیا۔ بلکہ ایک عام قانون کے انداز میں ساری گفتگو چل رہی ہے۔ جس چیز کو قرآن کریم نے خود متعین نہیں فرمایا۔ ہمیں بھی اس کو متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآن کریم نے ہمیں جو ہدایت دی ہے ہم اس سے مناسب رہنمائی حاصل کریں۔ اور اس نے ہمیں جو قانون دیا ہے اسے اپنے معاشرہ میں جاری کریں۔ لیکن بُرا ہوا انسان کی کنج و کرید کے جذبہ کا کہ وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھتا بلکہ ہر بات کو کسی نہ کسی خاص واقعہ پر چسپاں کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب قرآن کریم سے اسے کوئی خاص واقعہ یا کسی خاص آدمی کا نام نہیں ملا تو اس نے وضع احادیث کی نت نئی ٹکسالوں سے رجوع کیا اور جھوٹے وضاعین نے اس ضمن میں جو خرافات گڑھی تھیں انہیں اپنی مستند ترین حدیث اور تفسیر کی کتابوں کی زینت بنا دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہرحال اس موضوع پر ہم آگے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈال رہے ہیں۔ فی الحال آپ اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے کسی خاص شخص کا نام نہیں لیا ہے۔

واضح رہے کہ زنا کی تہمت کے لئے قرآن کریم نے وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ وہ بات اور

اس کی سزا کا بیان (۲۴/۴-۵) میں ختم ہو چکا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ سے نیا سلسلۂ بیان شروع ہو رہا ہے۔ اور اس سے مراد تہمت زنا کا بیان نہیں ہے بلکہ زنا کے علاوہ دوسری تہمتیں مراد ہیں۔ یہ تہمتیں اخلاقی بھی ہو سکتی ہیں اور نظریاتی بھی ہو سکتی ہیں۔ اِفْكٌ کے معنے عربی زبان میں زنا کی تہمت لگانے کے نہیں ہیں۔ اَفَكَ یَأْفِكُ کے معنے جھوٹ بولنا۔ جھوٹی بات بنانا ہیں۔

(تاج العروس)

ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے معنے کسی چیز کو الٹ دینا۔ اس کی جہت سے پھیر دینا ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں عصائے موسوی کے متعلق ہے:۔

فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ ○ (۷/۱۱۷)

ترجمہ:۔ تو یکایک وہ ان تمام چیزوں کو نیست و نابود کر دیتا ہے (نگل لیتا ہے) جنہیں وہ (یعنی جادوگر) جھوٹ موٹ بناتے تھے۔

سورۂ شعراء میں ہے:۔

تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ (۲۶/۲۲۲)

ترجمہ:۔ وہ (یعنی شیاطین) ہر جھوٹے گناہگار پر نازل ہوتے ہیں۔

سورۃ الصّٰفّٰت میں ہے:۔

اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ (۳۷/۸۶)

ترجمہ:۔ کیا جھوٹ موٹ اللہ کے سوا دوسرے

معبودوں کا ارادہ کرتے ہو۔

سورۂ مائدہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کا ذکر فرما کر فرمایا گیا ہے۔

ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَكُوْنَ ○ (۵/۷۵)

ترجمہ:۔ پھر دیکھیئے وہ کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔

لہٰذا اِفْكٌ کے معنے جھوٹ اور گڑھی ہوئی بات کے ہیں۔ ایسی بات جو اصل میں کچھ ہو اور اسے الٹ کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے اِفْكٌ کہلاتی ہے۔ اس آیت کریمہ میں، یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ کسی پر زنا کے علاوہ اور کسی بات کی جھوٹی تہمت لگائیں وہ بھی مجرم ہیں۔ اس قسم کے اتہامات سے بلاشبہ تمہیں اذیت پہنچتی ہے لیکن اس میں بھی انجام کے لحاظ سے تمہارے لئے کوئی خیر کا پہلو نکل سکتا ہے۔ لہٰذا تم اسے اپنے لئے شر نہیں بلکہ خیر کا باعث ہی سمجھو۔ لیکن جو لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے جس کا اس میں جتنا حصہ ہوگا اسے اتنا ہی عذاب ملے گا۔ اور جو شخص اس قسم کے کسی بہتان کا ذمہ دار ہوگا۔ اسے بہت بڑا عذاب ملے گا۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کو چاہیئے کہ جب وہ اس قسم کے بہتان سنیں تو اپنے معاشرہ کے افراد کے متعلق حسن ظن ہی سے کام لیں اور صاف کہہ دیں کہ یہ تو کھلا جھوٹ ہے۔ ہم اس پر کان دھرنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ اگر اس قسم کا کوئی بہتان لگاتے ہیں تو وہ اس پر چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ اگر وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے

تو اس کے معنے یہ ہیں کہ خود وہ بہتان لگانے والے ہی جھوٹے ہیں۔ چنانچہ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اے مسلمانو! اگر تم پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو آپس میں اس قسم کی بہتان طرازیوں کی وجہ سے تم سخت عذاب میں مبتلا ہو جاتے۔ جبکہ تم اس قسم کی تہمتوں کو مزے لے کر اور زبانیں مروڑ مروڑ کر بیان کرتے ہو اور اپنے منہ سے وہ باتیں نکالتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ کیا تم اس قسم کی اتہام طرازیوں کو ایک معمولی بات سمجھتے ہو؟ ہرگز نہیں۔ خدا کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم ہے۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جب اس قسم کے اتہامات کو سنو تو صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے لئے جائز نہیں ہے کہ ہم ایسی باتیں منہ سے نکالیں۔ سبحان اللہ! بغیر تحقیق کے کسی پر الزام لگانا تو بہت بڑا بہتان ہے خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی بہتان طرازیوں میں کوئی حصہ نہ لو۔ اگر تم اہل ایمان ہو تو اس سے ہمیشہ بچتے رہو۔

بہرحال زنا کی تہمت میں جیسا کہ تہمت لگانے والے کو چار گواہ اپنی شہادت میں پیش کرنے پڑتے ہیں ایسے ہی تہمت زنا کے علاوہ دوسری تمام تہمتوں میں بھی اپنی صداقت کے لئے چار گواہ پیش کرنے ہوں گے۔ تہمت ہر حال میں تہمت ہے زنا کی تہمت ہو یا غیر زنا کی۔ اگر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکے تو اس کو جھوٹا سمجھا جائے گا۔ اور قرآن کریم نے اگرچہ اس کے لئے کوئی متعین حد مقرر نہیں فرمائی ہے مگر حاکم مجاز کو چاہیئے کہ اگر وہ

شخص جس پر کوئی تہمت لگائی گئی ہے فریاد کرے تو تہمت لگانے والے پر تعزیر جاری کی جائے۔ یہ تعزیر اسی تفصیل کے ساتھ ہوگی جس طرح گالی دینے کے معاملہ میں ہم تفصیل سے کتاب الحدود میں ذکر کر چکے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک کم سے کم تین اور زیادہ سے زیادہ انتالیس کوڑے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ پچھتر کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ اور ہم نے اپنی رائے یہ لکھی تھی کہ حاکم مجاز کو کسی خاص تعداد کا پابند نہ کیا جائے بلکہ حالات کے تقاضے کے مطابق اسے فیصلہ کرنا چاہیئے۔ البتہ بہتر یہی ہے کہ اس کی تعزیر اسی کوڑے سے زیادہ نہ ہو جو ایک شرعی حد ہے اور قرآن کریم سے ثابت ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھانا کہ چونکہ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی جھوٹی تہمت کے سلسلہ میں چار گواہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ جب وہ چار گواہ پیش نہیں کرتے تو وہ خود ہی جھوٹے ہیں۔ اور چار گواہ زنا کی تہمت ہی میں ضروری ہوتے ہیں۔ ورنہ عام معاملات میں چار گواہ ضروری نہیں ہوتے بلکہ دو گواہ کافی ہوتے ہیں۔ اس لئے لازماً ان آیات کا تعلق بھی زنا ہی کی تہمت سے ہونا چاہیئے، ایک ادعائے محض ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ چار گواہوں کی شرط صرف زنا کی تہمت ہی میں ہو سکتی ہے۔ اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم سے

زنا کی تہمت میں چار گواہوں کی شرط ثابت ہونے سے یہ بات کیسے ثابت ہوگئی کہ کسی اور تہمت میں چار گواہوں کی شرط لگانا ممنوع ہے۔ اور قرآن کریم نے اس سے منع فرمادیا ہے۔ ہمارے خیال میں تہمت کے سلسلہ میں خواہ وہ زنا سے متعلق ہو یا غیر زنا سے متعلق ہو چار گواہوں کی شرط ضروری ہے۔ زنا کی تہمت میں چار گواہوں کی شرط کا بیان پہلے آچکا ہے اور غیر زنا کی صورت میں ان آیات میں دوسری مرتبہ آرہا ہے۔

شانِ نزول کی روایات

اب ہم ان آیات کی اس تفسیر سے بحث کرتے ہیں جو شان نزول کی روایات کے باعث ہماری تفسیروں اور کتب احادیث میں نہایت اہمیت حاصل کر گئی ہیں۔ حالانکہ شانِ نزول کی روایات کی وہ اہمیت ہرگز نہیں ہوتی جو ان کو دے دی گئی ہے۔ اصولِ تفسیر میں یہ بات علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ:

العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد۔

ترجمہ:۔ الفاظ کی عمومیت کا اعتبار ہے۔ کسی خصوصی شان نزول کا اعتبار نہیں ہے۔

قرآن کریم ایک ضابطۂ ہدایت ہے۔ اس میں امت مسلمہ کی عام مصالح کے لئے قوانین دیئے گئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیسے سمجھ لیا گیا ہے کہ جب کوئی خاص واقعہ ہی پیش آجائے تو قرآن کی آیات نازل ہوتی ہیں۔ خاص واقعہ کے بغیر کوئی آیت نازل ہی نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کہ قرآن کریم کی ہر آیت کو

اس کے شان نزول کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ یہ بات اصولی طور پر غلط ہے۔ قوانین کبھی بھی واقعات کے پابند نہیں ہوتے۔

شان نزول کی روایت

لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں تفصیل کے ساتھ ایک روایت بیان ہوئی ہے جس کو صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشہؓ وام رومان وکتاب التفسیر وکتاب الشہادات وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ اور صحیح مسلم کتاب التوبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ حدیث یوں شروع ہوتی ہے۔ ہم سے یحییٰ ابن بکیر نے حدیث بیان کی کہ ہم سے لیث نے یونس سے حدیث بیان کی انہوں نے ابن شہاب سے کہا کہ مجھے عروہ ابن زبیرؓ نے اور سعید ابن المسیب نے اور علقمہ ابن وقاص نے اور عبید اللہ ابن عبد اللہ ابن عتبہ ابن مسعود نے عائشہؓ زوجۂ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے متعلق خبر دی جب ان کے بارہ میں اہل افک نے کہا جو کچھ کہا اور اللہ نے اُنہیں اس سے بری قرار دیا جو کچھ انہوں نے کہا تھا۔ ہر ایک نے حدیث کا ایک ٹکڑا بیان کیا ہے اور حدیث کا کچھ حصہ دوسرے لوگوں کی حدیث کی تصدیق کرتا ہے اگرچہ ان میں سے بعض نے حدیث کو دوسرے بعض سے زیادہ محفوظ رکھا ہے۔ بہر حال جو کچھ مجھ سے عروہ نے حضرت عائشہ سے بیان کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالتے

تھے۔ جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہؓ صدیقہ کا نام نکلا۔ حضرت عائشہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ کیونکہ پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا لہٰذا (کچھ آدمی) اُنہیں ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اُتارتے تھے۔ جب لڑائی ختم ہوگئی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم واپس مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ مدینہ کے قریب آپ نے ایک مقام پر نزول کیا۔ وہاں سے رات کے وقت آپ نے کوچ کا حکم صادر فرمایا۔ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو کوچ کا علم ہوا تو وہ قضائے حاجت کے لئے روانہ ہوئیں اور اسلامی لشکر سے کافی دور چلی گئیں۔ قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ اپنی سواری کے قریب پہنچیں تو انہوں نے اپنے سینہ پر ہاتھ پھیرا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ان کا ہار جو یمنی خزف کا بنا ہوا تھا غائب ہے۔ وہ سمجھیں کہ کہیں ٹوٹ کر گر گیا ہے۔ لہٰذا اسکو تلاش کرنے کے لئے وہ واپس اسی جگہ گئیں جہاں انہوں نے قضائے حاجت کی تھی۔ انہوں نے ہار تلاش کیا۔ تلاش کرتے کرتے انہیں کافی دیر ہوگئی۔ اسی اثنا میں اسلامی فوج اس منزل سے روانہ ہوگئی۔ اس زمانہ میں عورتیں بہت کم کھانا کھاتی تھیں۔ ان پر گوشت بہت کم ہوتا تھا۔ لہٰذا ہلکی پھلکی ہوتی تھیں۔ مزید برآں حضرت عائشہ ایک کم سن لڑکی تھیں۔ لہٰذا بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ ان لوگوں نے جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ہودج چڑھاتے

اتارتے تھے ہودج اٹھاتے وقت اس کو ہلکا نہ جانا۔ وہ یہ سمجھے کہ حضرت عائشہؓ اس میں موجود ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ہودج اونٹ پر رکھ دیا۔ اور اونٹ کو لے کر روانہ ہوگئے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ کو وہ ہار اسلامی لشکر کے روانہ ہونے کے بعد ملا۔ ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اس خیال سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہوگا تو اُنہیں ڈھونڈنے اسی جگہ آئیں گے۔ کچھ دیر بعد انہیں نیند آئی اور وہ سو گئیں۔

حضرت صفوان بن معطل سلمیؓ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہوگئے اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے۔ کیوں کہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ لہٰذا دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ کو پہچان گئے۔ اور کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی اور نہ حضرت عائشہؓ نے سوائے استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی۔ حضرت صفوان اپنے اونٹ سے اترے۔ پھر اس کو بٹھا کر اس کے ہاتھ پیر باندھے۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار ہوگئیں۔ حضرت صفوانؓ اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چلتے رہے۔ یہاں تک کہ دوپہر کے وقت جبکہ سخت گرمی پڑ رہی تھی اسلامی لشکر سے

جا ملے۔ مسلمان وہاں ایک جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔

اسلامی لشکر مدینہ منورہ پہنچا۔ مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہو گئیں۔ بیماری نے طول کھینچا یہاں تک کہ ایک مہینہ گذر گیا۔ اس عرصہ میں عبداللہ ابن ابی اپنی مجالس میں اس تہمت کا ذکر کرتا۔ دوسرے منافقین بھی اس کی مجلس میں بیٹھ کر یہی تذکرہ کرتے اور وہ سنتا رہتا۔ غرضیکہ یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی۔ اس نے سنتے ہی فوراً کہا۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے۔ منافقین کے علاوہ مؤمنین میں سے بھی تین آدمی اس بہتان میں شریک ہو گئے۔ یعنی حضرت حسان ابن ثابتؓ مسطح ابن اثاثہؓ اور حمنہ بنت جحشؓ۔ لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کا اب تک علم نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی بیماری میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا (کہ غالباً رسول اللہ صلے

اللہ علیہ وسلم کچھ خفا ہیں) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لاتے، سلام کرتے اور یہ پوچھتے "تم کیسی ہو؟" پھر واپس چلے جاتے۔ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا۔ (وہ نہ سمجھ سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟)

جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بیماری سے افاقہ ہوا۔ تو وہ ایک رات کو قضائے حاجت کے لئے نکلیں۔ گھروں میں اس وقت تک بیت الخلاء نہیں بنائے گئے تھے۔ عورتیں صرف رات کے وقت قضائے حاجت کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آ رہا تھا۔ گھروں کے پاس بیت الخلاء بنانے سے انہیں تکلیف ہوتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی قضائے حاجت کے لئے نکلیں۔ حضرت ام مسطحؓ ابو رہم بن عبدالمطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھیں۔ ان کی والدہ جو ضحر ابن عامر کی بیٹی تھیں حضرت ابوبکرؓ کی خالہ تھیں۔ حضرت ام مسطحؓ کے شوہر کا نام اثاثہ ابن عباد ابن عبدالمطلب تھا۔ ان کے بیٹے کا نام مسطحؓ تھا۔ اسی بیٹے کے نام پر ان کی کنیت ام مسطحؓ تھی۔ قضائے حاجت کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ام مسطحؓ واپس روانہ ہوئیں۔ راستہ میں حضرت ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا۔ وہ کہنے لگیں "مسطح ہلاک ہو" حضرت عائشہؓ نے فرمایا "تم بری بات کہہ رہی ہو۔ وہ تو بدری صحابی ہے۔" انہوں نے کہا "اری دیوانی!

کیا تو نے نہیں سنا کہ مسطح رضؓ نے کیا کہا ہے۔" حضرت عائشہ رضؓ نے پوچھا۔" مسطح رضؓ نے کیا کہا ہے۔" حضرت ام مسطح رضؓ نے تہمت کا سارا حال سنایا۔ یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی بیماری بڑھنی شروع ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے سلام کیا پھر پوچھا۔" تم کیسی ہو؟" حضرت عائشہ رضؓ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت مانگی تاکہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی اور ایک لڑکا ان کے ساتھ کر دیا۔

حضرت عائشہ رضؓ اپنے والدین کے ہاں پہنچیں۔ اپنی والدہ حضرت ام رومان رضؓ سے پوچھا کہ لوگ (میرے متعلق) کیا کہہ رہے ہیں۔ حضرت ام رومان رضؓ نے جواب دیا۔ اے بیٹی! گھبراؤ نہیں۔ ایسی عورتیں بہت کم ہیں جو خوبصورت ہوں، محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں۔ پھر ان کی سوکنیں بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے کہا۔" سبحان اللہ! کیا لوگ واقعی یہ بات کہہ رہے ہیں۔" اتنے میں ایک انصاری عورت آئی اور کہنے لگی۔ اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی کرے۔ حضرت ام رومان رضؓ نے کہا۔" تم نے یہ کیا بات کہی۔" اس نے کہا کہ میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے۔" حضرت ام رومان رضؓ نے پوچھا۔" آخر کیا قصہ ہے؟" (اس کی کیا تفصیل ہے؟) اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا۔ جب وہ بیان کر چکی تو حضرت عائشہ رضؓ

صدیقہ نے پوچھا۔" کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات سنی ہے؟" اس نے کہا۔" ہاں" حضرت عائشہ رضؓ نے پوچھا۔" کیا ابوبکر رضؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟" اس نے کہا۔" ہاں۔" یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ بے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں۔ ہوش آیا تو لرزہ کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ حضرت ام رومان رضؓ نے ان پر رضائی وغیرہ ڈال دی اور انہیں اچھی طرح اس میں چھپا دیا۔ اسی اثناء میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ نے پوچھا۔" ان کا کیا حال ہے؟" حضرت ام رومان رضؓ نے کہا انہیں سخت لرزہ کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آ گیا ہے؟" حضرت ام رومان رضؓ نے کہا۔" ہاں" حضرت ام رومان کہتی ہیں۔ پھر آپ چلے گئے اور مجھے کوئی جواب نہ دیا۔

(جب بخار سے ذرا افاقہ ہوا۔ تو) حضرت عائشہ رضؓ رونے لگیں۔ رات بھر روتی رہیں۔ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ روتے روتے صبح ہو گئی۔ حضرت صفوان رضؓ کو جب اس تہمت کا علم ہوا تو کہنے لگے اللہ کی قسم میں کبھی کسی عورت کے پاس نہیں گیا۔

اس واقعہ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بھی بہت پریشان تھے۔ (لوگوں کا منہ بند کرنے کی خاطر) آپ نے حضرت عائشہ رضؓ کے چال چلن کے متعلق تحقیقات شروع کی۔ پہلے آپ نے اپنی بیوی حضرت زینب رضؓ سے دریافت کیا۔ حضرت زینب رضؓ نے کہا۔" اے اللہ کے رسول! میں اپنی آنکھ اور کانوں کو بچاتی

ہوں۔ (میں نے ان میں نہ کوئی برائی دیکھی نہ سنی) اللہ کی قسم میں بجز بھلائی کے کچھ نہیں جانتی۔" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تمام بیویوں میں صرف زینبؓ میری برابری کی مدعی تھیں۔ لیکن ان کے زہد و تقویٰ نے انہیں (میری برائی کرنے سے) بچا لیا۔ باوجود اس کے کہ ان کی بہن (حمنہؓ بنت جحش) تہمت لگانے والوں میں شامل تھیں۔ (لیکن انہوں نے اپنی بہن کی بات کو صحیح نہ سمجھا) حمنہؓ حضرت زینبؓ سے جھگڑنے لگیں اور ہلاک ہونے والی جماعت میں شامل ہو کر وہ بھی ہلاک ہوئیں۔ (یعنی تہمت لگا کر گناہ کا ارتکاب کیا اور سزا پائی)

پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی ابن ابی طالبؓ اور اسامہ ابن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا۔" وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے) آپ بدستور انہیں اپنے پاس ہی رکھیئے۔ ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے معاملہ میں سلامت رہے (کسی قسم کا شبہ نہیں کیا) البتہ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غم غلط کرنے کے لئے) یہ عرض کیا۔" اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائیں گی۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔" کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟" حضرت بریرہؓ نے کہا" اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں وہ تو اتنی (بھولی) کمسن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں۔ پلی ہوئی بکری آ کر اسے کھا جاتی ہے۔" ایک شخص نے (دوسری روایات میں ہے کہ یہ حضرت علیؓ تھے۔ مترجم) انہیں دھمکا کر کہا کہ" سچ سچ بیان کرو" حضرت بریرہؓ نے کہا" سبحان اللہ! میں تو عائشہؓ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سرخ سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے۔"

اسی دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لے گئے آپ نے فرمایا۔ کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا۔ اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں کوئی اور گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔ یہ سن کر بنو عبد اشہل کے بھائی حضرت سعد بن معاذؓ کھڑے ہوئے اور کہا" یا رسول اللہ میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں

گے "یہ سن کر قبیلۂ خزرج کے سردار حضرت سعدؓ ابن عبادہ کھڑے ہوئے (یہ وہی سعد بن عبادہؓ ہیں جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ یہ صدیق اکبرؓ کے مقابلے میں خلافت کے مدعی تھے اور یہ کہ انہوں نے صدیق اکبرؓ سے بیعت بھی نہیں کی۔ مترجم) یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے۔ قومی حمیت اور غرور نے انہیں اُبھارا۔ کہنے لگے "تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔" یہ سن کر حضرت اسید ابن حضیرؓ کھڑے ہوئے۔ یہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ سے کہا "تم جھوٹے ہو۔ اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے جھگڑتے ہو" اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلے اتنا بھڑکے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابھی ممبر پر ہی تھے۔ آپ ان کو چپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔

ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا اس دن بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ مسلسل روتی رہیں۔ نہ آنسو تھمتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ دوسری رات بھی اسی طرح گذر گئی۔ ان کے والدین نے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے صبح کر دی۔ حضرت عائشہؓ کو روتے ہوئے اب دو راتیں اور ایک دن ہو گیا تھا۔ اس عرصہ میں نہ

ان کے آنسو تھمے نہ ان کی آنکھ لگی۔ وہ اور ان کے والدین ڈر رہے تھے کہ ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ ان کی والدہ بھی ان کے پاس بیٹھی ہوئی رو رہی تھیں۔ اسی اثناء میں ایک انصاری عورت نے اندر آنے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے اجازت دی۔ وہ عورت اندر آ کر بیٹھ گئی۔ اور ان کے ساتھ وہ بھی رونے لگی۔ یہ لوگ اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سلام کر کے حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھ گئے۔ تہمت کے بعد اس دن پہلی مرتبہ آپ حضرت عائشہؓ کے پاس بیٹھے۔ ایک مہینہ تک مسلسل آپ نے حضرت عائشہؓ کے معاملہ میں وحی کا انتظار کیا۔ لیکن ابھی تک وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بیٹھتے وقت کلمۂ شہادت پڑھا پھر حمد و تشہد کے بعد فرمایا "اے عائشہؓ تمہارے متعلق ایسی ایسی خبر سننے میں آئی ہے۔ اگر تم بری ہو تو اللہ عنقریب تمہاری بریت کی خبر دیدے گا۔ اور اگر تم سے گناہ ہو گیا تو اللہ سے اپنی بخشش کی دعا کرو۔ اس کی طرف رجوع کرو۔ کیونکہ بندہ جب گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔"

اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ حضرت عائشہؓ بری ہیں جیسا کہ آپ خطبہ میں فرما چکے تھے تاہم آپ نے یہ کلمات صرف اس لئے کہے کہ ساری امت کے لئے نصیحت و موعظت کا کام دیں۔ اپنے یقین کی بنیاد پر نہ آپ نے بریت کا اعلان فرمایا

نہ مجرموں کو سزا دی تاکہ کسی شخص کو بدظنی کا موقعہ نہ ملے۔

جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے والد حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ آپ میری طرف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جواب دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ یہ جواب سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نو عمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے کہا۔ "اللہ کی قسم میں جانتی ہوں کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں جم گئی ہے۔ اور تم نے اسے مان بھی لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ میں بری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے۔ اور اگر میں تم سے اس امر کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی مثال یوسف (علیہ السلام) کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں جبکہ انہوں نے یہ کہا تھا "فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ" میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی ہوں۔ اور جو کچھ

لوگ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ہی میرا مددگار ہے۔

یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں وہ فرماتی ہیں کہ اللہ کو علم تھا کہ میں بری ہوں (لہٰذا مجھے امید تھی کہ) اللہ ضرور میری بریت بیان کرے گا۔ لیکن اللہ کی قسم میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ میری شان میں ایسی وحی نازل کرے گا جس کی تلاوت کی جائے گی۔ میں اپنی دانست میں اپنی شان کو اتنا بلند نہیں سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ میرے معاملہ میں کلام فرمائے گا۔ مجھے تو بس یہ امید تھی کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں میرا بری ہونا ظاہر کر دے گا۔ اللہ کی قسم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابھی اپنی جگہ سے اُٹھنے بھی نہ پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی اور جو شدت آپ پر بوقت نزول وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہو گئی۔ سردی کا دن ہونے کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر سے وہ شدت دور ہوئی۔ آپ ہنستے ہوئے اٹھے اور فرمایا۔ اے عائشہؓ اللہ کا شکر ادا کرو۔ اللہ بزرگ و برتر نے تمہیں بری کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ ------

---- الی آخر الآیات۔

ان آیات کے سننے کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ مطہرہؓ کی

والدہ ماجدہ نے حضرت عائشہ مطہرہؓ سے کہا کہ اٹھو اور کھڑی ہو کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا شکریہ ادا کرو۔" حضرت عائشہ صدیقہ طاہرہ و مطہرہ نے جواب دیا "اللہ کی قسم میں کسی کی طرف اُٹھ کر نہ جاؤں گی اور نہ اللہ کے سوا کسی کا شکر ادا کروں گی۔

(صحیح بخاری کتاب المغازی باب حدیث الافک عن عائشہؓ وام رومانؓ وکتاب التفسیر وکتاب الشہادات وکتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ وصحیح مسلم کتاب التوبہ)

(خط کشیدہ الفاظ صرف صحیح مسلم میں ہیں۔ کثرت گریہ سے جگر پھٹنے کا اندیشہ حضرت عائشہؓ کو ہوا یہ صرف صحیح بخاری میں ہے۔ اور یہی اندیشہ ان کے والدین کو ہوا یہ صرف صحیح مسلم میں ہے۔ انصاری کے الفاظ "یہ بہتان عظیم ہے ۔۔۔۔۔" یہ صرف صحیح بخاری کتاب الاعتصام میں ہیں۔)

تنقید حدیث

یہ حدیث جیسا کہ حوالہ سے ظاہر ہے صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں آگئی ہے۔ لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے پورے پورے احترام کے باوجود ہمیں بہت افسوس ہے یہ حدیث ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ سب سے پہلی بات جو اس حدیث کے خلاف جاتی ہے وہ اس حدیث کی یہ بنیادی بات ہے کہ اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی بیویوں میں قرعہ ڈالا کرتے تھے جس کے نام کا قرعہ نکلتا اسے آپ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ جنگ بنی مصطلق کو جاتے

وقت جب قرعہ ڈالا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام نکلا۔ ہمارے نزدیک قرعہ اندازی سے فیصلے کرنا ہی قرآن کریم کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ قرآن کریم کے سراسر خلاف قرعہ اندازی فرماتے ہوں اور اس طرح فیصلے فرماتے ہوں گے۔

سورۂ مائدہ میں ہے:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ (۵/۳)

ترجمہ:۔ (اے پیروانِ دعوتِ ایمانی!) تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھونٹنے سے مر گیا ہو اور جو چوٹ لگنے سے مر گیا ہو اور جو اوپر سے گر کر اور سینگ لگ کر مر گیا ہو اور جسے کسی درندہ نے پھاڑ کھایا ہو البتہ جسے تم نے ذبح کر لیا ہو وہ حلال ہے۔ ایسے ہی وہ جانور جو بتوں کے استھانوں پر ذبح کئے گئے ہوں، اور یہ بھی حرام ہے کہ تم گوشت یا کوئی اور چیز، آپس میں پانسہ کے تیروں سے تقسیم کرو۔ یہ تمہارے لئے سخت گناہ کا باعث اور فسق ہے۔

نیز سورۃ مائدہ ہی میں ذرا آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَ
الْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ
فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (۵/۹۰)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! حقیقت یہی ہے کہ شراب اور جُوا اور بُت اور پانسہ کے تیر ناپاک شیطانی عمل ہیں۔ سو ان سے بچتے رہو تاکہ تم فلاح پاسکو۔

ان دونوں آیات کریمہ میں معاملات کے فیصلے پانسہ کے تیروں (الازلام) کے ذریعہ سے کرنے کو منع فرمایا گیا ہے۔ آیت نمبر (۵/۳) میں تو بات حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ کے الفاظ سے شروع فرمائی گئی ہے اور آخر میں ذٰلِکُمْ فِسْقٌ سے بتادیا گیا ہے کہ یہ فعل حرام ہے اور سخت گناہ اور حق تعالیٰ کی انتہائی ناراضگی کا باعث ہے اور آیت نمبر (۵/۹۰) میں رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فرماکر کہ یہ گندی چیزیں اور شیطانی اعمال ہیں لہٰذا فَاجْتَنِبُوْہُ ان سے احتراز کرنے اور الگ رہنے کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اَلْاَزْلَامُ چیز کیا ہے جس سے اس قدر تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی جارہی ہے۔ تو اَلزَّلَمُ تیر کی اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے پچھلے سرے پر پَر نہ لگائے گئے ہوں۔ جمع اَزْلَامٌ، ابن فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنے دُبلا پتلا اور سپاٹ

یعنی ہموار اور چکنا ہونے کے ہیں۔ پھر اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر تھے جن سے قریش زمانۂ جاہلیت میں فال نکالتے یا قرعہ ڈالتے تھے۔ تفصیل یہ ہے کہ تین مذکورہ بالا قسم کے تیر بھتیلے میں ڈال دیئے جاتے۔ ان میں سے ایک تیر پر اِفْعَلْ (کر) دوسرے پر لَاتَفْعَلْ (نہ کر) لکھدیتے اور تیسرا خالی رہنے دیتے۔ جب کوئی شخص کسی معاملہ کا ارادہ کرتا تو وہ کعبہ کے پجاریوں کے پاس آتا اور ان سے کہتا کہ میرے لئے یہ کام کرنے یا نہ کرنے کے بارہ میں فال نکالو۔ چنانچہ وہ اپنے قاعدہ کے مطابق تیر نکالتے اور تیر کی تحریر کے مطابق فال دیکھ کر اسے بتادیتے۔ اگر خالی تیر آتا تو دوبارہ فال نکالتے۔ بعض لوگ خود بھی اپنے پاس اس قسم کے تیر رکھتے اور جہاں ضرورت پڑتی ان سے فال نکال لیتے۔ (تاج العروس و محیط المحیط)

اسی قسم کے تیروں سے قرعہ اندازی بھی ہوتی اور (جوئے کے) جانوروں کا گوشت تقسیم کیا جاتا تھا (۵/۳) قرآن کریم نے ان سب باتوں سے منع فرمادیا۔ اس لئے کہ اس سے انسان اپنے اختیار کو چھوڑ کر جبر کا راستہ اختیار کرلیتا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی فہم و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرے اپنے آپ کو اتفاقات (CHANCES) کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے وہ مقام انسانیت سے گر جاتا ہے۔ قرآن کریم انسان کی عقل و بصیرت کی تربیت کرتا اور اسے حریت و آزادی کی تعلیم دیتا ہے اس لئے اس نے ان تمام باتوں سے منع کردیا

ہے جس سے اس کی عقل و خرد دب جائے اور حریت فکر و نظر سلب ہو جائے وہ انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے کہ وہ حدود اللہ یعنی قوانین خداوندی اور ہدایاتِ قرآنی کے اندر رہتے ہوئے اپنے انفرادی اور اجتماعی امور کے فیصلے اپنی عقل و فکر سے کرے۔ یہ بھی قرآن کریم کی تعلیم۔ حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

"بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لئے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار یعنی جوئے کی تھی جیسے آج کل چٹھی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر اَمَرَنِیْ رَبِّیْ لکھا تھا (میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے) کسی پر نَھَانِیْ رَبِّیْ تحریر تھا (میرے رب نے مجھے منع کر دیا) اسی طرح ہر تیر پر یونہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال کر دیکھ لئے۔ اگر امرنی ربی والا تیر نکل آیا

تو کام شروع کر دیا اور اس کے خلاف نکلا تو رک گئے۔ علیٰ ہذا القیاس گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کا مبنی خالص جہل شرک، اوہام پرستی اور افتراء علی اللہ پر تھا اس لئے قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ اور تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے۔

(قرآن کریم ترجمہ حضرت شیخ الہند و تفسیر حضرت عثمانی ص۱۳۸)

یعنی اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر نہیں ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں ذبیحہ کا گوشت تقسیم کرنے کے لئے استعمال ہوتے تھے کیونکہ وہ تو قمار یعنی جوئے کی ایک شکل تھی اور اس کے متعلق آیت کریمہ میں اَلْمَیْسِرُ کا لفظ آ رہا ہے۔ لہٰذا اَزْلَامٌ سے بھی اسی کو مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ اس لئے علامہ ابن کثیرؒ وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ اَزْلَامٌ سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یعنی وہ عقل و بصیرت سے غور و فکر کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے کے بجائے اَزْلَامٌ کا آسان راستہ اختیار کر لیتے تھے جو کچھ تیروں سے نکل آیا اسی کو اختیار کر لیا۔ یہ طریقہ بہت آسان تھا۔ غور و فکر اور عقل و بصیرت سے کسی بات کا فیصلہ کرنا تن آسانوں کے لئے بڑا وقت طلب اور بڑی محنت کی بات تھی اس لئے لوگوں نے اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

یاد رکھیئے انسان کے کام اور اس کے اعمال کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اہمیت دراصل اس نظریہ اور تصور کی ہوتی ہے جو کسی عمل کی پشت پر کارفرما ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس ذہنیت کے ماتحت فلاں شخص فلاں کام کر رہا ہے۔ ایک ذہنیت تو یہ ہوتی ہے کہ آدمی کسی کام پر عقلی طور پر مطمئن ہونے کے بعد ہی اقدام کرتا ہے۔ وہ تقلیدی طور پر یا کسی اتفاقی حادثہ سے متاثر ہو کر کسی قسم کا کوئی عملی قدم نہیں اُٹھاتا وہ ہر بات کو جانچ پرکھ کر، ناپ تول کر، اس کے فوائد اور مضرتوں کو عقل و بصیرت کی ہدایت و رہنمائی سے سمجھ کر ہی اختیار کرتا ہے۔ درحقیقت یہ ذہنیت مشکل پسند اور صبر آزما ہوتی ہے۔ دوسری ذہنیت اس کے برخلاف تن آسانی اور سہل پسندی کی ہوتی ہے کہ آدمی غور و فکر سے کام لینا پسند نہیں کرتا بلکہ غور و فکر کرنے کے بجائے یہ دیکھتا ہے کہ اب تک کیا ہوتا آرہا ہے۔ باپ دادا سے جو کچھ ہوتا آرہا ہے آنکھیں بند کر کے اسی کی پیروی کرتا چلا جا رہا ہے۔ یا اگر کہیں ٹھٹک کر کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑ گیا تو فال، نچھتر، قرعہ وغیرہ کا سہارا لے لیتا ہے کہ ترکش سے تیر نکالے یا دیوانِ حافظ اور مثنوی مولانا روم کا کوئی صفحہ کھول لیا اور پڑھ لیا کہ کیا لکھا ہے یا چند پڑیوں کو بند کر کے ڈال دیا اور ان میں سے ایک پڑیا اُٹھالی، کھول کر دیکھ لیا کہ کیا لکھا ہوا ہے۔ جو کچھ لکھا ہوا نکلا اسی کے مطابق عمل کر لیا۔ غور و فکر کرنے، موافق و مخالف نکات پر سوچنے سمجھنے کی زحمت

سے بچ گئے یہ دوسری روش زندگی ان لوگوں کی ہوتی ہے جو تن آسان اور سہل پسند واقع ہوئے ہوں۔ اسلام چاہتا ہے کہ آدمی جو کچھ بھی کرے وہ خوب سوچ سمجھ کر، مفادات اور مضرتوں کو خوب ناپ تول کر، موافق اور مخالف نکات پر خوب غور و فکر کر کے اختیار کرے۔ کوئی کام تقلیداً یا اندھا دُھند اتفاقات سے متاثر ہو کر نہ کر لے۔ حق تعالیٰ نے انسان کو با اختیار اور صاحب ارادہ بنا کر پیدا کیا ہے وہ یہی مطالبہ کرتا ہے کہ اپنے اختیار و ارادہ سے کام لو اور خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ تمہیں کسی قسم کے جبر کا شکار نہیں ہونا چاہیئے۔ وہ احکامِ خداوندی اور آیاتِ الٰہی کی پیروی بھی اندھا دھند نہیں کرانا چاہتا۔ وہ اللہ کے نیک بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ○ (۲۵/۷۳)

ترجمہ:۔ وہ اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب اُنہیں ان کے پروردگار کی آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان آیتوں پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

وہ ہر بات میں علم و بصیرت کی پیروی کرنے اور سوچ سمجھ کر عملی قدم اُٹھانے کی تاکید فرماتا ہے:۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ

وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ○

(۱۷/۳۶)

ترجمہ :۔ اور اس بات کی ہرگز پیروی نہ کر جس کا تجھے کوئی علم نہیں ہے۔ یقیناً کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کی بابت اس شخص سے باز پرس کی جائے گی۔

کہ تم نے فلاں قدم اُٹھاتے ہوئے آنکھ، کان اور دل سے دیکھ، سن اور سمجھ بھی لیا تھا یا یوں ہی اندھا دھند قدم اُٹھا لیا تھا۔ اس کی تو دعوت ہی یہ ہے کہ :۔

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ أَنْ تَقُومُوا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا ۚ (۳۴/۴۶)

ترجمہ :۔ (اے پیغمبر اسلام!) آپ کہہ دیجئے کہ میں تو تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ دو دو ایک ایک ہو کر اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ پھر ذرا سوچ سمجھ لو۔

علم و یقین کے بہت بڑے ذرائع سمع و بصر اور فؤاد ہی ہیں آدمی بے شمار باتوں کا علم خود دیکھ کر، لوگوں سے سُن کر اور عقل و بصیرت سے غور و فکر کر کے ہی حاصل کرتا ہے اور قرآن کریم نے انسان کی ان تینوں قوتوں کو جا بجا بڑی ہی اہمیت دی ہے۔ سورۂ مؤمنون میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ○ (۲۳/۷۸)

ترجمہ :۔ اور اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل پیدا کئے ہیں۔ اُف! تم کس قدر کم شکر گذاری کرتے ہو۔

بہر حال قرآنی تعلیمات کے مطابق ایک مسلمان کا جو نقشہ ہونا چاہیئے وہ ان آیاتِ کریمہ اور ان جیسی دیگر سینکڑوں آیات کریمہ کے آئینہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے جس میں تفکر و تدبر، تفقہ اور تعقل پر زور دیا گیا ہے۔ اس نقشہ کو ذہن میں رکھیئے اور پھر ان شبیہوں کو ذہن میں لائیے جو دیوان حافظ۔ مثنوی مولانا روم کھولے بیٹھے ہیں یا چند پرچیوں پر کچھ نام لکھ کر لوٹا گھما رہے ہیں یا قرعے نکال رہے ہیں اور ایمان داری کے ساتھ بتائیے کہ یہ تصویریں اس قرآنی نقشہ پر ذرا بھی فٹ بیٹھتی ہیں جو قرآن کریم نے ایک مرد مؤمن کا پیش فرمایا ہے؟ ہمیں افسوس ہے کہ یہ شبیہیں اس نقشہ پر قطعاً فٹ نہیں بیٹھتیں جو قرآن کریم نے اللہ کے بندوں کا پیش فرمایا ہے۔ چہ جائیکہ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شبیہہ کو اس نقشہ پر فٹ کرنے کی سعی نامشکور کی جائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے عہد کے ایک عالم اور مفکر یعنی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں رقم طراز ہیں :۔

(۱) مشرکانہ فال گیری (یعنی کوئی مؤمنانہ فال گیری بھی ہوتی ہے۔ مؤلف) جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے

قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ نے اس غرض کے لئے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی بھی کام ہو اس کے لئے ہبل کے پانسہ دار (صاحب القداح) کے پاس پہنچ جاتے اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے معاملہ کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ داران تیروں کے ذریعہ فال نکالتا اور جو تیر بھی نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا۔

(۲) توہم پرستانہ فال گیری جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعہ کیا جاتا یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی جن کا وسیلۂ علم غیب ہونا کسی عملی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جفر، مختلف قسم کے شگون اور نچھتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے یا یہ کہ عملی حیثیت سے تو ایک معمہ کے حل کے بہت سے صحیح حل ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جو کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحبِ معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لئے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا

مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔

(تفہیم القرآن ص ۴۴۲-۴۴۳ ج ۱)۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے جو تین صورتیں حرام قرار دی ہیں ان میں جیسا کہ ظاہر ہے اور مولانا مرحوم نے خود بھی اعتراف فرمایا ہے تیسری صورت تو جوئے اور قمار یعنی میسر کی ہے اسے اَزْلَامٌ میں شامل کر لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ آیت نمبر (۹۰) میں اَلْمَیْسِرُ کا لفظ صراحتہً آگیا ہے جس سے جوئے کی تمام صورتیں خود بخود حرام ہو گئی ہیں۔ اب اَزْلَامٌ سے بھی جوئے کی صورتیں مراد لینا صحیح نہیں ہوگا۔ جو چیز پہلے ہی حرام ہو چکی ہے اسی کو دوبارہ اُسی آیت میں حرام قرار دینا غیر مفید تکرار ہے۔ لہٰذا اَزْلَامٌ سے مراد پہلی دو صورتیں ہی ہوں گی۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسی وجہ سے اَزْلَامٌ کا مصداق پہلی دو صورتیں ہی قرار دی ہیں۔

اور اسی کو حافظ عماد الدین ابن کثیر اور دیگر محققین کے حوالہ سے راجح قرار دیا ہے۔ اب رہ گئی چوتھی صورت جسے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے قرعہ اندازی کی جائز صورت قرار دیا ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ بعینہٖ وہی دوسری صورت ہے جسے مولانا مودودی نے حرام قرار دیا ہے۔ یعنی زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی یا خیالی چیز یا کسی اتفاقی شئے کے ذریعہ کیا جاتا ہے یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلۂ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔

سفر میں کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی کرنا قطعاً اسی صورت میں آتا ہے۔ یہاں آپ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اپنے ہمراہ سفر میں لے جانے کے لئے فیصلہ کسی عقلی و فکری معقول وجہ سے نہیں فرماتے مثلاً اس وجہ سے نہیں کہ وہ زیادہ سمجھ دار ہیں، زیادہ فقیہ ہیں، حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی زیادہ مزاج شناس ہیں اور ان کی وجہ سے سفر میں آرام اور اطمینان کی زیادہ توقع ہے بلکہ محض وہمی، خیالی یا اتفاقی شئے سے فرماتے ہیں کہ ان کا نام قرعہ میں نکل آیا ہے جو قطعاً قرآن کریم کی رو سے ممنوع ہے۔ لہٰذا اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اس طرح کے فیصلے فرمانے کے عادی رہے ہوں۔ پھر عجیب بات ہے کہ حج اور عمرہ کے علاوہ

دیگر اسفار میں جہاں اس قرعہ اندازی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جہاں تک میری تلاش و جستجو کا تعلق ہے صرف تین ایسے اسفار ہیں جن میں آپ نے قرعہ اندازی فرمائی ہے ایک تو غزوۂ بنی مصطلق کا سفر جس سے واقعۂ افک کا تعلق جوڑا گیا ہے۔ دوسرے ایک اور سفر کا واقعہ جس میں آیت تیمم نازل ہوئی۔ تیسرے ایک اور سفر کا واقعہ جس میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی سفر میں ہمراہ ہیں اور وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی سواری کا اونٹ بدل لیتی ہیں۔ کیونکہ دورانِ سفر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کے قریب رہا کرتے تھے۔ لیکن ان تینوں سفروں میں حضرت عائشہؓ ضرور ساتھ ہیں۔ تو کیا قرعہ اندازی میں ہر مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کا نام ہی نکلا کرتا تھا۔ تیسرے واقعہ میں اگرچہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ہیں مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ ہی موجود ہیں۔ تو ایسی قرعہ اندازی سے کیا فائدہ تھا جس میں ہر مرتبہ ایک ہی نام نکلا جاتا تھا۔[1]

[1] جسٹس کیانی مرحوم نے ایک مرتبہ مرحوم فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے صدارتی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیابی پر طنز کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کچھ دن ہوئے ہم چند احباب انگلینڈ گئے اور وہاں ایک ہوٹل کے کمرہ میں ہم لوگوں نے قیام کیا۔ ہم پانچ چھ آدمی تھے روزانہ ہوٹل کا بے مرچ کا کھانا کھاتے کھاتے اکتا گئے۔ جی چاہا کہ کیوں نہ اپنے کمرہ میں مرغ خود پکا لیا جائے۔ چنانچہ بازار سے زندہ مرغ خرید لائے کیونکہ

اول تو سفر میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کسی نہ کسی زوجۂ محترمہ کو ساتھ لئے بغیر نہ جانا ہی محل تأمل ہے۔ آپ نے زیادہ تر سفر جنگ و جدال اور جہاد کے سلسلہ میں فرمائے ہیں۔ صرف ایک مرتبہ عمرہ کے لئے اور ایک مرتبہ حج کے لئے سفر فرمانا ثابت ہے۔ عمرہ اور حج کے سفر میں تو ازواج مطہرات کا ساتھ لے کر جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن جنگی اسفار میں مستورات کو ساتھ لے کر جانا سمجھ میں نہیں آتا۔ تاہم اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ مستورات کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یقیناً اس کا کوئی مقصد تو ہوتا ہوگا۔ بلاوجہ تو نعوذ باللہ آپ انہیں ساتھ ساتھ لئے پھرنے سے رہے یقیناً اس میں آپ

گوشت خریدنے میں یہ اندیشہ تھا کہ باقاعدہ ذبیحہ کا گوشت نہ ہو، مگر اب یہ سوال حل طلب تھا کہ اس کو ذبح کہاں کریں اور کون ذبح کرے پہلا سوال تو ہم نے یوں حل کر لیا کہ باتھ روم میں چپکے سے ذبح کر لیا جائے رہا دوسرا سوال تو کوئی شخص بھی ذبح کرنے پر تیار نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ لاؤ قرعہ ڈال لیں جس کا نام نکل آئے وہی یہ فرض انجام دے۔ چنانچہ میں نے چھ پرچیاں بنائیں اور ایک صاحب سے جن کا نام محمد ایوب تھا میں نے درخواست کی کہ کوئی سی پرچی اُٹھا لیں۔ انہوں نے ایک پرچی اُٹھا کر کھولی تو اس میں محمد ایوب ہی لکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ میں نے چھیوں پرچیوں پر ایک ہی نام یعنی محمد ایوب ہی لکھا تھا۔ وہ جونسی پرچی بھی اُٹھاتے۔ محمد ایوب ہی نکلنا تھا۔ تو کیا معاذ اللہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم بھی کوئی ایسا ہی گھپلا فرمایا کرتے تھے:

نے کوئی خاص مصلحت سمجھی ہوگی کہ مستورات کو بھی ساتھ لیا جائے۔ مثلاً تبلیغ وارشاد یا ازواج مطہرات کی تعلیم وتربیت کیونکہ سفر میں مختلف آبادیوں پر گذر ہوتا تھا۔ وہاں مردوں کے علاوہ عورتوں سے بھی سابقہ پڑتا تھا۔ لہٰذا یہ ازواج مطہرات عورتوں کو تبلیغ وارشاد فرمائیں گی یا خود کچھ مسائل جو سفر میں پیش آئیں گے سیکھیں گی۔ نیز اگر جنگ ہوئی تو زخمیوں کی مرہم پٹی کریں گی۔ زخمیوں کو میدان جنگ سے اُٹھا کر لائیں گی۔ ان کو پانی پلائیں گی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مصلحتیں ایسی ہیں کہ عقل وفکر کی بناء پر کسی ایک کو دوسری ازواج پر ترجیح دی جاسکتی تھی مثلاً کسی کا فقیہ اور عالم ہونا۔ زیادہ سمجھ دار ہونا۔ جوان اور چاق چوبند ہونا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ان عقلی وفکری ترجیحات سے قطعاً نہیں بلکہ محض قرعہ اندازی سے ترجیح کے فیصلے فرمایا کرتے تھے۔ ان حضرات نے غالباً یہ سمجھ رکھا ہے یا وہ دوسروں کو یہ تأثر دینا چاہتے ہیں کہ مستورات کو ان اسفار میں ساتھ لے کر جانے کا کوئی بلند مقصد یعنی تبلیغی یا تعلیمی نہیں تھا بلکہ کوئی ایسا پست اور فروتر مقصد تھا جس میں ہر بیوی برابر اور مساوی درجہ رکھتی تھی۔ چنانچہ مولانا مودودی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے کہ "دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کیلئے

ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے ---------- نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا" ---------- ظاہر ہے کہ ازواج مطہرات سب اپنی اپنی صلاحیتوں اور اہلیتوں کے اعتبار سے تو قطعاً برابر اور یکساں نہیں تھیں۔ کوئی زیادہ سمجھ دار اور فقیہ تھی مثلاً حضرت عائشہؓ۔ کوئی زیادہ بردبار اور معاملہ فہم تھی مثلاً حضرت ام سلمہؓ کوئی زیادہ جفاکش اور متحمل مزاج تھی مثلاً حضرت حفصہؓ اور کوئی زیادہ ایثار پیشہ اور سخی تھی مثلاً حضرت زینبؓ وغیرہ وغیرہ لہٰذا اس تصور سے کہ سب ایک درجہ کی تھیں اور ان میں سے کسی کو دوسری پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی دراصل یہ باور کرانا مقصود ہے کہ مستورات کو ساتھ لے کر چلنے کا مقصد کوئی اعلیٰ مقصد تھا ہی نہیں بلکہ نہایت ہی اسفل مقصد یعنی صرف جنسی آسودگی تھا جو ہر زوجۂ مطہرہ سے حاصل ہوسکتا تھا۔ اور اس مقصد کے حصول میں سب برابر اور یکساں تھیں۔ جن میں آپ کسی کو عقلی اور فکری انداز سے ترجیح نہیں دے سکتے تھے لہٰذا آپ قرعے ڈال لیا کرتے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ظاہر ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قسم کا تصور رکھنا انتہائی جہالت بلکہ بڑی بیہودہ جسارت ہے۔ اس لئے ہم

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرعہ اندازی کے اس تصور کی ہرگز تائید نہیں کر سکتے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی کا یہ طریق قطعاً مشرکانہ اور توہم پرستانہ تھا اور قرآن کریم نے اس کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ آپ ایسا کرتے ہوں چہ جائیکہ بقول مولانا مودودی بالعموم فرماتے ہوں۔

ہمیں خوشی ہے کہ یہ کوئی ہماری ہی ذاتی اپج نہیں ہے۔ بلکہ بقول قسطلانیؒ حنفیہ اور مالکیہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ والمشهور عن المالكية والحنفية عدم اعتبار القرعة (ارشاد الساری لشرح صحیح البخاری للعلامۃ القسطلانی ص ۱۱۸/۸) یعنی فقہائے مالکیہ اور حنفیہ سے مشہور یہی ہے کہ قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یہی تحریر فرمایا ہے انہوں نے ذرا تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

زاد ابن سعد من وجه اخر عن القاسم عن عائشةؓ فكان اذا خرج سهم غيري عرف فيه الكراهية واستدل به على مشروعية القرعة في القسمة بين الشركاء وغير ذلك كما تقدم في اواخر الشهادات والمشهور عن الحنفية والمالكية عدم اعتبار القرعة قال عياض هو مشهور

عن مالك واصحابه لانه من باب الخطر والقمار وحكي عن الحنفية آه وقد قالوا به في مسئلة الباب واحتج من منع من المالكية بان بعض النسوة قد تكون انفع في السفر من غيرها فلو خرجت القرعة للتي لا نفع بها في السفر لاضر بحال الرجل وكذا بالعكس قد يكون بعض النساء اقوم ببيت الرجل من الاخرىٰ۔ (فتح الباری ص ۲۲۳/۱۱)

ترجمہ:۔ ابن سعد نے دوسری سند سے قاسم عن عائشہؓ اتنا اضافہ کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ جب قرعہ میں میرے علاوہ کسی دوسری زوجۂ مطہرہ کا تیر نکل آتا تھا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس سے ناگواری نمایاں نظر آتی تھی۔ اس حدیث سے قرعہ اندازی کے جواز پر شرکاء میں چیزوں کے تقسیم وغیرہ کے بارہ میں استدلال کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب الشہادات کے اواخر میں گذر چکا ہے۔ لیکن حنفیہ اور مالکیہ سے قرعہ اندازی کا معتبر نہ ہونا ہی مشہور ہے۔ قاضی عیاض نے فرمایا ہے کہ امام مالک سے یہی مشہور ہے کیونکہ یہ ممنوعات اور جوئے کے ذیل میں آتا ہے اور حنفیہ سے بھی ایسا ہی نقل کیا گیا ہے الخ ان فقہاء نے قرعہ کے مسئلہ میں ایسا ہی فرمایا ہے۔ مالکیہ میں سے جن حضرات نے اس سے منع فرمایا ہے

انہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ بعض عورتیں سفر میں دوسری
عورتوں سے زیادہ مفید ہو سکتی ہیں۔ تو اگر قرعہ اس عورت
کے نام کا نکل آیا جس سے سفر میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو
یہ بات مرد کے لئے نقصان رساں ہوگی اسی طرح اس
کے برعکس بعض عورتیں آدمی کے گھر کا بہترین انتظام
کرنے والی ہوتی ہیں بہ نسبت دوسری عورتوں کے۔

بہرحال علامہ قسطلانی اور ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہما کی تصریحات کے مطابق فقہائے حنفیہ اور فقہائے مالکیہ کے نزدیک قرعہ اندازی کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور حضرات فقہائے مالکیہ نے جو اس کے خلاف دلیل دی ہے اس سے بھی ہمارے اس شبہ کی تائید ہوتی ہے کہ ساری عورتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ بعض بیویاں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا اپنے شوہر کے ساتھ سفر میں ساتھ جانا شوہر کے لئے فائدہ مند ہو سکتا ہے اور بعض کا فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اس کے برعکس بعض عورتوں میں انتظامی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم ہوتی ہے۔ لہٰذا بعض بیویوں کو گھر کی دیکھ بھال کے لئے گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ بعض کا گھر پر چھوڑنا زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ اس لئے قرعہ اندازی کر کے فیصلہ کرنا عام مصلحتوں کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے قرعہ اندازی اور فال گیری کے طریقوں کی مخالفت فرمائی ہے اور اسے حرام قرار دیا ہے۔ ابن سعد کے بیان کے مطابق اس روایت میں جو

بخاری نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ قرعہ میں اگر حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجۂ مطہرہ کا نام نکل آتا تھا تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ناگواری ہوتی تھی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم قرعہ اندازی فرماتے ہی کیوں تھے۔ قرعہ اندازی فرمانے کی آپ پر کوئی پابندی تو تھی نہیں قرآن کریم میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جس میں آپ کو اس کا حکم دیا گیا ہو۔ جو فقہائے کرام اس قرعہ اندازی کے مؤید ہیں وہ بھی اس پر متفق ہیں کہ آپ کو پورا پورا اختیار تھا کہ جس بیوی کو آپ چاہتے اپنے ساتھ سفر میں لے جا سکتے تھے۔ پھر اس فضول تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ فیصلہ فرما کر کسی بیوی کو ساتھ لے جانے کا تذکرہ روایات میں صرف تین مرتبہ آتا ہے اور تینوں مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ ضرور ساتھ ہیں۔ دو مرتبہ تن تنہا اور تیسری مرتبہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ۔ تو یہ کیسی قرعہ اندازی ہوا کرتی تھی کہ ہر مرتبہ حضرت عائشہؓ کا نام ہی نکلتا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور زوجۂ محترمہ کا نام قرعہ میں نکلتا تھا تو آپ کو ناگواری بھی ہوتی تھی۔ لیکن کسی ایسے سفر کا کہیں تذکرہ بھی نہیں ملتا جس میں حضرت عائشہؓ کا نام نہ نکلا ہو بلکہ تنہا کسی اور زوجۂ مطہرہ کا نام نکل آیا ہو۔

یہ ساری باتیں ایسی ہیں جو ہماری فہم سے بالا ہیں۔ اس بنا پر ہماری قطعی رائے ہے کہ یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ آپؐ قرعہ اندازی فرمایا کرتے تھے۔ ہم پوری تفصیل کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ قرعہ اندازی قرآن کریم کے قطعاً خلاف یعنی بالکل حرام، فسق۔ گندہ کام اور شیطانی عمل ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا ارتکاب فرماتے ہوں۔ اصولِ حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآن کریم کے خلاف جو بھی روایت ہو وہ قابل قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ آپ خدانخواستہ قرآن کریم کے خلاف کوئی عمل فرماتے ہوں۔ بہرحال یہ روایت ایک تو اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہے کہ یہ قرآن کریم کے خلاف ہے۔

دوسری بات جو نہایت اہم ہے وہ یہ ہے کہ روایت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کی ہے جن کے متعلق ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ امام زہریؒ کو ہمارے محدثین کتنا ہی بڑا امام حدیث کیوں نہ تصور کرتے ہوں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ نہایت اہم ہے کہ موصوف پر تشیع کا شبہ کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ جتنی حدیثیں ایسی آگئی ہیں کہ ان سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق کوئی قابل اعتراض بات نکلتی ہو اس میں امام زہری کا ہاتھ ضرور ہوتا ہے۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادہ کے متعلق کہ ان کا نام عبدالعزیٰ

رکھا گیا تھا۔ اس کے خالق بھی یہی محترم بزرگ ہیں۔ یہی حضرت اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت قرآن مجید کسی چیز پر لکھا ہوا نہیں تھا۔ نیز ابن شہاب زہری ہی اس روایت کے بھی خالق ہیں کہ سورۂ النجم کی تلاوت کے وقت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر ابلیس لعین کے زیر اثر تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ کے کلمات جاری ہو گئے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق وہ روایت بھی ان حضرت ہی کا کارنامہ ہے کہ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت ان کی عمر نو سال تھی۔ رجم کی آیت کے متعلق حضرت عمرؓ کے خطبہ کو نقل کرنے والے بھی یہی حضرت ہیں کہ رجم کی آیت قرآن میں نازل ہوئی تھی اور بعد میں وہ آیت قرآن سے خارج کر دی گئی اور میرا (عمرؓ کا) جی چاہتا ہے کہ میں اسے کتاب اللہ میں لکھ دوں۔ بہرحال اس قسم کی زیادہ تر روایات ان ہی حضرت سے منقول ہیں۔ مشہور شیعہ مؤلف شیخ عباس قمی فرماتے ہیں کہ ابن شہاب زہری پہلے سنی تھے پھر شیعہ ہو گئے تھے۔

(تتمۃ المنتہی ص۱۲۸)

عین الغزال فی اسماء الرجال میں بھی ابن شہاب زہری کو شیعہ ہی بتایا گیا ہے۔ مشہور بریلوی عالم شیخ الاسلام علامہ محمد قمرالدین صاحب سجادہ نشین آستانۂ عالیہ سیال شریف (جو آج کل اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی ہیں۔ فدک کے

لہ ہمیں افسوس ہے کہ علامہ قمرالدین صاحب کتاب کی طباعت کی نوبت آئی تو وہ مرحوم ہو چکے ہیں۔ غفر اللہ لہ ورحمہ۔

مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اب فدک والی روایت میں ایک شخص محمد ابن مسلم ہے جس کو ابن شہاب زہری بھی کہتے ہیں۔ صرف یہی راوی یہ روایت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرا کوئی شاہد نہیں۔ اور یہ ابن شہاب زہری اہل تشیع کے اصول کافی میں بیسیوں جگہ پر روایتیں کرتا نظر آتا ہے اور اہل تشیع کی فروع کافی نے تو اس کی روایتوں کے بل بوتے پر کتاب کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تو بھائیو! اہل تشیع کے اس قدر مشہور و معروف کثیر الروایت آدمی کی روایت سے اہل السنت پر الزام قائم کرنا اور ائمہ صادقین کو جھٹلانا عجیب فکر و نظر ہے ---------- آپ کی مزید تسلی کے لئے ہم اسی محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری صاحب کو کتاب منتہی المقال یا رجال بوعلی میں شیعوں کی صف میں بے نقاب بیٹھا ہوا دکھاتے ہیں۔ دیکھو کتاب رجال بوعلی میں صاف لکھا ہوا ہے کہ محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری شیعہ ہے۔ تو فدک کا جھگڑا اب تو ختم کرو۔ ہم تو ابن شہاب زہری کو اچھا سمجھتے اگر گھر کے بھیدی یہ بھید نہ کھولتے۔

("مذہب شیعہ" مطبوعہ مکتبہ ضیاء شمس الاسلام سیال شریف ضلع شاہ پور ص ۱۰۲-۱۰۳)

انہی ابن شہاب زہری کا تذکرہ شیخ عباس قمی کی کتاب الکنی والالقاب ص ۲۷۴-۲۷۵ ج ۲ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ شیعہ اسماء الرجال کی کتاب ہے۔ اس میں ان کا ذکر ان کے تشیع کی کھلی دلیل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :-

روی الخطیب فی تاریخ بغداد ص ۸۴ ج ۴ ان ابا اسحٰق الزھری المذکور قدم العراق ۱۸۴ھ فاکرمہ الرشید واظھر برہ وسئل عن الغناء فافتی بتحلیلہ --------

ترجمہ :- خطیب نے تاریخ بغداد ص ۸۴ ج ۴ میں بیان کیا ہے کہ ابو اسحٰق زہری مذکور ۱۸۴ھ میں عراق آئے تو ہارون رشید نے ان کا اکرام فرمایا اور ان پر احسانات فرمائے۔ ان سے گانے بجانے کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے اسے حلال قرار دیا۔

شیعہ اسماء الرجال کے امام محمد باقر ابن الحاجی میرزین الدین موسوی الخوانساری فرماتے ہیں :-

وروی الثقۃ الجلیل علی بن محمد بن علی الخزازفی کتابہ الکفایۃ روایۃ تدل علی تشیعہ وروی النص علی کون الائمۃ اثنی عشر عن علی ابن الحسین وان المھدی سابع اولاد ابنہ محمد ابن علی ---------- والذی ھو الراجح فی النظر عندی فی حق ھذا الرجل بعد استقصائی

الکامل لکلمات المادحین له والقادحین
والتأمل الغائر التام فی سبب کل منهما وما
هو طریق الجمع بین الادلة التی لم یطلع علی
عمدها صاحب التعلیقات التی استظهر تشیعه
وحسن احواله فضلا عن الشیخ ابی علی الرجالی
الذی هو لصیق عنده الفنون وقاصر عن
ادراک ما هو عند اهله مخزون انه مرة
کان فی مبتدأ امره کما عرفته من عبارة
تاریخ ابن خلکان من جملة علمائ اهل السنة
وندماء حزب الشیطن ثم ان علمه وادراکه
ادرکاه وارشداه الی الحق المبین فصیره
فی اواخر عمره من الراجعین الی الامام
زین العابدین وفی زمرة المستفیدین من
برکات انفاسه الشریفة والمستندین الی
کلماته الطریفة والمحبین له بیده ولسانه
والحافظین لغیبه المعلنین لعظم شانه و
قویم برهانه فمن جملة ما دل لک علی
ذلک وکانه الذی رآه صاحب التعلیقات
وجعل ایاه الدلیل علی تشیعه وکمال ایمانه
دون روایة النص علی الائمة الاثنی عشر
الذی فهمه صاحب المنتهی من عبارته۔

(روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات ص ۶۸۹/۱/۲)

ترجمہ:۔ جلیل القدر اور قابل اعتماد بزرگ علی ابن محمد
بن علی الخزاز نے اپنی کتاب کفایہ میں ایک روایت بیان
کی ہے جو ان کے شیعہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور انہوں
نے علی ابن الحسین سے یہ نص نقل کی ہے کہ ائمہ بارہ
ہوں گے اور مہدی ان کے صاحبزادہ محمد بن علی کی ساتویں
پشت میں ہوں گے۔ اس شخص کے بارہ میں غور و فکر کرنے
کے بعد اور ان کی مدح کرنے والوں اور قدح کرنے
والوں کی باتوں پر مکمل انتہائی تأمل کے بعد جو کچھ میرے
نزدیک راجح ہے نیز ان دلائل میں عمیق تأمل کر کے کہ
مدح اور قدح کے اسباب کیا ہیں اور ان کے درمیان
میں جمع کرنے کی کیا صورت ہے جن پر صاحب تعلیقات
کو واقفیت حاصل نہیں ہو سکی نہ شیخ بو علی کو اگو کہ
ان کے سامنے تمام علوم و فنون سپر افگندہ ہیں اور لوگ
ان فنون کے ادراک سے قطعاً قاصر ہیں جو ان کے ہاں
محفوظ ہیں) ان تمام امور پر غور و فکر کر لینے کے بعد میرا
جائزہ یہ ہے کہ وہ ابتداء عہد میں کبھی جیسا کہ تاریخ
ابن خلکان کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے منجملہ علمائے
اہلسنت اور گروہ شیطانی کے ہم نشینوں میں سے رہے
ہیں لیکن پھر ان کے علم و شعور نے ان کی حق مبین کی طرف
دستگیری اور رہنمائی کی۔ چنانچہ ان کے علم و شعور

نے ان کو آخری عمر میں امام زین العابدین کی طرف لوٹ
آنے والوں میں سے بنا دیا اور انہیں امام زین العابدین
کے انفاس قدسیہ کی برکت سے فائدہ حاصل کرنے والوں
کے زمرہ میں داخل کر دیا اور ان کے عجیب وغریب
کلمات سے سند لینے والوں اور اپنے ہاتھ اور زبان کے
ذریعہ سے ان سے محبت کرنے والوں اور ان کی غیبت
میں ان کی حفاظت کرنے والوں اور ان کی عظمت شان
اور مستقیم برہان کا اقرار کرنے والوں میں سے بنا دیا۔
اور یہی منجملہ ان باتوں کے ہے جو تمہیں اس بات کی
طرف رہنمائی کرتی ہیں اور جس کو امام شیخ بوعلی نے
ان کے شیعہ ہونے کی اور ان کے کمال ایمان کی دلیل
بنایا ہے اور غالباً یہی وہ بات ہے جسے صاحب تعلیقات
نے بھی دیکھا ہے مگر بارہ اماموں کے وجود کی نص کو
روایت کرنے والی بات ان سے بھی اہم ہے جسے صاحب
منتہی نے ان کی عبارت سے سمجھا ہے۔

(روضات الجنات فی احوال العلماء والسادات
مؤلفہ امام محمد باقر موسوی خوانساری)

ان تصریحات کے بعد اس امر میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ
محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری منجملہ شیعہ علماء کے ہیں جن کو
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرات شیخین
رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے خدا کے واسطے کا بیر اور للّٰہی بغض ہے۔

ان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ایسی باتوں کو پھیلائیں جن سے ان حضرات
کی سُبکی ہوتی ہو اور قرآن کریم پر لوگوں کے دلوں میں شبہات
پیدا ہوں۔

اس کے بعد ہم اس روایت کا باقاعدہ تجزیہ کر کے بتاتے
ہیں کہ درایت کے نقطۂ نظر سے اس میں کس قدر خامیاں ہیں۔

(۱) سب سے پہلے تو اس پر غور فرمائیے کہ ابن شہاب زہری نے
یہ حدیث چار تابعین سے روایت کی ہے۔ یعنی عروہ[۱] ابن زبیرؓ
سعید[۲] ابن المسیبؒ۔ علقمہ[۳] ابن وقاص اور عبید اللہ[۴] ابن عبداللہ
ابن عتبہ ابن مسعودؓ۔ لیکن پوری روایت کسی ایک راوی کی
نہیں ہے۔ بلکہ روایت کا کچھ حصہ ایک راوی نے بیان کیا، کچھ
حصہ دوسرے نے کچھ تیسرے نے اور کچھ چوتھے نے اور ابن شہاب
زہری نے ان سب کی روایتوں کو جوڑ کر ایک مربوط کہانی
مرتب کر لی ہے۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ حدیث کا کوئی خاص
ٹکڑا چونکہ کسی ایک راوی کی طرف منسوب نہیں ہے لہٰذا اگر
کوئی انکار کرنے لگے تو آسانی کے ساتھ اس کا منہ بند کیا
جا سکتا ہے کہ میں نے کب کہا ہے کہ یہ بات آپ نے بیان کی
تھی؟ آپ نے بیان نہیں کی تو دوسرے لوگوں میں سے کسی
نے بیان کی ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی دوسرا راوی اگر انکار
کرنے لگے تو اس کا منہ اسی طرح بند کیا جا سکتا ہے۔[۱] راوی کو

---

[۱] یہاں مجھے امام ابو زرعہؒ محدث اور امام احمد ابن حنبلؒ کا واقعہ
یاد آ گیا کہ وہ جامع مسجد کوفہ کے دروازہ پر پہنچے تو ایک صاحب

متعین طور پر بتانا چاہیئے کہ اس کے کون کون سے استاد نے کون سی بات بیان کی ہے تاکہ اس کی تحقیق اور پھر اس کی تصدیق یا تکذیب کی جا سکے۔ ایسی مجہول روایت کا کیسے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے (فتح الباری ص ۶۹ ج ۱۰) میں فرمایا ہے کہ قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ محدثین نے زہری کے اس طرز عمل پر سخت تنقید کی ہے جو انہوں نے اپنی اس روایت کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے کہ چار راویوں کی روایات کو خلط ملط کر کے ایک روایت بنا ڈالی ہے۔ اُنہیں چاہیئے تھا کہ ہر راوی کی روایت الگ الگ بیان کرتے۔ انتہی۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے

وہاں وعظ فرما رہے تھے اور ان دونوں حضرات ہی کے حوالہ سے روایات بیان کر رہے تھے۔ اپنا نام سن کر ان دونوں حضرات کے کان کھڑے ہوئے۔ دونوں ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ روایات قطعاً من گھڑت تھیں۔ وعظ ختم ہوا تو امام ابو زرعہؒ آگے بڑھے اور ان واعظ صاحب سے عرض کیا کہ میں ابو زرعہ ہوں اور یہ احمد ابن حنبل ہیں۔ ذرا بتائیے کہ یہ حدیثیں ہم نے آپ سے کب بیان کی تھیں؟ ہم نے تو یہ حدیثیں آپ سے کبھی بھی بیان نہیں کیں۔ بجائے شرمندہ ہونے کے وہ صاحب نہایت دیدہ دلیری سے بولے کہ اے لیجئے ابو زرعہ اور احمد ابن حنبل آپ ہی رہ گئے ہیں۔ میاں! ستر ابو زرعہ ہیں اور ستر ہی احمد ابن حنبل ہیں جن سے میں روایت کرتا ہوں۔ اس نام کے آدمی دنیا میں صرف آپ ہی تو نہیں ہیں۔ منہ

ہیں کہ میں نے روایات کو تلاش کیا تو مجھے عروہ اور علقمہ کی روایتیں الگ الگ مل گئیں لیکن دونوں روایتوں کے سیاق میں، زہری کے اس سیاق سے جو انہوں نے چاروں راویوں سے نقل کیا ہے بڑی مخالفتیں، نقص، اور زیادتیاں پائی جاتی ہیں۔ مزید برآں انہوں نے یہ بھی نقل فرمایا ہے کہ راوی نے یہاں تو روایت یوں شروع کی ہے کہ "حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے یوں فرمایا۔ لیکن فلیحؒ راوی نے اپنی روایت یوں شروع کی ہے کہ زعموا ان عائشة قالت یعنی ان چاروں راویوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا ہوگا۔ یعنی اُنہیں اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یوں فرمایا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ زَعَمَ کا لفظ عربی زبان میں قَالَ کی جگہ بھی استعمال ہو جاتا ہے یعنی کہنے والے کو تردد نہ ہو۔ لیکن یہاں اس لفظ کو استعمال کرنے میں غالباً راز یہ ہے کہ زہری کے تمام استادوں نے ان کے سامنے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی کہ انہوں نے یہ روایت حضرت عائشہؓ ہی سے سنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حافظ کرمانیؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(فتح الباری ص ۱۷۱ ج ۱)

ان تمام باتوں سے اس روایت کی قدر و قیمت متعین کرنے میں جو اہم مدد مل سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔

(۲) دوسری بات اس روایت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ کیونکہ پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ لہٰذا (کچھ آدمی) اُنہیں (حضرت عائشہؓ

کو ہودج میں بٹھا کر سواری پر چڑھاتے اتارتے تھے"۔ ہودج اونٹ کا تھا۔ ہاتھی کا تو تھا نہیں۔ اونٹ کا ہودج (کجاوہ) جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کے دو حصے ہوتے ہیں جو اونٹ کے کوہان کے دونوں طرف ہوتے ہیں۔ جبتک ان دونوں حصوں کا وزن برابر نہ ہو۔ یعنی دونوں طرف دو آدمی برابر وزن کے سوار نہ ہوں اسے اونٹ پر نہ کسا جا سکتا ہے نہ چڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر ہودج میں ایک طرف تو کوئی سوار موجود ہو اور دوسری طرف کوئی سوار نہ ہو تو اسے اونٹ پر چڑھایا ہی نہیں جا سکتا۔ دوسری طرف بھی کوئی سواری ہونی چاہیئے یا کوئی وزنی چیز رکھنی چاہیئے۔ ورنہ ہودج گر پڑے گا یہی وجہ ہے کہ مع سواری کے ہودج کو اونٹ پر نہیں چڑھایا جا سکتا۔ پہلے ہودج باندھا جاتا ہے۔ اس کے بعد سواری کو ہودج میں بٹھایا جاتا ہے۔ لیکن یہاں معمول کے خلاف مع سواری کے ہودج چڑھایا جا رہا ہے۔ اور سواری کو متنبہ بھی نہیں کیا جاتا کہ وہ ہودج کا وزنی توازن درست کرلے۔ جس طرف آدمی سوار ہے وہ یا تو دوسری طرف کسی آدمی کو بٹھائے گا یا اُدھر کوئی وزنی چیز رکھے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہودج میں دوسری طرف کوئی وزنی چیز ہودج کا توازن قائم رکھنے کیلئے پہلے سے رکھی ہوئی تھی تو پھر بھی چونکہ ہودج میں حضرت عائشہؓ موجود ہی نہیں ہیں تو لامحالہ ان کی جہت خالی ہے۔ ہودج کو فوراً گر جانا چاہیئے تھا۔ لیکن ہودج گرتا بھی نہیں ہے۔ چنانچہ پوری ایک

منزل کے سفر میں کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہو سکا کہ ہودج خالی ہے اور حضرت عائشہؓ موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کو تلاش کیا جائے۔

(۳) بخاری ہی میں ابن ابی ملیکہ عن القاسم عن عائشہؓ کی سند سے کتاب النکاح (باب القرعۃ بین النساء اذا اراد سفرًا) میں ایک روایت آئی ہے کہ ایک سفر میں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ آنحضرت کے ساتھ سفر میں تھیں۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کے اونٹ کے ساتھ رات بھر چلتے تھے اور حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ کو یہ تجویز پیش کی کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں اونٹ بدل لیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ چکمہ میں آگئیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم رات بھر اسی اونٹ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جس پر بجائے حضرت عائشہؓ کے حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور سارے رات بھر کے سفر میں حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات چیت سے محروم رہیں اور منزل پر پہنچ کر حضرت عائشہؓ نے اذخر میں اپنے پاؤں خوب ملے اور رگڑے اور خود کو کوسنے دیئے اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سفر میں حضرت عائشہؓ کو تنہا نہیں چھوڑتے تھے ان کے اونٹ کے ساتھ ساتھ رہتے اور باتیں کرتے ہوئے چلتے تھے۔ یہی آپ کی عادت تھی۔ مگر اس سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رات بھر سفر میں حضرت عائشہؓ کی گم شدگی کی کوئی

خبر نہیں ہوئی بلکہ منزل پر پہنچ کر بھی دوپہر ہو گیا اور آپ کو کوئی اطلاع نہیں ہوئی۔ تا آنکہ وہ حضرت صفوان کے ساتھ قافلہ میں پہنچ گئیں۔ اب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور دوسرے لوگوں کو آپ کی گم شدگی اور حضرت صفوان ابن معطل کے ساتھ قافلہ میں آمد کی اطلاع ہوئی اور لوگوں کو باتیں بنانے کا موقعہ ملا۔ تعجب ہے کہ خلافِ عادت آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضؓ سے اس درجہ غافل رہے۔ یہ بات بھی محل تأمل ہے۔

(۴) ابن شہاب زہری کی اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضؓ اور دیگر ازواج مطہرات قضائے حاجت کے لئے رات کو جنگل تو جایا کرتی تھیں مگر تنہا نہیں جاتی تھیں۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں قضائے حاجت کے لئے آپ کے جنگل جانے کا تذکرہ کیا گیا ہے تو حضرت ام مسطح رضؓ آپ کے ساتھ ہیں عجیب بات ہے کہ مدینہ منورہ میں تو آپ قضائے حاجت کیلئے جنگل جاتی ہیں تو کسی نہ کسی عورت کے ساتھ جاتی ہیں لیکن سفر میں جہاں کے جنگل سے آپ واقف بھی نہیں ہیں قضائے حاجت کے لئے جاتی ہیں تو تن تنہا چلی جاتی ہیں اور ایسے چپ چپاتے چلی جاتی ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ نہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوتی ہے اور نہ پورے لشکر اسلام میں کوئی آپ کو جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضؓ کا قیام منزل پر

اگر ہو گا تو وہ کسی درمیانی جگہ پر ہو گا۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ لشکر کے کمانڈر کا قیام لشکر کے قلب میں ہوا کرتا ہے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا قیام تو ویسے بھی لشکر کے درمیان ہی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ صحابہ آپ کو اور آپ کی حرم محترم کو سفر میں کسی یکسو مقام پر تو چھوڑنے سے رہے جبکہ آپ کی حفاظت وصیانت کا فریضہ بھی ان پر عائد ہوتا تھا۔ یہ بات بھی محل تأمل ہے۔

(۵) حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی کم سنی اور کم وزنی کا چرچا زور و شور سے کیا گیا ہے۔ ہم دلائل سے بتا چکے ہیں کہ ان کی کم سنی کا افسانہ بالکل غلط ہے ان کا نکاح کم از کم سولہ سال کی عمر میں اور رخصتی کم از کم انیس سال کی عمر میں ہوئی ہے اور غزوۂ بنی مصطلق میں جو ۵ھ میں ہوا ہے ان کی عمر کم از کم بائیس سال تو ضرور ہے۔ بائیس سال کی عمر والی عورت کو کم سن اور کم وزن قرار دینا کہ ہودج اُٹھا کر اونٹ پر کسنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ کوئی اس ہودج میں سوار ہے یا نہیں عجیب بات ہے۔ بائیس سال کی ایک عورت وہ کتنی ہی دبلی پتلی اور لاغر کیوں نہ ہو اتنی بے وزن تو لا محالہ نہیں ہو سکتی کہ ہودج اُٹھانے والوں کو اندازہ ہی نہ ہو سکے کہ کوئی ہودج میں سوار ہے یا نہیں۔

(۶) ہار کا ٹوٹ کر اس طرح گر جانا اور حضرت عائشہ کو لشکرِ اسلام کے قریب پہنچنے تک اس کا علم نہ ہونا بھی محل تأمل ہے۔

جبکہ یہ ہار یمنی منکوں کا تھا اور ایک مرتبہ اور بھی (واقعۂ تیمم میں) ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ یہ ہار بار بار کیوں ٹوٹتا تھا؟ کیا اس کو ہمیشہ کچے دھاگے میں پرویا جاتا تھا؟ یمنی منکوں کے ہار میں کچھ وزن تو ضرور ہونا چاہیئے۔ اس ہار کا ٹوٹ کر گر جانا اور پہننے والی عورت کو معلوم نہ ہونا بھی حیرتناک ہے۔ پھر حضرت عائشہؓ (بقول راوی کے) قضائے حاجت کے لئے دور جاتی ہیں۔ واپس آتی ہیں اور لشکر اسلام میں اپنی سواری کے قریب پہنچتی ہیں اور سینہ پر ہاتھ پھیرتی ہیں تو ان کو علم ہوتا ہے کہ ہار نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ہار کو تلاش کرنے کے لئے دوبارہ جاتی ہیں۔ مگر بار بار آنے اور جانے کے باوجود لشکریوں میں سے کسی نے بھی ان کو نہ دیکھنا اور بھی باعث تعجب ہے۔ لشکر اسلام کے درمیان سے ان کا ایک مرتبہ قضائے حاجت کے لئے جانا۔ پھر واپس آنا اور اپنی سواری تک پہنچنا اور ہار کی غیر موجودگی کا علم ہو کر پھر دوبارہ واپس جانا۔ یہ اُن کے تین چکر ہو گئے۔ تعجب ہے کہ وہ کسی کو نظر نہ آئیں۔ کیا انہوں نے داستانِ امیر حمزہ کی کلاہ سلیمانی اوڑھ رکھی تھی کہ وہ سب دیکھتی رہیں اور خود کسی کو نظر نہیں آئیں۔ کتنی خلافِ عقل بات ہے۔

(۷) روایت میں بتایا گیا ہے کہ "وہ ہار اسلامی لشکر کے روانہ ہونے کے بعد حضرت عائشہؓ کو ملا۔ ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر آئیں تو دیکھا وہاں کوئی بھی نہیں۔ وہ اپنی جگہ پر اس خیال

سے بیٹھ گئیں کہ جب مسلمانوں کو ان کے گم ہونے کا علم ہوگا تو انہیں ڈھونڈتے اسی جگہ آئیں گے۔ کچھ دیر بعد اُنہیں نیند آگئی اور وہ سو گئیں"۔ یہ ساری بات انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ایک نوجوان عورت (بلکہ بقول راوی ایک کمسن لڑکی) جنگل بیابان میں۔ جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں۔ (عرب کے ریگستانوں کا منظر ذہن میں رکھیئے) آدم ہے نہ آدم زاد۔ عورت تنہا ہے۔ وہ اپنے کارواں سے بچھڑ گئی ہے۔ رات کا وقت ہے۔ ہر طرف سناٹا ہے۔ ہو کا عالم ہے۔ وہ وہاں اطمینان سے بیٹھ جاتی ہے کہ مسلمانوں کو میری گم شدگی کا علم ہوگا۔ تو خود ہی ڈھونڈنے آئیں گے اور وہ مزے سے سو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ ۵ھ کا واقعہ ہے جب کہ ہر طرف مشرکین عرب کا غلبہ تھا۔ جو اپنی وحشت و بربریت میں ضرب المثل تھے۔ ان حالات میں تو اچھے سے اچھا سورما بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا چہ جائیکہ ایک کمسن اور نوعمر لڑکی۔ کس قدر خلاف فطرت بات ہے کہ ایک کمسن اور نوعمر لڑکی کو نہ کوئی وحشت لاحق ہوتی ہے نہ گھبراہٹ بلکہ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے اور پرسکون حالت میں اس کی آنکھ بھی لگ جاتی ہے۔ ہمارا تو خیال ہے کہ ان حالات میں خود امام زہری ہوتے تو ان کا زہرہ بھی آب ہو جاتا۔ کہاں کی نیند اور کہاں کا سکون و اطمینان۔ یہ خلافِ فطرت گھڑا ہوا افسانہ نہیں تو اور کیا ہے۔

(۸) جن لوگوں نے ایک لشکر کے ساتھ اونٹوں پر کبھی سفر کیا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ لشکر کی روانگی کے وقت انتہائی شور و شغب ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اونٹوں کے ذریعہ سفر کیا جا رہا ہو تو صرف اونٹوں کے بلبلانے کی آواز ہی اتنی شدید ہوتی ہے کہ میلوں تک سنی جا سکتی ہے۔ حیرت ہے کہ حضرت عائشہؓ کو لشکر کی روانگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ان کو لشکر کی روانگی کا علم اس وقت ہوا جب وہ پڑاؤ پر پہنچیں چنانچہ راوی کہتا ہے کہ "ہار کو لے کر وہ اپنی منزل پر پہنچیں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا" حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ لشکر کی روانگی کا علم تو انہیں لشکر اور اونٹوں کے شور و غوغا سے ہو جانا چاہیئے تھا۔ اور انسانی فطرت یہ ہے کہ روانگی کے شور و غوغا کو سننے کے ساتھ ساتھ انہیں واپسی میں انتہائی سرعت کرنی چاہیئے تھی۔ بھاگنا دوڑنا چاہیئے تھا۔ لشکر کو چیخ کر بلند آواز سے روانگی سے روکنا چاہیئے تھا۔ مگر حضرت عائشہؓ جو راوی کے بیان کے مطابق نہایت کمسن اور کم عمر لڑکی تھیں انہوں نے فطرت انسانی کے خلاف نہ شور کیا نہ کسی کو آواز دی۔ نہ وہ بھاگیں نہ دوڑیں نہ کسی قسم کی گھبراہٹ اور توحش کا اظہار فرمایا۔ وہ نہایت اطمینان کے ساتھ صُمٌّ بُکْمٌ بنی ہوئی ہار کے دانے ہی ڈھونڈتی رہیں اور جبتک ایک ایک دانہ تلاش نہیں کر لیا وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہیں۔ اسلامی لشکر منزل سے روانہ بھی ہو گیا اور اُنہیں کانوں کان خبر بھی نہیں

ہوئی۔ رات کی تاریکی میں ان دانوں کو تلاش کرنا بجائے خود ایک حیرت ناک بات ہے۔ نہ کوئی روشنی ساتھ ہے۔ نہ لالٹین ہے نہ ٹارچ ہے رات کو اندھیرے میں وہ دانے ملے تو کیسے ملے۔

(۹) حضرت صفوان ابن معطل سلمیؓ جو بعد میں ذکوانی مشہور ہو گئے اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے۔ وہ صبح کے وقت حضرت عائشہؓ کے قریب پہنچے"، عجیب بے تکی بات ہے۔ صفوان بن معطل سلمیؓ اسلامی لشکر ہی کا ایک جزو تھے۔ وہ اسلامی لشکر کے پیچھے رہا کرتے تھے تاکہ لشکر کی گری پڑی چیزیں اٹھا لیں لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک منزل پیچھے رہا کرتے تھے۔ کیونکہ اسلامی لشکر شروع رات میں روانہ ہو چکا ہے اور صفوانؓ ابن معطل اس منزل پر صبح سویرے پہنچے ہیں۔ بہرحال یہ بات غور طلب ہے کہ وہ اتنا پیچھے کیوں رہتے تھے۔ اگلی منزل پر وہ حضرت عائشہؓ کو لے کر اسلامی لشکر کے پڑاؤ پر پہنچ گئے ہیں اور اسلامی لشکر ہی کے ساتھ انہوں نے بھی قیام کیا ہے۔ تو اس سے پچھلی منزل میں وہ لشکر سے اس قدر دور کیوں رہ گئے تھے۔ پیچھے رہنے کا مطلب تو یہ ہونا چاہیئے کہ صفوان بھی لشکر کے ساتھ قیام کریں لیکن اس کے ساتھ روانہ نہ ہوں بلکہ ایک دو گھنٹے کے بعد روانہ ہوں تاکہ لشکر کی گری پڑی چیز اُٹھاتے لائیں۔ واضح رہے کہ عرب میں جو ایک ریگستانی ملک ہے سفر عام طور پر رات کو کیا جاتا ہے اور صبح ہونے پر لشکر پڑاؤ کر لیتا ہے۔ ایک منزل بارہ کوس یعنی اٹھارہ میل

کی ہوتی ہے۔ ایک ایسے علاقہ میں جہاں قدم قدم پر خطرات ہوں اور ہر طرف دشمن ہی دشمن ہوں ایک تنہا آدمی کو لشکر سے اتنی دور یعنی اٹھارہ میل کے فاصلہ پر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ بات خلافِ عقل اور خلاف مصلحت ہے۔ کیونکہ وہ بھی تو اسلامی لشکر ہی کا ایک فرد ہے۔

(۱۰) بتایا گیا ہے کہ "کیونکہ انہوں نے پردہ کے حکم سے پہلے حضرت عائشہؓ کو دیکھا تھا۔ لہٰذا وہ دیکھتے ہی حضرت عائشہؓ کو پہچان گئے اور کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کلمات کی آواز سے حضرت عائشہؓ جاگ گئیں اور فوراً اپنی چادر سے اپنا منہ چھپا لیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔ اور نہ حضرت عائشہؓ نے سوائے استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون) کے ان کی زبان سے کوئی اور بات سنی۔" یہ بھی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ صفوانؓ ابن معطل کو علم غیب تو تھا نہیں۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ حضرت عائشہؓ لشکر سے بچھڑ گئی ہیں اور تن تنہا یہاں ریگستان بھی پڑی ہیں اور وہ اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون بھی پڑھتے ہیں مگر وہ اپنی ماں (ام المؤمنین) سے یہ تک نہیں پوچھتے کہ یہ حادثہ کیوں اور کیسے پیش آیا۔ وہ کس وجہ سے پیچھے رہ گئیں۔ وغیر ذٰلک۔ یہ تو انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی عجیب بات اس کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کی وجہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اسے قصد و ارادہ بھی نہیں

کرنا پڑتا۔ یہ باتیں بلا ارادہ اس سے صادر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بلا ارادہ ان کی زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون نکل گیا تھا دوسری باتیں بھی (از قسم استفسارات) بلا ارادہ ان کی زبان سے نکلنی چاہئیں تھی۔

(۱۱) بتایا گیا ہے کہ "اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن ابی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔ سوال یہ ہے کہ منافق کسے کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو زبان سے اسلام لانے کا دعویٰ کرتے ہیں خود کو مسلمان کہتے ہیں اور تمام اعمال مسلمانوں جیسے کرتے ہیں۔ البتہ ان کے دل میں اسلام و ایمان نہیں ہوتا۔ وہ دوسری طرف کفار سے بھی ملے رہتے ہیں۔ لیکن ان پر مسلمانوں کے تمام احکام جاری ہوتے ہیں۔ وہ غزوات میں شریک ہوتے ہیں اور انہیں مال غنیمت میں سے حصے بھی دیئے جاتے ہیں۔ وہ کسی حکم سے مستثنیٰ نہیں ہوتے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا اچھی طرح علم تھا کہ اس فتنہ کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی ہے۔ چنانچہ ایک ماہ تک اذیت سہتے سہتے بالآخر آپ مسجد نبوی میں خطبہ دیتے ہیں اور گروہ انصار و مہاجرین سے اس کے خلاف مدد بھی طلب فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔ "کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے"

لیکن جب حضرت عائشہؓ کی برأت نازل ہوجاتی ہے اور ان بہتان طرازی کرنے والوں کا کذب ثابت ہوجاتا ہے تو حد قذف صرف ان تین آدمیوں پر نافذ کی جاتی ہے (حسانؓ ابن ثابت مسطحؓ بن اثاثہ۔ اور حمنہؓ بنت جحش) جو غریب محض ان منافقین کی لپیٹ میں آگئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ عبداللہ ابن ابی اور دوسرے منافقین کو کیوں معاف کر دیا گیا۔ کیا وہ اسقدر صاحب قوت تھے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ان پر حد جاری کرنے سے ڈر گئے؟ یا آپ نے کسی مصلحت اندیشی کی بناء پر درگذر کرنا مناسب سمجھا؟ حدود اللہ کے جاری کرنے میں یقیناً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کسی مصلحت کا شکار ہرگز نہیں ہوسکتے تھے۔ فتح مکہ کے موقعہ پر جب ایک قریشی عورت چوری کے جرم میں پکڑی گئی اور پورے قریش میں اس حکم پر کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے ایک سنسنی سی پھیل گئی کیونکہ یہ ان کی ناک کا مسئلہ تھا اور حضرت اسامہؓ کو سفارشی بنا کر بھیجا گیا تو آپ نے حضرت اسامہؓ کو ڈانٹ پلائی تھی کہ (اتشفع فی حدود اللہ) کیا اللہ کی حدود کے معاملہ میں تم سفارش کرتے ہو؟ اور فرمایا تھا کہ اگر فاطمہ بنت محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی (معاذ اللہ) یہ جرم سرزد ہوا ہوتا تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا تو آپ کے متعلق یہ تصور تو نہیں کیا جا سکتا کہ آپ مصلحت اندیشی کا شکار ہوگئے تھے نہ ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ خدانخواستہ ڈرتے

تھے کہ اس پر حد جاری کر دی گئی تو کوئی قیامت برپا ہوجائے گی۔ جو شخص تن تنہا پورے عربستان کے مقابلہ میں کسی طرح کے خوف و اندیشہ کا شکار نہیں ہوا اور اپنی بات ببانگ دہل دہراتا رہا اس کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدانخواستہ سعد ابن عبادہؓ کی تقریر سے ڈر گئے تھے۔ پھر ابن ابی منافق کا کوئی عذر بھی پیش نہیں کیا جاتا جس کی بنا پر اسے معاف کر دیا گیا ہو۔

(۱۲) بتایا گیا ہے کہ "مدینہ منورہ پہنچتے ہی حضرت عائشہ صدیقہؓ بیمار ہوگئیں۔ بیماری نے طول کھینچا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گذر گیا"۔ بیمار کیوں ہوگئیں، اور بیمار بھی ایسی کہ ایک مہینہ گذر گیا۔ اور بیماری نے اتنا طول کھینچا۔ اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی۔ بیماری کیا تھی۔ یہ بھی نہیں بتایا گیا حضرت عائشہ صدیقہؓ کو اس تہمت کی ایک مہینہ تک کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی کہ اسے ہی بیماری کا سبب قرار دیا جا سکے۔ بہرحال یہ بات بھی شبہ میں ڈالنے والی ہے۔

(۱۳) اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ "یہ بات پھیلتے پھیلتے ایک انصاری کو پہنچی اس نے سنتے ہی فوراً کہا، اے اللہ تو پاک ہے ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم ایسی بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے"۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو خود قرآن کریم میں آئے ہیں کہ مسلمانوں کو سنتے ہی یوں کہنا چاہیئے تھا۔ یہ انصاری معلوم نہیں کون تھا۔ لیکن نہایت کامل الایمان

شخص تھا جس کا عمل بالکل منشائے الٰہی اور رضائے خداوندی کے مطابق رہا۔ اس نے وہی کچھ کہا جو حق تعالیٰ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان یہ کچھ کہے اور ماشاء اللہ یہ انصاری خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر بھی سبقت لے گیا کہ نہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ کچھ کہا بلکہ وہ حضرت زینبؓ، حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت بریرہؓ سے مشورے اور تحقیقات ہی کرتے رہے اور حضرت علیؓ دبے لفظوں میں تہمت کی تائید ہی کرتے رہے اور لگے حضرت بریرہؓ کو مارنے پیٹنے کہ وہ کچھ تو خلاف کہہ دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راوی نے یہ کہہ کر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت اسامہؓ۔ حضرت بریرہؓ سب پر اچھا خاصا وار کر دیا ہے خصوصاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کا مسلمانوں میں جو تقدس واحترام ہے وہ تو بالکل ہی پارہ پارہ کر دیا ہے۔

(۱۴) آگے ارشاد ہوا ہے "لوگوں میں اس تہمت کا چرچا ہونے لگا۔ وہ اس میں غور و فکر کرتے تھے لیکن حضرت عائشہ صدیقہ کو اب تک اس تہمت کا علم نہ تھا" یہ کتنی خلافِ عقل بات ہے۔ ازواج مطہرات کے حجرے مسجد نبوی سے متصل بنے ہوئے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کا حجرہ بھی مسجد کے ساتھ ہی تھا چنانچہ آخری زمانہ میں آپ نے تمام صحابہ کے دروازے جو مسجد کی طرف کھلتے تھے۔ سوائے ابوبکرؓ کے دروازہ کے بند بند کرا دیئے تھے۔ لہٰذا ثابت ہے کہ مسجد کے ساتھ ہی حضرت

ابوبکر صدیقؓ کا مکان بھی تھا۔ ایک مہینہ تک مدینہ منورہ میں خاصا کہرام مچا رہا۔ مسجد نبوی میں آپ نے خطبہ دیا وہاں اوس اور خزرج کے سرداروں سعد ابن معاذؓ اور سعد ابن عبادہؓ کے درمیان تو تو میں میں ہوتی ہے۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے سردار کے ساتھ آواز بلند کرتا ہے۔ اتنا شور ہوتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، ازواج مطہرات کے حجروں میں مسلمان عورتیں مسائل پوچھنے کے لئے آتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن اس پورے مہینہ میں کوئی انصاری یا مہاجر خاتون کو بھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور کوئی عورت نہیں آئی۔ انصاری عورت آئی بھی تو آخری مرحلے میں آئی جب آیات برأت نازل ہونے کو تھیں۔ اس سے پہلے پورے ایک مہینہ تک سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ نہ حضرت عائشہؓ کو مہینہ بھر تک خبر ہوئی نہ ان کے والدین کو خبر ہوئی نہ حضرت عائشہؓ سے ہمدردی رکھنے والی کسی مسلمان خاتون کو خبر ہوئی کہ وہ آکر حضرت عائشہؓ کو بتا دیتی۔ یہ ساری باتیں خلافِ عقل ہیں جو کسی طرح سمجھ میں نہیں آتیں۔ علاوہ ازیں ازواج مطہرات کے حجرے تو مسجد نبوی کے ساتھ ہی تھے اور تمام ازواج مطہرات ایک دوسرے سے ملتی رہتی تھیں۔ سب کے حجرے پاس پاس تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پورے ایک ماہ بیمار رہیں اس پورے ایک مہینہ میں کوئی زوجہ مطہرہ ان کی عیادت کے لئے بھی نہیں آئی کہ کوئی تو کچھ بتا دیتی۔

(۱۵) کہا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ اپنی بیماری میں رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کا وہ لطف و کرم نہیں دیکھتی تھیں جو اس سے پہلے
اپنی بیماری میں دیکھا کرتی تھیں۔ انہیں اس بات سے شک ہوتا تھا
(کہ غالباً رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کچھ خفا ہیں) رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لاتے، سلام کرتے اور پوچھتے
"تم کیسی ہو؟" پھر واپس چلے جاتے۔ کم سنی کی وجہ سے حضرت
عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا زیادہ شعور نہیں تھا (وہ نہ سمجھ
سکیں کہ آخر کیا بات ہے؟)" یہ انسانی فطرت کے بالکل ہی خلاف
بات ہے۔ جس قدر محبت اور تعلق زیادہ ہوتا ہے اسی قدر ذرا سی
بے رخی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم کو حضرت عائشہؓ سے انتہائی محبت تھی ایسی ہی محبت حضرت
عائشہؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی جس کا مظاہرہ
ایک دوسری حدیث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سفر میں ایک مرتبہ
حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہ سے کہا کہ لاؤ آج رات کو ہم دونوں
اپنا اپنا اونٹ بدل لیں دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت حفصہؓ
حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر اور حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ کے
اونٹ پر سوار ہو گئیں۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اُسی اونٹ
کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جو حضرت عائشہؓ کا تھا لیکن اس پر
حضرت حفصہؓ سوار تھیں اور اس طرح حضرت عائشہؓ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اور آپ کی باتوں سے رات بھر محروم
رہیں تو منزل پر پہنچنے کے بعد اذخر گھاس میں انہوں نے خوب خوب
پاؤں رگڑے اور اپنے آپ کو کوسنے دیئے کہ "پروردگارا! میرے اوپر

کسی بچھو یا سانپ کو مسلط کر دے جو مجھے ڈس لے۔ میں آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کچھ نہیں کہہ سکتی"، ملاحظہ فرمائیے کہ صرف
ایک رات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی معیت اور گفتگو سے
محرومی پر تو آپ کو اتنی شدید ناگواری ہوئی مگر یہاں ایک مہینہ
تک اس محرومی پر کوئی خاص ملال نہیں ہوا۔ صرف شک ہی ہوا کہ
شاید آپ ناراض ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عین تقاضا تھا کہ حضرت
عائشہؓ نے آپ کی ذرا سی بے رخی دیکھی تھی تو فوراً آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم سے اس کی وجہ معلوم کرتیں۔ پھر کس قدر غیر معقول
بات ہے کہ کم سنی کی وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بھلے برے کا
زیادہ شعور نہیں تھا"۔ اول تو یہی غلط ہے کہ وہ کم سن تھیں اور
اگر بالفرض کم سن تھیں بھی تو اُنہیں تو اور زیادہ پوچھنا چاہیئے
تھا کیونکہ بھلے بُرے کا زیادہ شعور نہ ہونے کی بناء پر وہ مصلحت
اندیش نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ وجہ دریافت کرنے میں مصلحت
نہ سمجھ کر خاموش ہو جاتیں۔ ان میں تو بے چینی اور بے صبری زیادہ
ہونی چاہیئے تھی۔ کم سن ہونے کے معنے یہ تو نہیں کہ بچہ کسی کی محبت
اور شفقت کو بھی نہ سمجھے۔ دوسروں کی محبت اور شفقت کو تو دودھ
پیتے بچے تک خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا جب انہوں نے آپ کی بے توجہی
بے اعتنائی اور بے رخی کو محسوس کر لیا تھا تو ان کے اضطراب اور
بے چینی کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ بلا تاخیر فوراً اس کی وجہ معلوم
کرنا چاہتیں۔

(۱۶) آگے چل کر فرمایا گیا ہے کہ "جب حضرت عائشہ صدیقہؓ کو

بیماری سے افاقہ ہوا تو وہ ایک رات قضائے حاجت کے لئے نکلیں
--------حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ حضرت ام مسطحؓ بھی
قضائے حاجت کے لئے نکلیں --------راستہ میں حضرت
ام مسطحؓ کا پاؤں چادر میں الجھ کر پھسل گیا۔ وہ کہنے لگیں "مسطح ہلاک
ہو" ـــــ اردو کی ایک ضرب المثل ہے۔ "ماروں گھٹنا، پھوٹے
آنکھ" یہ ضرب المثل شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے کہی گئی ہے۔
قصور تو اپنا یا اپنی چادر کا کہ اس میں ان کا پاؤں الجھ کر پھسل گیا
اور شامت آ گئی غریب حضرت مسطحؓ کی کہ والدہ صاحبہ نے ان
کو کوسنا شروع کر دیا۔ شاید وہ اُدھار ہی کھائے بیٹھی تھیں
کہ کچھ بات ہو اور وہ یہ کہانی اُگلیں۔ بات بے بات جب وہ اُگلنے
کے لئے اُدھار ہی کھائے بیٹھی تھیں تو پورے ایک ماہ تک ان سے
صبر کیسے ہوا۔ مزید تعجب اس پر ہے کہ وہ مسطحؓ کو کوس رہی ہیں
اصل سرغنہ یعنی عبداللہ ابن ابی کو نہیں کوستیں۔ اس کا نام کوئی
نہیں لیتا۔ وہ مسطحؓ کو اس انداز سے کوس رہی ہیں۔ گویا سارا
طوفان اسی کا اٹھایا ہوا ہے حالانکہ طوفان عبداللہ ابن ابی کا
اٹھایا ہوا تھا۔ یہ غریب تو اس کے طوفان میں بہہ گئے تھے۔

پھر بتایا گیا ہے کہ "گھروں میں اس وقت تک بیت الخلاء
نہیں بنائے گئے تھے۔ عورتیں صرف رات کو قضائے حاجت
کے لئے باہر جایا کرتی تھیں۔ قدیم عربوں سے یہی دستور چلا آ رہا
تھا۔" اس سے ظاہر ہے کہ قضائے حاجت کے لئے عورتیں باہر ہی
جایا کرتی تھیں۔ قضائے حاجت کا تقاضا تو حضرت عائشہؓ کو

بیماری میں بھی ہوتا ہو گا، کیونکہ بیماری میں آدمی کا بول و براز
تو بند نہیں ہو جاتا اور جیسا کہ آج بھی ہمارے ہاں چھوٹے چھوٹے
دیہاتوں میں عورتیں قضائے حاجت کے لئے باہر جاتی ہیں اور
دو چار عورتیں مل کر ساتھ جاتی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ
عنہا اس سے پہلے بھی باہر جاتی رہی ہوں گی اور دو چار عورتوں کے
ساتھ ہی جاتی رہی ہوں گی جیسا کہ بیماری کے بعد وہ ام مسطحؓ
کے ساتھ گئی ہیں۔ تو حیرت ہے کہ کسی عورت نے آج تک یہ واقعہ
حضرت عائشہؓ سے بیان نہیں کیا۔ حالانکہ عورتوں کی فطرت ایسی
ویسی بات کو ضبط کرنے کی نہیں ہوتی بلکہ عورتیں زیادہ تر پیٹ کی
ہلکی ہوتی ہیں، وہ تو باتوں کو اگلنا ہی جانتی ہیں جیسا کہ ام مسطحؓ
کے سلسلہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ محض بات کو اُگلنے کی خاطر وہ اپنا
پاؤں پھسلنے پر اپنے بیٹے مسطحؓ کو کوسنے لگیں کہ اس بہانے وہ بات
کو اُگل سکیں۔ حالانکہ پاؤں پھسل جانے پر غریب مسطحؓ کو کوسنے
کا کوئی تک نہیں تھا۔

(۱۷) آگے بیان ہوا ہے کہ "حضرت ام مسطحؓ نے تہمت کا سارا حال
سنایا، یہ سن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بیماری بڑھنی شروع
ہو گئی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف
لائے۔ آپؐ نے سلام کیا پھر پوچھا "تم کیسی ہو؟" حضرت عائشہؓ
نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے والدین کے ہاں جانے
کی اجازت مانگی تاکہ ان سے اس خبر کا مزید حال معلوم کریں"
حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ نہ بھول جائیے

کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہونے کے باوجود
ایک عورت ہیں اور پاک دامن اور پاکباز عورت ہیں۔ تہمت کا
سارا حال ام مسطحؓ سے ان کو معلوم ہو چکا ہے۔ پورے ایک مہینہ
سے وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تیور بدلے ہوئے دیکھ رہی
ہیں۔ آپ کی بے اعتنائی اور بے رخی سے ان کے دل پر کیا کچھ گزر
رہی ہوگی ظاہر ہے۔ ایک عورت کی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے
اس قدر ضبط اور تحمل کی توقع ان سے نہیں کی جا سکتی کہ وہ پھٹ
نہ پڑتیں اور بجائے رونے دھونے کے صرف اپنے والدین کے
ہاں جانے کی اجازت مانگتیں۔ جو کچھ راوی نے ان کے متعلق والدین
کے ہاں جانے کے بعد بیان کیا ہے وہ کچھ ام مسطحؓ کے بیان
کے بعد ہو جانا چاہیئے تھا۔

(۱۸) راوی کہتا ہے کہ والدین کے گھر پہنچنے کے بعد "اتنے میں ایک
انصاری عورت آئی اور کہنے لگی۔ اللہ فلاں شخص کے ساتھ برائی
کرے۔ حضرت ام رومان نے کہا "تم نے یہ کیا بات کہی" اس نے
کہا کہ "میرا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے" حضرت
ام رومانؓ نے پوچھا "آخر کیا قصہ ہے" (اس کی کیا تفصیل ہے؟)
اس عورت نے پورا قصہ بیان کیا۔ جب وہ بیان کر چکی تو حضرت
عائشہ صدیقہؓ نے پوچھا "کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی
یہ بات سنی ہے؟" اس نے کہا "ہاں" حضرت عائشہؓ نے پوچھا
"کیا ابوبکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے؟" اس نے کہا "ہاں" یہ سن کر
حضرت عائشہ صدیقہؓ بے ہوش ہو کر اپنی والدہ پر گر پڑیں۔" یہ ساری

داستان بھی محض داستان اور وہ بھی من گھڑت داستان ہی
معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ام مسطحؓ حضرت عائشہؓ سے تہمت کی
ساری داستان بیان کر چکی تھیں۔ حضرت عائشہؓ جب والدین
کے ہاں آئی ہیں تو انہوں نے ام مسطحؓ کی باتیں اپنی والدہ کو
سنا دی تھیں اور یہ سب باتیں سننے کے بعد ہی انہوں نے حضرت
عائشہؓ کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ایسی عورتیں بہت کم ہیں
جو خوبصورت ہوں، کسی محبت کرنے والے شوہر کے پاس ہوں،
پھر ان کی سوکنیں بھی ہوں اور انہیں تہمت نہ لگائی جائے"۔ جس
سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کو پوری کہانی
معلوم تھی یا معلوم ہو گئی تھی۔ لیکن انصاری عورت کے آنے پر
ام رومانؓ بالکل بے خبر بن جاتی ہیں اور خود اس انصاری عورت
سے پوچھنے لگتی ہیں کہ آخر قصہ کیا ہے؟ پھر حضرت عائشہؓ کا اس
سے یہ سوال کہ "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ بات
سنی ہے؟" "کیا ابوبکرؓ نے بھی یہ بات سنی ہے" محض تجاہل
عارفانہ معلوم ہوتا ہے۔ کیا اتنا بڑا حادثہ پیش آجانے کے بعد
ماں اور باپ میں کبھی اس کا ذکر اذکار نہیں آیا تھا کہ ام رومانؓ
حضرت عائشہؓ کو بتا دیتیں کہ ابوبکرؓ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ
وسلم نے یہ بات سن لی ہے۔ اور کیا وہ خود پورے ایک مہینہ سے
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیور بدلے ہوئے اور آپ کی
بے اعتنائی اور بے رخی نہیں دیکھ رہی تھیں کہ اب انہیں یہ بھی
پوچھنے کی ضرورت پیش آ گئی کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

بھی یہ بات سنی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اتنی کودن اور غبی تو کبھی بھی نہیں تھیں۔ پھر یہ انصاری عورت بیان کر رہی ہے کہ اس کا بیٹا بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہے مگر سزا پانے والوں میں اس کا کہیں نام نظر نہیں آتا۔ آگے چل کر جب اسی روز آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے ہیں اور حضرت عائشہؓ کو سخت لرزہ سے بخار چڑھا ہوا ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "شاید تہمت کی خبر سن کر بخار آگیا ہے؟" تو حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ہاں"، جس کے معنے یہ ہیں کہ ام رومان رضی اللہ عنہا کو تہمت کی ساری داستان معلوم تھی۔ ورنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح بات نہ فرماتے اور ام رومان رضی اللہ عنہا اس طرح جواب نہ دیتیں۔

(۱۹) آگے اس داستان کا وہ افسوسناک حصہ آرہا ہے جس پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔ یعنی "پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ ابن ابی طالب اور اسامہ ابن زیدؓ کو بلایا اور اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں ان سے مشورہ لیا۔ حضرت اسامہؓ نے کہا "وہ آپ کی بیوی ہیں (بھلا ان سے یہ کام کیسے ہو سکتا ہے؟) آپ بدستور انہیں اپنے ہی پاس رکھیئے ہم بجز بھلائی کے ان کے متعلق کچھ نہیں جانتے"۔ حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے معاملہ میں سلامت رہے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں کیا۔ البتہ (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا غم غلط کرنے

کے لئے) یہ عرض کیا "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں (لیکن پہلے) آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی"۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوالیا۔ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا "کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟" حضرت بریرہؓ نے کہا "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں دیکھی جس کی وجہ سے میں عائشہؓ کو تہمت لگا سکوں۔ وہ تو اتنی (بھولی) کمسن لڑکی ہیں کہ آٹا گوندھ کر سو جاتی ہیں۔ پلی ہوئی بکری آکر کھا جاتی ہے۔ ایک شخص نے اُنہیں دھمکا کر کہا (دوسری روایات میں تصریح ہے کہ یہ حضرت علیؓ تھے) کہ "سچ سچ بیان کرو" حضرت بریرہؓ نے کہا کہ "سبحان اللہ، میں تو عائشہؓ کو اس طرح بے عیب جانتی ہوں جس طرح جوہری خالص سرخ سونے کی ڈلی کو بے عیب جانتا ہے"۔

اس افسانہ میں سب سے پہلی بات جو محل تأمل ہے وہ یہ ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وزیر تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ تھے۔ تمام اہم معاملات میں آپ ان ہی سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ ان دونوں کے بعد اگر کوئی اہم شخصیت تھی تو وہ حضرت عثمانؓ کی تھی اس سے پہلے کسی اہم معاملے میں حضرت اسامہ ابن زیدؓ اور حضرت علیؓ سے مشورہ فرمانا ثابت نہیں ہے۔

تو اس اہم معاملہ میں آپ نے نہ حضرت ابوبکرؓ کو یاد فرمایا نہ حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کو۔ یاد فرمایا تو حضرت اسامہؓ اور حضرت علیؓ کو یاد فرمایا۔ یہ آپ کی عام عادت کے خلاف ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی تو بیٹی کا معاملہ تھا اس لئے ان کو یاد نہیں فرمایا۔ لیکن حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو یاد نہ فرمانا انتہائی حیرت کا باعث ہے۔

(۲۰) دوسری اہم اور قابل استعجاب بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حضرات سے اپنی بیوی حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ لیا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو قطعاً منشائے الٰہی اور تقاضائے خداوندی کے خلاف ہے۔ حق تعالیٰ تو عام مسلمانوں سے یہ تقاضا کر رہے ہیں کہ:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا اَفَضْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝ وَلَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۖ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (۲۴/۱۴-۱۷)

ترجمہ: اور (اے مسلمانو!) تم پر دنیا و آخرت میں اگر اللہ کا فضل اور احسان نہ ہوتا تو جس بات کا تم نے چرچا کیا ہے اس کی وجہ سے تمہیں بڑا عذاب پکڑ لیتا۔ یاد کرو جب تم اسے اپنی زبانوں سے مزے لے لے کر نقل کر رہے تھے اور اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جس کا تمہیں کوئی علم نہیں تھا۔ اور تم اُسے معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی بات تھی۔ جونہی تم نے اس بات کو سنا تم نے یہ کیوں نہ کہا کہ ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے منہ سے نکالیں۔ خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے۔ یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔ خدا تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ تم دوبارہ ایسا کام کبھی نہ کرو اگر تم مؤمن ہو۔

غور تو فرمائیے کہ عام مسلمانوں سے خدائے تعالیٰ کے اس مطالبہ کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ انہیں بات کو سنتے ہی یہ کہنا چاہیئے تھا کہ "ہمیں یہ بات جائز نہیں کہ ہم اسے منہ سے نکالیں۔ خدا کی ذات بے عیب اور پاک ہے۔ یہ تو یقیناً بہت بڑا بہتان ہے"۔ جبکہ خود اللہ کا رسول بھی اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ اس رسول الٰہی کا ایک جلیل القدر صحابی (حضرت علیؓ) بھی درپردہ اس کی تائید میں ہے۔ اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو نعوذ باللہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ سے تو وہ انصاری صحابی ہی اچھے رہے اور خدا کے اس معیار پر پورے اترے کہ تہمت کی بات سنتے ہی انہوں نے کہا "اے اللہ تو پاک

ہے۔ ہمارے لئے یہ زیبا نہیں کہ ہم یہ بات منہ سے نکالیں۔ اے اللہ تو پاک ہے۔ یقیناً یہ بہتان عظیم ہے۔" راوی نے یہ بات کہہ کر نعوذ باللہ حضرت علیؓ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں جو تقدس اور احترام پایا جاتا ہے اسے انتہائی تکلیف دہ حد تک ٹھیس پہنچائی ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالک

(۲۱) تیسرے یہ زبردستی کی بات بھی قابلِ ملاحظہ ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔" اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔ آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔" اور پھر اس کے بعد یہ کہ "ایک شخص نے حضرت بریرہؓ کو دھمکا کر کہا کہ سچ سچ بیان کرو" بیہقی اور طبرانی کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص حضرت علیؓ تھے، اور انہوں نے نہ صرف بریرہؓ کو دھمکایا بلکہ مارا پیٹا بھی تھا تاکہ وہ حضرت علیؓ کے خیال کے مطابق صحیح صحیح بات بتا دیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود راوی کا دعویٰ یہ ہے کہ "حضرت علیؓ بھی حضرت عائشہؓ صدیقہ کے معاملہ میں سلامت رہے (یعنی کسی قسم کا شبہ نہیں کیا)۔" سبحان اللہ! یہ اچھی سلامتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیوی کی علیحدگی کے سلسلہ میں مشورہ فرما رہے ہیں اور حضرت علیؓ یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی آپ کے لئے ان کے علاوہ بہت عورتیں ہیں۔" یعنی آپ میری ماں کو طلاق دیدیجئے اور کوئی دوسری عورت گھر میں لے

آئیے اگر سلامتی اسی کا نام ہے تو پھر تہمت میں ملوث ہونا کسے کہتے ہیں۔ اور پھر یہ مشورہ حضرت علیؓ دے رہے ہیں جو ماشاء اللہ حافظ قرآن ہیں۔ قرآن کے بہت بڑے عالم ہیں۔ جنہوں نے (بتایا جاتا ہے کہ) نزول کی ترتیب کے مطابق قرآن کریم کو مرتب بھی فرمایا تھا۔ نزول کا اتنا بڑا عالم اور یہ کہہ رہا ہے کہ "اے اللہ کے رسول اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں کی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں۔" گویا اسے قرآن کی یہ آیت معلوم ہی نہیں:۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ

(۳۳/۵۲)

ترجمہ:۔ (اے پیغمبر اسلام!) آپ کے لئے اس کے بعد عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ یہ حلال ہے کہ ان ازواج کے بدلے آپ دوسری ازواج بدل لیں خواہ ان کا حسن آپ کو کتنا ہی پسند آئے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا آیت سورۃ احزاب کی ہے اور سورۃ احزاب غزوۂ احزاب (خندق) کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ اس کی آیات سے ظاہر ہے۔ اور غزوۂ احزاب (خندق) ۴ھ میں واقع ہوا ہے۔ جبکہ غزوۂ بنی المصطلق جس میں واقعۂ افک پیش آیا ہے (جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے) ۵ھ کا واقعہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ۴ھ میں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے لئے مزید شادیاں ممنوع قرار دی جا چکی تھیں اور ایک بیوی کی جگہ (اُسے طلاق دے کر) دوسری بیوی کر لینا بھی حرام قرار دے دیا گیا تھا۔ اس کے پورے ایک سال بعد حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمائیں کہ "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ پر کوئی تنگی نہیں فرمائی۔ آپ کے لئے ان کے علاوہ اور بہت عورتیں ہیں"۔ جبکہ حضرت علیؓ قرآن کریم کو ترتیب نزول کے مطابق مرتب کرنے والے بھی شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر ترتیب نزول کی معلومات حضرت علیؓ کو ایسی ہی تھیں تو جیسا کچھ قرآن کریم کو انہوں نے مرتب فرمایا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ شاید اسی وجہ سے اُمت میں وہ مقبول نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ خود شیعانِ علیؓ کی درس گاہوں میں بھی بار نہ پا سکا ورنہ آج کہیں تو اس کا سراغ ملتا۔

ہمارے نزدیک عائشہؓ دشمنی میں یہ حضرت علیؓ کو مطعون کرنے کی سازش ہے کہ وہ ایسا بے ہودہ مشورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دے رہے ہیں۔ یہ حضرت علیؓ کے ذمہ بہت بڑا بہتان ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مفروضہ ہی غلط ہے کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کوئی مشورہ فرما سکتے تھے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے بمنزلہ اولاد ہیں۔ حضرت علیؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عمر میں پورے تیس سال چھوٹے اور آپ ہی کے پروردہ تھے اور حضرت اسامہؓ حضرت زیدؓ کے بیٹے ہیں جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے یعنی پوتے کی جگہ تھے مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایک بیٹے

اور پوتے سے مشورہ فرمایا۔ ایسے معاملات میں اولاد سے مشورہ نہیں لیا جاتا بلکہ اپنے ہم عمروں اور ہم سنوں سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی یہ کوتاہی بعض راویوں کو محسوس ہوئی۔ چنانچہ قسطلانی نے شرح بخاری میں موافقات فاروق اعظمؓ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے صاحب الریاض کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے بارہ میں حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمایا تھا جب اہلِ افک نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی تو حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! عائشہؓ سے آپ کا نکاح کس نے کرایا تھا۔ آپ نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ نے تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے پروردگار نے آپ کے ساتھ اس معاملہ میں گھپلا کیا سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ چنانچہ قرآن کریم میں بھی یہی الفاظ نازل ہوئے۔ بہرحال حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کا ایک امکان ہو سکتا تھا لیکن حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے تو مشورہ فرمانے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک چونکہ واقعۂ افک کی یہ کہانی محض ایک من گھڑت داستان ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اس لئے ہم حضرت عمرؓ سے مشورہ فرمانے کی بات کو بھی موضوع سمجھتے ہیں۔

(۲۲) چوتھی بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ کو مشورہ کے لئے طلب فرمایا تھا اُنہیں

تھا نیدار تو نہیں بنایا تھا۔ حضرت علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں تھا نیدار بننے کا کیا حق تھا کہ وہ حضرت بریرہؓ کو ڈانٹنا، دھمکانا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیں۔ یہ تو:

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (۴۹/۱)

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیشقدمی نہ کرو۔

اور

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ۔ (۴۹/۲)

ترجمہ: نبی کی آواز پر اپنی آوازیں بلند نہ کرو۔

کی صریح خلاف ورزی اور سخت ترین گستاخی اور سوءِ ادبی شمار کی جائیگی۔ تعجب ہے راوی نے اس کی جسارت کیسے کی کہ حضرت علیؓ کے خلاف اس قسم کی بہتان طرازی کرے۔

(۲۳) مذکورہ بالا حصہ کے سلسلہ میں پانچویں اور آخری کاٹنے کی بات یہ ہے کہ راوی نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا کہ "آپ خادمہ سے تو پوچھیں۔ وہ آپ کو صحیح بات بتائے گی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خادمہ کو جن کا نام بریرہؓ تھا بلوایا۔ پھر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔ کیا تم نے عائشہؓ کی کبھی کوئی ایسی بے جا حرکت دیکھی ہے جو تمہیں شک میں ڈالتی ہو؟" الخ "اس میں حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ کی خادمہ بتایا گیا ہے۔ کیوں کہ حضرت بریرہؓ

دراصل ایک لونڈی تھیں اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد فرما دیا تھا۔ اور اس کے بعد وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں رہنے لگی تھیں چنانچہ اس انداز سے ان کا نام لیا گیا ہے گویا وہ تو حضرت عائشہؓ کے گھر میں ہر وقت رہتی تھیں اور ہر بات سے واقف تھیں۔ لہٰذا وہ صحیح صحیح بات بتادیں گی۔ حضرت علیؓ ان کو دھمکاتے بھی ہیں کہ سچ سچ بیان کرو۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت بریرہؓ کا حضرت عائشہؓ کے گھر سے کسی قسم کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ چنانچہ علامہ قسطلانیؒ شارح بخاری فرماتے ہیں کہ "یہاں خادمہ یا لونڈی کا نام بریرہؓ بیان کرنا بہت مشکل سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ قصۂ افک حضرت بریرہؓ کو خریدنے اور ان کو آزاد کرنے سے بہت پہلے کا ہے۔ کیونکہ واقعۂ افک ۶ھ یا ۴ھ میں (باختلاف الاقوال) پیش آچکا تھا۔ اور حضرت بریرہؓ کو آزاد کرنے کا واقعہ فتح مکہ کے بعد ۹ھ یا ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ اسی واسطے زرکشی نے کہا ہے کہ لونڈی کا نام بریرہ کسی راوی نے بعد میں بڑھا دیا ہے۔ یہ کوئی اور باندی ہوگی۔ لیکن شیخ تقی الدین سبکی نے اس کے کئی جواب دیئے ہیں۔ جن میں سب سے اچھا جواب یہ ہے کہ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت ان کو خریدنے سے پہلے بھی کرتی ہوں گی۔" (قسطلانی شرح بخاری ص ۲۹۲ ج ۷)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی زرکشی کا یہ قول نقل کیا ہے اور بتایا

ہے کہ زرکشی نے یہ بات حافظ ابن القیم حنبلیؒ سے لی ہے کیونکہ انہوں نے بھی کہا ہے کہ باندی کا نام بریرہ بیان کرنا وہم ہے جو کسی راوی کو ہو گیا ہے۔ (فتح الباری ص ۸۳/۱۲)

رہا شیخ تقی الدین سبکیؒ کا قیاسی جواب سو وہ بہت کمزور ہے۔ حضرت بریرہؓ ایک باندی تھیں۔ وہ اپنی آزادی کی خواہاں تھیں۔ کیوں کہ وہ جن لوگوں کی باندی تھیں وہ لوگ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش نہیں آتے تھے اور ان سے زیادہ خدمت لیتے تھے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ان کو خرید کر آزاد کر دے تو انہیں اس پر اصرار تھا کہ ولاء انہی کے لئے ہو گا یعنی ضرورت پڑنے پر وہ پھر بھی ان سے خدمت لینے کا خود کو حقدار سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اگر حضرت بریرہؓ مر گئیں تو وارث بھی وہی ہوں گے۔ غرض یہ کہ اتنے حریص اور بخیل مالکوں سے ان کا واسطہ تھا، اسی لئے وہ حضرت عائشہؓ کے پاس آئیں اور اپنی دکھ بھری داستان انہیں سنائی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ ان کے شرط کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ولاء اسی کے لئے ہو گا جو ان کو آزاد کرے گا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے ترس کھا کر ان کو خرید کر آزاد کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ توقع عبث ہے کہ وہ دوسروں کی لونڈی ہوتے ہوئے حضرت عائشہؓ کی خدمت کرتی ہوں گی اور ان کے مالک ان کو اس کی اجازت دیتے ہوں گے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت گذاری کرتی رہیں اور ان کے گھر میں ہر وقت پڑی رہیں کہ ان کے خلوت

وجلوت کی راز آشنا بن جائیں اور حضرت عائشہؓ کے متعلق صحیح صحیح بات بتا سکیں ہمیں زرکشی کے اس قول سے مکمل اتفاق ہے کہ حضرت بریرہؓ کا نام اس روایت میں لینا غلط ہے اور سراسر غلط ہے۔

(۲۴) اس کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ "اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر تشریف لے گئے۔ آپ نے فرمایا کہ "کون ہے جو اس شخص کے مقابلہ میں میری مدد کر سکے جس نے میری بیوی کے معاملہ میں مجھے سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ اللہ کی قسم میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں کوئی اور گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔" یہ سن کر بنو عبد اشہل کے بھائی حضرت سعد ابن معاذؓ کھڑے ہوئے اور کہا "یا رسول اللہ! میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے"۔ یہ سن کر قبیلہ خزرج کے سردار سعد ابن عبادہؓ کھڑے ہوئے۔ یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے۔ قومی حمیت اور غرور نے انہیں اُبھارا۔ کہنے لگے تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔ یہ سن کر حضرت

کرنے میں کبھی دائیں کو جھکتا ہے اور کبھی بائیں کو، مگر فیصلہ نہیں کر پاتا۔

(۲۵) دوسری بات جو اس روایت کو قابل رد قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شریف آدمی اپنے گھریلو معاملات کو یوں قوم کی چوپال میں پیش نہیں کیا کرتا جس طرح یہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو برسر ممبر ایک بے ہودہ بات کا چرچا کرتا ہوا اور قابلِ شرم بات کو اچھالتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ہمیں تو آپ نے قرآن کریم کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی ہے کہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

(۲۴/۱۹)

ترجمہ:۔ یقیناً جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں بے حیائی کی کوئی بات پھیلے ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی اس واضح ہدایت کے علی الرغم ایسا کر سکتے تھے کہ آپ برسر ممبر اس بات کا چرچا فرماتے۔ صحابہ کے ان بیانات کو سامنے رکھئے کہ آپ میں شرم وحیا اس قدر تھی کہ کنواری لڑکیوں میں بھی نہیں ہوتی۔ آپ کسی کی موجودگی میں جنگل میں قضائے حاجت اور پیشاب تک

کہ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر آپ کے متعلق کیا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اس قدر یقین تھا جس کا آپ اب مظاہرہ فرما رہے ہیں تو اس سے پہلے وہ سب مشورے اور تحقیقات کیوں کی جا رہی تھی کس نے کہا تھا کہ آپ بیوی پر شبہ کریں اور اس کو الگ کرنے کی سوچیں۔ یہی تو وہ باتیں ہیں جن کے سہارے مستشرقین اور دیگر مذاہب کے اہل قلم ہر طرح کی ہرزہ سرائیوں پر اتر آتے ہیں۔ لیکن یہ خود ہم ہی ہیں جو ان لوگوں کو ان کی یاوہ گوئیوں کے لئے مواد فراہم کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ ہم آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسا قابل اعتراض تصور قائم نہیں کر سکتے ہم سمجھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات اس سے کہیں بلند ہے کہ آپ کو ظن وتخمین کی وادیوں میں یوں بھٹکتا ہوا اور وہم وگمان کے ریگستانوں میں یوں سرگرداں ہوتا ہوا پیش کیا جائے آپ علم ویقین کے اس بلند مقام پر فائز تھے کہ آپ اہم معاملات میں دوٹوک اور حتمی فیصلے فرمانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس میں آپ کو نہ کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف ہوتا تھا اور نہ کسی مصلحت اندیشانہ رکاوٹ سے سابقہ پڑتا تھا۔ کیا کوئی شخص تصور بھی کر سکتا ہے کہ دنیا کے اتنے عظیم ترین انقلاب کا قائد جو چند سال میں دنیا کی بساط الٹ کر رکھ دیتا اور ایک نئی دنیا تعمیر کر کے دکھا دیتا ہے وہ بات کی تہ تک پہنچنے اور بروقت صحیح فیصلے کرنے میں اس قدر کوتاہ دست اور کمزور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ایک گھریلو معاملہ کا فیصلہ

اسید ابن حضیرؓ کھڑے ہوئے۔ یہ حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ حضرت اسیدؓ نے حضرت سعد ابن عبادہؓ سے کہا "تم جھوٹے ہو۔ اللہ کی قسم ہم اسے مار ڈالیں گے۔ تم منافق ہو کہ منافقوں کی طرف سے جھگڑتے ہو" اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلے اتنا بھڑکے کہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ممبر پر ہی تھے۔ آپ ان کو چپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ چپ ہو گئے۔"

داستان کا یہ حصہ بھی مختلف وجوہ سے قابل ردّ ہے۔ سب سے پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا کردار انتہائی متضاد بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ حضرت علیؓ اور حضرت اسامہؓ سے بیوی کی علیحدگی کے متعلق مشورہ فرما رہے ہیں۔ حضرت زینبؓ اور حضرت بریرہؓ سے حضرت عائشہؓ کے کیریکٹر کے متعلق تحقیقات میں لگے ہوئے ہیں۔ جس سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ حضرت عائشہؓ کے متعلق خاصے مشکوک ہیں حتیٰ کہ ان کو طلاق دیدینے اور اپنے سے علیحدہ کر دینے پر آمادہ ہیں۔ لیکن یہاں برسر ممبر سارے صحابہؓ کے سامنے اللہ کی قسم کھا کر یہ بیان دے رہے ہیں کہ "میں اپنی بیوی میں سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں جانتا اور جس شخص کا نام اس سلسلہ میں انہوں نے لیا ہے۔ اس کے متعلق بھی سوائے بھلائی کے میں اور کوئی گمان نہیں کر سکتا۔ وہ میری عدم موجودگی میں کبھی میرے گھر نہیں آیا۔" ذرا دیانت داری کے ساتھ غور فرمائیے

نہیں کرتے تھے۔ تعمیر کعبہ کے وقت (نبوت سے بہت پہلے) جب پتھر ڈھو ڈھو کر لا رہے تھے تو چچا حضرت عباسؓ نے تہمد کھول کر کندھے پر رکھ دینا چاہا کہ اس پر پتھر رکھ کر لاؤ تو خود کو ننگا دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ کیا اس قدر شریف اور شرم و حیا کا پُتلا خاص اس معاملہ میں اتنا لاابالی ہو گیا کہ اپنے گھر کی ایک افسوسناک بات کو یوں علی الاعلان برسر ممبر بیان کر کے اپنی ملّت سے فریاد کر رہا اور اس سے مدد کی بھیک مانگ رہا ہے۔ استغفر اللہ!

(۲۶) تیسری اہم ترین بات اس روایت میں یہ ہے کہ حضرت سعد ابن معاذؓ کو بتایا گیا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد پر کھڑے ہوئے اور یوں گویا ہوئے "یا رسول اللہ! میں آپ کی مدد کروں گا۔ اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے۔" حالانکہ حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کا انتقال غزوۂ بنی المصطلق سے ایک سال پہلے غزوۂ خندق میں ۵ھ میں ہو چکا تھا۔ چنانچہ علامہ قسطلانیؒ شارح بخاری تحریر فرماتے ہیں کہ "یہاں سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بڑا مشکل سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ واقعۂ افک ۶ھ غزوۂ مریسیع میں پیش آیا تھا اور حضرت سعدؓ کا انتقال اس تیر لگنے کی وجہ سے ہوا ہے جو انہیں غزوۂ خندق میں ۵ھ میں لگا تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا

ہے کہ غزوۂ مریسیع کے بارہ میں مؤرخین و محدثین کے مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں چنانچہ بخاری ہی میں موسیٰ ابن عقبہ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ وہ غزوہ ۴ھ میں پیش آیا تھا۔ ایسے ہی خندق بھی۔ اور ابن اسحٰق نے کہا ہے کہ غزوۂ مریسیع شعبان میں اور غزوۂ خندق شوال میں پیش آیا تھا تو اگر دونوں غزوے ایک ہی سال میں ہوئے ہوں تو سعد ابن معاذؓ کا دونوں میں موجود ہونا ناممکن نہیں ہے۔ لیکن موسیٰ ابن عقبہ سے جو کچھ صحیح اسناد سے نقل کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ غزوۂ مریسیع ۵ھ میں پیش آیا ہے۔ پس بخاری میں جو کچھ نقل ہو گیا ہے (یعنی اس وقت حضرت سعد ابن معاذؓ کا موجود ہونا) اس کو محدثین نے سبقتِ قلم پر ہی محمول کیا ہے۔

(قسطلانی شرح بخاری ص۲۹۳ ج۷)

حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے انہوں نے حافظ ابن عبدالبرؒ۔ ابن حزمؒ۔ ابن العربیؒ قرطبیؒ وغیرہ محدثین سے یہی نقل کیا ہے کہ سعد ابن معاذ کا ذکر اس قصہ میں قطعاً غلط اور وہم ہے۔

(فتح الباری ص۸۷ ج۷)

اس سے ظاہر ہے کہ ۵ھ میں جب (بقول راوی) واقعۂ افک پیش آیا ہے اس سے ایک سال پہلے حضرت سعد ابن معاذؓ وفات پا چکے تھے۔ لہٰذا افک کے واقعہ میں حضرت سعد ابن معاذؓ کا تذکرہ غلط ہے۔ موسیٰ ابن عقبہ کے متعلق تو خود علامہ قسطلانی

نے واضح کر دیا ہے کہ ان سے غزوۂ مریسیع کا ۴ھ میں پیش آنا صحیح سند سے ثابت نہیں ہے۔ رہ گئے ابن اسحٰق تو ان کے متعلق ہم اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق امام مالکؒ کا یہ ارشاد نقل کیا جاتا ہے کہ انہ دجال من الدجاجلة (وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے) تو ان جیسے حضرات کے بیانات میں مشہور اور راجح اقوال کے خلاف پناہ ڈھونڈھنا محض ایک غلط بات کو زبردستی صحیح باور کرانے کی ایک ناکام کوشش ہی ہے۔ اس کے بعد اس روایت کے متعلق بجز اس کے موضوع ہونے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ نرم سے نرم بات جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ روایت امام محمد بن مسلم بن شہاب زہری کی طرف غلط طور پر منسوب ہو گئی ہو۔ کیونکہ رواۃِ حدیث میں زہری نام سے روایت کرنے والے ایک محمد بن مسلم بن شہاب زہری ہی نہیں ہیں بلکہ اسماء رجال کی کتابوں مثلاً تہذیب التہذیب اور لسان المیزان وغیرہ کے مطالعہ سے ایسے ایک سو بیس راویوں کا ذکر ملتا ہے جو زہری ہی کے نام سے موسوم تھے۔ ان میں کچھ وضاع اور کذاب بھی تھے۔ پھر زہری کے شاگردوں میں بھی ایسے وضاع اور کذاب موجود تھے جو زہری کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے من گھڑت حدیثوں کو اس کے نام سے مشہور کر دیتے تھے۔

(۲۷) اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ تردید بات یہ ہے کہ روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ نے ناروا رویہ اختیار فرمایا۔ چنانچہ روایت کا بیان یہ ہے کہ "یہ سن کر قبیلۂ خزرج کے سردار حضرت سعد ابن عبادہؓ کھڑے ہوئے یہ بہت اچھے آدمی تھے لیکن اس موقعہ پر پھسل گئے۔ قومی حمیت

اور عزور نے اُنہیں اُبھارا کہنے لگے تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہو گا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے۔"

یہ حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے خلاف انتہائی گھناؤنا الزام ہے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ قبیلہ خزرج کے سردار ہیں اور قبیلہ خزرج مدینہ منورہ میں انصار کا ایک مقتدر قبیلہ تھا۔ واضح رہے کہ بیعت عقبہ اولیٰ میں مدینہ منورہ سے بنو خزرج کے لوگ ہی حاضر ہوئے تھے اور بیعت عقبہ ثانیہ میں بھی انہی کی اکثریت تھی۔ بنو اوس کے تھوڑے لوگ اس بیعت میں شریک تھے اصل ہجرت کے داعی قبیلہ خزرج ہی کے لوگ تھے۔ بنو خزرج میں ہی حضرت سعد ابن عبادہؓ بھی تھے۔ لہٰذا حضرت سعد ابن عبادہؓ قدیم الاسلام شخصیت ہیں۔ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک تھے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مدینہ منورہ چلے آنے کی دعوت دینے والوں میں شامل تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے جو بارہ نقیب مقرر فرمائے تھے ان میں قبیلہ بنی ساعدہ کے لئے آپ نے نذر ابن عمروؓ کے ساتھ آپ کو بھی نقیب مقرر فرمایا تھا۔ تمام سیرت اور تاریخ کے ائمہ اس پر متفق ہیں۔ عرض یہ کہ مدینہ منورہ میں انصار کے دو بڑے قبیلے تھے اَوس اور خزرج۔ اَوس کے مقابلہ میں خزرج قبیلہ زیادہ مقتدر سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مدینہ منورہ کے باشندوں نے یہ طے کیا ہوا تھا کہ پورے مدینہ کا سردار عبداللہ ابن ابی ابن سلول کو بنا دیا جائے۔ اس کی

تاجپوشی طے ہو چکی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور عبداللہ ابن ابی کی سرداری کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ عبداللہ ابن ابی ابن سلول قبیلہ بنی خزرج ہی کا ایک سردار تھا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ بنو خزرج کے اقتدار پر پورا مدینہ منورہ اتفاق کر چکا تھا۔ چنانچہ خود بخاری باب مناقب الانصار اور باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب البیوع میں حضرت انسؓ اور سعدؓ سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت سعدؓ بیمار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ راستہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ابی کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے ٹھہر گئے۔ عبداللہ ابن ابی نے کہا۔ تم جو کچھ کہتے ہو یہ اچھی چیز نہیں۔ ہماری مجلس میں آ کر ہمیں تکلیف نہ دیا کرو۔" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہاں سے حضرت سعدؓ کے ہاں پہنچے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ حضرت سعدؓ نے کہا "اے اللہ کے رسول میرا باپ آپ پر قربان ہو جائے۔ آپ درگذر فرمائیے۔ اس کو معاف کر دیجئے۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ پر کتاب نازل کی ہے بے شک اللہ نے جو کتاب آپ پر نازل کی ہے وہ حق کے ساتھ نازل کی ہے اور جو مرتبہ اللہ نے آپ کو دیا ہے وہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس شہر کے لوگوں نے اتفاق کر لیا تھا کہ عبداللہ ابن اُبی کو تاج پہنا کر دستار باندھ دیں۔ لیکن اللہ نے یہ حق سیادت آپ کو عطا فرما دیا اس وجہ سے اس کو حسد پیدا ہو گیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کو

معاف کر دیا۔

(بخاری باب مناقب الانصار وغیرہ)

اس روایت سے علاوہ اس بیان کی تائید کے لئے جو علمائے سیرت و تاریخ نے بیان فرمایا ہے۔ یہ چند باتیں مزید ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) حضرت سعد ابن عبادہؓ قدیم الاسلام تھے۔ کیونکہ یہ واقعہ شروع ہجرت کا ہے۔ جبکہ عبداللہ ابن ابی مسلمان بھی نہیں ہوا تھا۔ بعد میں یہ منافقانہ طور پر اسلام لے آیا تھا۔

(۲) عربوں میں سرداری نظام رائج تو تھا ہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پورا شہر عبداللہ ابن ابی کو سردار بنانے پر اتفاق کر چکا تھا جو ایک خزرجی آدمی تھا۔ لہٰذا بنو خزرج کی قوت و اقتدار بنو اوس کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر مہاجرین کو مدینہ منورہ میں پناہ مل جانا دراصل بنو اوس کے مقابلہ میں بنو خزرج کا زیادہ مرہونِ منت تھا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی دعوت دینے میں بھی بنو خزرج ہی پیش پیش تھے۔

(۳) چونکہ عربوں میں اسلام سے پہلے سرداری نظام ہی رائج تھا اس لئے حضرت سعد ابن عبادہؓ کی قوت اور ان کا اقتدار (جو اپنے قبیلہ کے مسلمہ سردار تھے) ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔

(۴) ابتداء ہجرت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت سعد ابن عبادہؓ کی جو گفتگو نقل ہوئی ہے وہ ان کے راسخ الایمان ہونے اور قومی حمیت و غرور سے بالکلیہ بری ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔[1]

(۵) حضرت سعد ابن معاذؓ نے یہ کہا ہی نہیں تھا کہ ہم اس شخص کو اگر وہ خزرجی ہوا تو قتل کر دیں گے۔ انہوں نے تو یہ کہا تھا کہ "اگر وہ اوس قبیلہ کا آدمی ہے تو میں اس کی گردن اڑا دونگا اور اگر ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے"۔ اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ کا یہ فرمانا "تم جھوٹے ہو۔ واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے۔ اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے"۔ بالکل بے تکا جواب ہے۔ سعد ابن معاذ نے کہا تھا کہ "اگر وہ اوس قبیلہ کا ہوا تو میں اس کی گردن اڑا دوں گا"۔ اس پر سعد ابن عبادہؓ فرما رہے ہیں کہ "اگر وہ تمہاری قوم سے ہوگا تو تم اس کے قتل کو پسند نہیں کرو گے"۔ سعد ابن معاذؓ فرما رہے ہیں کہ "اگر وہ ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے"، اور اس کے جواب میں سعد ابن عبادہؓ فرماتے ہیں "تم جھوٹے ہو، واللہ تم خزرجی کو قتل نہیں کر سکتے اور نہ اس کے مارنے پر قادر ہو سکو گے"۔ "سوال از آسماں جواب از ریسماں" شاید اسی کو کہتے ہیں۔ راوی غالباً یہ چاہتا ہے کہ حضر سعد ابن عبادہؓ

[1] چونکہ مدینہ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانے میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا بڑا ہاتھ تھا اس لئے یہی وجہ ہے کہ شیعوں کو ان سے خصوصی پرخاش ہے اس لئے ہر مخالفت میں انہیں پیش پیش دکھاتے ہیں۔

کے متعلق سامعین یہ تصور قائم کرلیں کہ وہ نہایت، کودن غبی اور انتہائی متعصب اور مغرور انسان تھے۔ ایک جلیل القدر صحابی کے متعلق ہم ایسا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ کے متعلق ایک دوسری روایت میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے اجتماع اور خلافت کے فیصلہ کے بارہ میں ہے۔ اس میں حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت سعد ابن عبادہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو جھڑپ اور بد کلامی ہوئی نیز یہ کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ کو جو اس وقت بخار میں مبتلا تھے۔ لوگوں نے روند ڈالا، کسی کے متنبہ کرنے پر حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا کہ اللہ سعد ابن عبادہؓ کو غارت کرے۔ حضرت سعد ابن عبادہؓ سے یہ فقرہ منسوب کرنا کہ "ایک امیر تم میں سے ہوگا اور ایک امیر ہم میں سے" اور یہ بتانا کہ حضرت سعد ابن عبادہؓ نے آخر وقت تک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت نہیں کی۔ حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ موجودہ روایت ان سے کچھ زیادہ ہی افسوس ناک ہے۔ یہ دوسری روایت بھی حضرت محمد ابن مسلم ابن شہاب زہری کا کارنامہ ہے جو انہوں نے حضرت عمرؓ سے منسوب کرکے نقل فرمائی ہے۔ (دیکھئے بخاری کتاب الحدود) ہمیں افسوس ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ دشمنی میں بے چارے سعد ابن عبادہؓ خواہ مخواہ زد میں آگئے۔ راوی کو باور تو یہ کرانا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا متفقہ

اور اجتماعی انتخاب گویا متنازعہ فیہ تھا اور اس کی حقیقت خدانخواستہ ایک زبردستی اور دھاندلی کی بیعت کی تھی اور اس کے ثابت کرنے کے لئے راوی نے حضرت سعد ابن عبادہؓ کو امت کی نگاہوں میں مطعون کر ڈالا۔

ساتھ ہی اس پر غور فرمائیے کہ سعد ابن عبادہؓ کے ساتھ ساتھ ان کا پورا قبیلہ زد میں آرہا ہے۔ کیونکہ سعد ابن عبادہؓ کی بات کو کاٹنے کے لئے بنو خزرج کا کوئی آدمی کھڑا نہیں ہوا۔ ان کی بات کا جواب دینے کے لئے کوئی اٹھا ہے تو وہ حضرت اسید ابن حضیرؓ ہیں جو پھر قبیلہ اوس ہی کے آدمی اور حضرت سعد ابن معاذؓ کے چچازاد بھائی تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ پورا قبیلہ کا قبیلہ حضرت سعد ابن عبادہؓ ہی کا ہمنوا تھا۔ اور ہم بتا چکے ہیں کہ مدینہ منورہ میں قبیلہ خزرج زیادہ طاقتور اور با اقتدار قبیلہ تھا اگر اس سارے قبیلہ کا یہ حال تھا تو اسلام کے متعلق ہمیں اس دور میں جو خوش فہمیاں ہیں ان کی حقیقت معلوم۔

قرآن کریم تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ فَلَا وَرَبِّكَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ○ (۴/۶۴-۶۵)

ترجمہ :۔ اور ہم نے ہر رسول اسی غرض سے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت و فرمان برداری کی جائے۔ اور اگر وہ جب کبھی اپنے نفسوں پر ظلم کریں۔ اس کے بعد آپ کے پاس چلے آئیں پھر اللہ سے خود بھی استغفار کریں اور رسول بھی ان کے لئے استغفار کرے تو وہ یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائیں گے۔ اے پیغمبر اسلام! آپ کے پروردگار کی قسم ہے وہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تمام باہمی اختلافات و نزاعات میں آپ کو حکم نہ بنالیں۔ پھر جو کچھ آپ فیصلہ فرمادیں اس کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اسے تسلیم کرلیں۔

انصار کے قبیلہ خزرج کے کردار کی جو نقش گری اس روایت میں کی گئی ہے، وہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے۔ اس میں حق تعالیٰ نے قسم کھا کر (فَلَا وَرَبِّكَ) یہ بات بتائی ہے کہ ایسے لوگ مؤمن ہو ہی نہیں سکتے۔ تو کیا قبیلہ خزرج پر فاتحہ پڑھ لی جائے اور تسلیم کرلیا جائے کہ پورا قبیلہ مؤمن نہیں تھا۔ اگر ایسا ہی تھا (العیاذ باللہ) تو سمجھ میں نہیں آتا کہ چند سال کے عرصہ میں انہوں نے قیصر و کسریٰ

کے تخت کس طرح الٹ دیئے اور ایک تہائی معلوم دنیا پر پرچم اسلام کس طرح لہرادیا۔

حضرت سعد ابن معاذؓ نے یہی تو فرمایا تھا کہ "اگر وہ ہمارے بھائی خزرج قبیلہ کا آدمی ہے تو جو حکم آپ دیں گے ہم اس کی تعمیل کریں گے"۔ حضرت سعد ابن معاذؓ کا یہ فرمانا قطعاً قرآنی حکم کے مطابق تھا۔ اس کی تردید میں حضرت سعد ابن عبادہؓ کا وہ کچھ فرمانا جو اُن سے منسوب کیا گیا ہے، قرآنی حکم کے مطابق اپنی بے ایمانی کا کھلا ثبوت مہیا کردینا نہیں تو اور کیا تھا۔

(۲۸) اس کے بعد راوی بیان کرتا ہے "ان دونوں قبیلوں کے اختلاف کی وجہ سے اس دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا"۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر بے بسی اور عاجزی کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کی مرضی اور خوشنودی کے ماتحت ہی فیصلے فرمانے پر مجبور تھے۔ کسی معاملہ کے اپنے حسن و قبح کے مطابق آپ فیصلے نہیں کر سکتے تھے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ۔ (۴/۱۰۵)

ترجمہ :۔ اے پیغمبر اسلام! ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل فرمادی ہے۔ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان جو کچھ خدا نے آپ کو سمجھایا ہے اس کے مطابق فیصلے کریں۔

اور

وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ۔ (۵/۶۷)

ترجمہ:۔ اور اے پیغمبر اسلام! اللہ، لوگوں سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

پر آپ کا نہ عمل تھا، نہ اعتماد۔ آپ بھی خدانخواستہ اسی طرح مصلحت اندیشیوں کا شکار رہتے تھے جیسا کہ دنیا کے اور سربراہانِ مملکت شکار رہا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ خود راوی اس بات کا اعتراف کر چکا ہے کہ "اسلامی لشکر میں عبداللہ ابن اُبی اور منافقین کا ایک گروہ شامل تھا۔ ان لوگوں کو موقع ملا۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ اس تہمت کا اصل بانی منافقین کا سرغنہ عبداللہ ابن ابی منافق تھا۔" لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم آیات برأت نازل ہونے کے بعد بھی نہ عبداللہ ابن ابی کو کچھ کہہ سکے نہ دوسرے منافقین کو۔ آپ نے حد بھی جاری فرمائی تو تین صادق الایمان مسلمانوں پر جو سب کے سب جلیل القدر صحابی ہیں۔ یعنی حضرت[1] حسان ابن ثابت مداحِ رسول رضی اللہ عنہ اور حضرت[2] مسطح ابن اثاثہ جو عباد ابن مطلب کے پوتے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بھتیجے اور ماں کی طرف سے صخر ابن عامر کی بیٹی (جو حضرت ابوبکرؓ کی خالہ تھیں) کی لڑکی کے صاحبزادے یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور حضرت[3] حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن اور ام المؤمنین حضرت زینب

بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حقیقی بہن تھیں۔ صرف ان تین آدمیوں پر جو سارے ہی سچے مسلمان اور آپ کے جان نثار تھے اور منافقین کی سازش کا اپنی سادگی سے شکار ہو گئے تھے، ان پر تو آپ نے حد جاری فرما دی اور وہ منافقین جو اصل تہمت لگانے والے تھے خصوصاً ان کا سرغنہ یعنی عبداللہ ابن اُبی ان کو ایسا صاف چھوڑ دیا جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں تھا۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ منافق ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بظاہر اسلام لے آتے ہیں۔ مسلمانوں میں گھلے ملے رہتے ہیں۔ سارے اسلامی احکام بجا لاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ ہی کیا جاتا ہے۔ سارے اسلامی احکام ان پر نافذ ہوتے ہیں مگر اُن کے دل میں اسلام نے کما حقہٗ گھر نہیں کیا ہوتا۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق معلوم ہے کہ آپ حدود الٰہی میں ذرا بھی رعایت نہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ خود صحیح بخاری باب مناقب اسامہؓ اور کتاب المغازی باب فتح مکہ اور کتاب الحدود نیز صحیح مسلم کتاب الحدود میں یہ حدیث موجود ہے (جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں) کہ "حضرت اسامہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محبوب کہلاتے تھے۔ مکہ معظمہ میں ایک مخزومی عورت نے جب چوری کی تو لوگوں نے سفارش کے لئے حضرت اسامہؓ ہی کا انتخاب کیا۔ انہوں نے سوچا کہ سوائے اسامہؓ کے یہ جرأت اور کون کر سکتا ہے۔ ان لوگوں کے کہنے سے حضرت اسامہؓ نے سفارش کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

متغیر ہو گیا۔ آپ نے فرمایا "اے اسامہؓ تم اللہ کی حدوں میں سے ایک حد میں سفارش کرتے ہو؟" حضرت اسامہؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! میرے لئے دعائے مغفرت کیجئے"۔ اس حقیقت کے ہوتے ہوئے سوال یہ ہے کہ منافقین کے سلسلہ میں خصوصاً عبداللہ ابن ابی ابن سلول کے حق میں آپ نے یہ طرزِ عمل کیوں اختیار فرمایا کہ انہیں آپ نے کھلی چھٹی دیدی۔ کیا حضرت سعد ابن عبادہؓ کی اس دھمکی سے ڈر کر جو انہوں نے حضرت سعد ابن معاذؓ کے مقابلہ میں علی الاعلان دی تھی آپ نے ان خزرجیوں کو ہاتھ لگانا مناسب نہیں سمجھا؟ حدودِ الٰہی کے مقابلہ میں کیا آپ بھی ان مصلحت کوشیوں کا (العیاذ باللہ) شکار ہو جایا کرتے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو پھر دوسروں سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟۔

(۲۹) اس کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لائے اور حضرت عائشہؓ سے تہمت کے بارہ میں خطاب فرمایا تو راوی کہتا ہے کہ "جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بات ختم کی تو حضرت عائشہؓ کے آنسو بالکل خشک ہو گئے۔ آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے والد حضرت ابوبکرؓ سے کہا، آپ میری طرف سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو جواب دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ پھر حضرت عائشہؓ نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کا جواب دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔ یہ جواب سُن کر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو ایک نوعمر لڑکی تھیں۔ اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ الخ اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت ام رومانؓ کا جواب دینے سے پہلو تہی فرمانا قطعاً انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ وہ کئی دنوں اور راتوں سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر جو گذر رہی تھی وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے۔ اس کا ماں باپ کے دل پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں وہ دونوں بھی حضرت عائشہؓ کے ساتھ روتے رہے تھے۔ اور وہ دونوں ڈر رہے تھے کہ (بقول راوی) ان کے رونے سے کہیں ان کا کلیجہ نہ پھٹ جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ کچھ غیر معقول بات بھی نہیں تھی۔ آپ نے تہمت لگانے والوں کی بات کی تائید و توثیق بھی نہیں فرمائی تھی۔ ان دونوں حضرات کو بات کا جواب دینے سے کیا امر مانع تھا۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا تھا کہ وہ اس ناگوار صورت حالات کو جتنی جلد ختم کر سکتے تھے کریں۔ نہ کہ اس کو اور طول دیں کیا وہ حضرت اسامہؓ اور حضرت عمرؓ ابن الخطاب کی طرح محض حضرت عائشہؓ کی برأت اور اہل نفاق کی اس سازش کا پردہ بھی چاک نہیں فرما سکتے تھے؟ لیکن چلئے اسے حضرت صدیق اکبرؓ

اور حضرت ام رومانؓ کے غایت عقیدت و احترام پر محمول کر کے
اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ بات کیسے نظر انداز کی جا سکتی
ہے کہ حضرت عائشہؓ کے متعلق راوی کا یہ ریمارک قطعاً غلط
ہے کہ وہ ایک نوعمر لڑکی تھیں اور اس وقت تک زیادہ قرآن
بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں۔ ہم اپنے مقام پر ثابت کر چکے ہیں
کہ حضرت عائشہؓ کی عمر رخصتی کے وقت کم از کم انیس سال
تھی لہٰذا ۵ھ میں وہ کم از کم بائیس سال کی ایک جوان
عورت تھیں۔ ماں باپ کے گھر میں بچپن سے قرآن کریم کی تلاوت
ہوتے دیکھتی اور سنتی آ رہی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم کے ہاں تشریف لے آنے کے بعد تو ہر صبح و شام آپ کا
مشغلہ ہی قرآن پڑھنا اور سننا تھا۔ امور خانہ داری میں مصروفیت
بھی برائے نام ہی تھی۔ مہینہ مہینہ بھر تک گھر میں چولہا نہیں جلتا
تھا۔ کھجور اور دودھ پہ گذارہ ہوتا تھا۔ اور اکثر اس کا بھی ناغہ
ہو جاتا تھا۔ تو آپ کو گھر میں سوائے قرآن شریف پڑھنے اور
سننے کے کام کیا تھا۔ لہٰذا راوی کا یہ کہنا کہ وہ نوعمر لڑکی تھیں
اور اس وقت تک زیادہ قرآن بھی پڑھی ہوئی نہیں تھیں خلاف
واقعہ اور خلاف حقیقت ہے۔

(۳۰) اس کے بعد راوی نے حضرت عائشہؓ کی جواب دہی نقل
فرمائی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہا "اللہ کی قسم میں جانتی ہوں
کہ تم لوگوں نے یہ بات سنی ہے اور وہ تمہارے دلوں میں
جم گئی ہے۔ اور تم نے اسے مان بھی لیا ہے۔ اب اگر میں یہ کہوں

کہ میں بری ہوں تو تم مجھے سچا نہ سمجھو گے اور اگر میں تم سے اس امر
کا اقرار کر لوں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ میں اس سے بری ہوں
تو تم مجھے سچا سمجھو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنی اور تم لوگوں کی
مثال یوسف (علیہ السلام) کے باپ کے مثل سمجھتی ہوں جبکہ
انہوں نے یہ کہا تھا فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا
تَصِفُوْنَ میں بھی (ان کی طرح) خوبصورتی کے ساتھ صبر کرتی
ہوں۔ اور جو کچھ تم لوگ کہہ رہے ہو، اس پر اللہ ہی مدد گار ہے۔
یہ کہہ کر حضرت عائشہؓ منہ پھیر کر اپنے بچھونے پر لیٹ گئیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کا جواب نہایت معقول اور
موقع و محل کے عین مطابق ہے اور ان کی قرآن دانی اور قرآن
فہمی کا کھلا ثبوت ہے۔ غم و اندوہ میں شدتِ جذبات کے ماتحت
حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام یاد نہ آنا عین فطرتِ نسوانی
بلکہ فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ اس موقعہ پر کہانی نویس
نے اپنے فن کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن آخر میں وہ پھر پٹڑی
سے اتر گیا۔ ایسے موقعہ پر حضرت عائشہؓ کا منہ پھیر کر اپنے بچھونے
پر لیٹ جانا نہ صرف بدتمیزی اور گستاخی کی دلیل ہے اور اس
سے پہلے ماں باپ کی جو کردار نگاری راوی نے کی تھی اس کے
قطعاً خلاف ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ ابوبکرؓ اور ام رومانؓ
کی بیٹی ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شدید ضرورت
کے وقت بھی لب کشائی کی جرأت نہیں فرماتے، اُن کی بیٹی
یوں منہ پھیر کر پڑ رہتی ہے جبکہ یہ موقعہ تھا کہ وہ ان تأثرات

اور ردِ عمل کا بغور مطالعہ کرتیں جو ان کے ان کلمات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر مرتب ہوئے تھے جو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جواباً عرض کئے تھے۔

(۳۱) اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔ "اللہ کی قسم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ابھی اپنی جگہ سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے اور نہ گھر کا کوئی آدمی باہر جانے پایا تھا کہ آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اور جو شدت آپ پر بوقت نزول وحی ہوا کرتی تھی وہ شروع ہوگئی۔ سردی کا دن ہونے کے باوجود وحی کے بوجھ سے آپ کے جسم اطہر سے پسینہ موتیوں کی طرح ٹپک رہا تھا۔ الخ

سبحان اللہ! اس ساری داستان پر اگر دشمنانِ اسلام یہ پھبتی کسیں کہ محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) تہمت لگانے والوں کا تو کچھ نہ کرسکے اور نہ دلائل و شواہد سے اپنے حرم محترم کی برأت ثابت کرسکے، آخر وحی کا ڈھونگ رچا کر (نعوذ باللہ) ان کی برأت کا بزعمِ خود اعلان کرنے کا ایک بہانہ تراش لیا۔ تو کیا جواب دیا جائے گا۔ ہم خود ہی دشمنانِ اسلام کے لئے اسلام اور پیغمبر اسلام کو بدنام اور مطعون کرنے کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں اور پھر طعن کرنے والوں پر زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تھا اس روایت کا تجزیہ محض درایت کے نقطۂ نظر سے۔

بات بہت طویل ہوگئی ہے مگر چونکہ بات بہت اہم تھی اس لئے ہمیں تفصیل کے ساتھ بحث کرنی پڑی، ہم نے درایت کے نقطۂ نظر سے اکتیس[۳۱] وجوہ پیش کی ہیں جن میں سے ہر وجہ ایسی ہے کہ اس کی بناء پر اس روایت کو رد کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال قرآن کریم نے تمام آیات میں کہیں بھی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور ان پر تہمت لگائے جانے کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ لہٰذا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی کہانیاں گڑھے اور حضرت عائشہؓ پر انگشت نمائی کا سامان پیدا کرے۔ علامہ شبلی نعمانی اپنی سیرت النبی حصہ اول ص۴۲۷ پر لکھتے ہیں کہ:۔

"واقعۂ افک۔ یعنی حضرت عائشہؓ پر منافقین نے جو تہمت لگائی تھی وہ اسی لڑائی (مریسیع) سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ احادیث اور سیر کی کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔ لیکن جس واقعہ کی نسبت قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ سننے کے ساتھ ہی لوگوں نے یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ "یہ بالکل افتراء ہے" اس کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

البتہ اس سے یہ اندازہ کرنا چاہیئے کہ محض جھوٹ اور بے ہودہ خبر بھی کس طرح پھیل جاتی ہے۔ یہ خبر اصل میں منافقین نے مشہور کی تھی لیکن بعض مسلمان دھوکہ میں آگئے جن کو تہمت لگانے کی سزا دی گئی۔

جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔
آج کل کے عیسائی مؤرخوں نے بھی قدیم مؤرخوں کی طرح اس واقعہ کو اس جوش مسرت سے لکھا ہے کہ خود بخود ان کے قلم میں روانی آگئی ہے۔ لیکن ہم ان سے توقع بھی یہی کر سکتے تھے۔"

آپ نے دیکھا کہ اگرچہ علامہ شبلیؒ نعمانی احادیث و سیر کی اس موضوعہ داستان کو رد نہیں فرما سکے۔ کیونکہ ان کے عہد میں ابھی لوگوں میں اتنی جرأت پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی سلیم الطبعی اپنے قلم کو اس موضوع داستان سے ملوث کرنا بھی پسند نہیں کرتی اس لئے وہ ایک سرسری تذکرہ کر کے گذر جانے ہی کو بہتر تصور فرما رہے ہیں۔ ایک سلیم الطبع انسان کے لئے ان کا یہ خفیف سا اشارہ بھی تردید سے کم نہیں ہے۔

شانِ نزول کی دوسری روایت

آخر میں اُن حضرات کی خدمت میں جو آیاتِ قرآنی کی تفسیروں میں شانِ نزول کی احادیث بغیر گذارہ ہی نہیں کر سکتے ان ہی آیات کی تفسیر میں مستدرکِ حاکم کی یہ روایت پیشِ خدمت ہے جس کی رو سے اس آیتِ کریمہ کا شانِ نزول حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مشہور قصے کے بجائے حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو بتایا گیا ہے۔ مستدرک میں ہے:

حدثنا علی ابن حمشاد العدل قال حدثنا
احمد بن علی الابار قال حدثنا الحسن ابن حماد

سجادہ قال حدثنی یحیی ابن سعید الاموی
قال حدثنا ابو معاذ سلیمان بن الارقم
الانصاری عن عروۃ عن عائشۃ رضی اللہ
عنہا قالت اھدیت ماریۃ الی رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وسلم ومعھا ابن عم لھا قالت
فوقع علیھا وقعۃ فاستحرت حاملاً قالت
فعزلھا عند ابن عمھا قالت فقال اھل الافک
والزور من حاجتہ الی الولد ادعی ولد غیرہ
وکانت امہ قلیلۃ اللبن فاتباعت لدضائنۃ
لبون فکان یغذی بلبنھا فحسن علیہ لحمہ
قالت عائشۃ رضی اللہ عنہا فدخل بہ علی
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذات یوم فقال
کیف ترین فقلت من غذی بلحم الضأن یحسن
لحمہ قال ولا الشبہ قالت فحملنی ما تحمل النسأ
من الغیرۃ ان قلت ما اری شیئا قالت فبلغ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ما یقول الناس
فقال لعلیؓ خذ ھذا السیف فانطلق فاضرب
عنق ابن عم ماریۃ حیث وجدتہ قالت فانطلق
فاذا ھو فی حائط علی نخلۃ یخترف رطبھا
قالت فلما نظر الی علیؓ ومعہ السیف استقبلتہ
رعدۃ قال فسقطت الخرقۃ فاذا ھو لم یخلق اللہ

لہ ما للرجال شیئ ممسوح۔

(مستدرک حاکم ص ۳۹/۴)

ترجمہ:۔ ہم سے علی ابن حمشاد نے حدیث بیان کی جو ثقہ راوی ہیں انہوں نے کہا کہ ہم سے احمد بن علی ابار نے حدیث بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم سے حسن بن حماد سجادہ نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ مجھ سے یحییٰ ابن سعید اموی نے حدیث بیان کی، انہوں نے کہا کہ ہم سے ابو معاذ سلیمان ابن الارقم انصاری نے حدیث بیان کی، انہوں نے عروہ سے انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا ماریہؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو تحفہ میں بھیجی گئی تھیں اور ان کے ساتھ ان کا چچازاد بھائی بھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے مقاربت فرمائی تو انہیں حمل رہ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے (حمل کی بنا پر) الگ رہے (تاکہ حمل کو نقصان نہ پہنچے) اور اُنہیں ان کے چچازاد بھائی کے پاس بھیج دیا۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ اہل افک اور اہل زور نے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بیٹے کی ضرورت تھی لہٰذا انہوں نے دوسرے کے بیٹے پر دعویٰ کر دیا (کہ میرا بیٹا ہے) ابراہیمؓ کی ماں کے دودھ کم تھا۔ آپ نے اس

کے لئے دودھ دینے والی بکری خرید دی چنانچہ اسی کا دودھ اسے پلایا جاتا تھا۔ بچہ پر خوب گوشت چڑھ گیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن بچہ کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور فرمانے لگے۔ کیوں کیسا لگتا ہے تو میں نے کہا جسے بکری کا گوشت غذا میں دیا جائے گا اس پر گوشت کیوں نہ چڑھے گا۔ آپ نے فرمایا کہ مشابہت نہیں دیکھتیں، مجھے وہی رشک سوار ہوا جو عورتوں کو ہوا کرتا ہے۔ میں نے کہہ دیا، مجھے تو کوئی مشابہت نظر نہیں آتی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی وہ بات پہنچی جو لوگ آپس میں کرتے تھے تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا "یہ تلوار لو اور جاؤ ماریہؓ کا چچازاد بھائی جہاں بھی ملے اس کی گردن اڑا دو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت علیؓ گئے تو وہ ایک باغ میں کھجور کے درخت پر چڑھا ہوا پکی کھجوریں توڑ رہا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کو دیکھا اور ان کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے کپکپی طاری ہو گئی اور اس کی لنگوٹی گر پڑی تو یکبارگی (حضرت علیؓ نے دیکھا) اللہ نے اس کے وہ کچھ پیدا ہی نہیں فرمایا تھا جو مردوں میں ہوتا ہے۔ محض ایک سپاٹ جگہ تھی (یعنی وہ مخنث آدمی تھا)۔

یہ حدیث مستدرک حاکم کی ہے۔ مستدرک کے متعلق حاکم کا دعویٰ یہ ہے کہ میں نے اس میں وہ صحیح احادیث جمع کی ہیں جو صحیح ہیں لیکن امام بخاری اور امام مسلم سے رہ گئی ہیں۔ ان کے اس دعوے کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی اپنے مقدمہ اعلاء السنن میں لکھتے ہیں کہ :۔

"حافظ ابوعبداللہ حاکم نے مستدرک میں اُن احادیث کو درج کرنے کا اہتمام فرمایا ہے جو بخاری اور مسلم سے زائد ہیں یعنی ان دونوں کی شرط پر صحیح ہیں یا ان میں سے کسی ایک کی شرط پر صحیح ہیں یا فی نفسہٖ صحیح ہیں اگرچہ ان میں سے کسی ایک کی شرط پر نہ بھی ہوں۔

(قواعد فی علوم الحدیث مع التعلیق لعبد الفتاح ابو غدہ صنہ مطبوعہ بیروت)

بہرحال یہ بھی اسی درجہ کی حدیث ہے جیسا کہ بخاری اور مسلم کی وہ حدیث ہے جس پر ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ مستدرک حاکم کی یہ روایت بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی سے مروی ہے اور ان سے بیان کرنے والے بھی حضرت عروۃ ابن الزبیرؓ ہی ہیں جو اُس روایت کے راویوں میں بھی شامل ہیں جو بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کی ہے۔ تو بخاری اور مسلم کی روایت کو ماننے والے حضرات اس روایت کو کیوں نہیں مانتے۔

پھر یہ روایت مستدرک حاکم کے علاوہ صحیح مسلم میں بھی مختصراً موجود ہے۔ چنانچہ کتاب التوبہ کے آخری باب باب براۃ حرم النبی صلے اللہ علیہ وسلم عن الریبۃ میں ہے کہ :۔

عن انسؓ ان رجلا کان یتھم بام ولد النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لعلیؓ اذھب فاضرب عنقہ فاتاہ علی فاذا ھو فی رکی یتبرد فیھا فقال لہ علی اخرج فناولہ یدہ فاخرجہ فاذا ھو مجبوب لیس لہ ذکر فکف علیؓ عنہ ثم اتی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ انہ لمجبوب مالہ ذکر۔

(صحیح مسلم مطبوعہ مصر صنہ ۲۳۸ ج ۸ بتحقیق فواد عبدالباقی)

ترجمہ :۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ولد (حضرت ماریہ قبطیہؓ) کے ساتھ تہمت لگائی جاتی تھی تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔ جاؤ اور اس کی گردن مار دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس گئے تو یکایک وہ ایک تالاب میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لئے گھسا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا "باہر نکل" اس نے حضرت علیؓ کو اپنا ہاتھ پکڑایا اور انہوں نے اسے نکالا تو یکایک اس کا آلہ تناسل کٹا ہوا تھا۔ حضرت علیؓ

قتل کرنے سے باز رہے۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے پاس آئے اور کہا اے رسول اللہ وہ تو مقطوع
الذکر ہے۔ اس کے آلۂ تناسل ہی نہیں ہے۔

مزید سنئے کہ حضرت ماریہؓ کے متعلق یہ روایت صرف اہلسنّت کی کتابوں ہی میں نہیں شیعوں کی کتابوں میں بھی ہے مشہور شیعہ عالم مولوی مقبول حسین اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ:۔

تفسیر قمی میں ہے کہ عامہ کی روایت تو یہ ہے کہ یہ آیت جناب عائشہؓ کے بارے میں ہے اور جو اتہام ان پر غزوۂ بنی المصطلق میں لگایا گیا تھا اس کے بارے میں ہے اور خاصّہ کی روایت یہ ہے کہ یہ آیت ام المؤمنین ماریہؓ قبطیہ کی شان میں ہے اور جو الزام عائشہؓ نے ان پر لگایا تھا اس کے بارے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ امام محمد باقرؒ سے اس کی تفسیر میں روایت ہے کہ جب فرزند جناب رسولِ خدا کا انتقال ہوا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا تو عائشہؓ نے کہا کہ آپ رنج کیوں کرتے ہیں؟ وہ تو جریج قبطی کا بیٹا تھا پس آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے علی مرتضیٰ کو بھیجا اور جریج کے قتل کا حکم دیا (آگے یہ داستان بڑی طویل ہے جس کا مفہوم اور خلاصہ یہ ہے کہ علیؓ کے خوف سے جریج کا ستر کھل گیا تو معلوم ہوا کہ وہ نہ عورت ہے نہ مرد)۔

بہر حال یہ روایت تفسیر قمی میں امام محمد باقرؒ سے اور صحیح مسلم

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے صحیح مسلم کی روایت میں امام مسلمؒ کا باب برأۃ حرم النبی صلے اللہ علیہ وسلم من الریبۃ کے تحت اس روایت کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ امام مسلمؒ اسے آیاتِ برأت کا شانِ نزول سمجھتے ہیں اور اس واقعہ کو انہی آیات پر چسپاں فرما رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ پہلی روایت سے بھی گئی گذری ہے۔ اس پر سب سے بڑا اعتراض تو یہ وارد ہوتا ہے کہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ثم معاذ اللہ محض سنی سنائی باتوں پر بغیر کسی شہادت اور ثبوت کے اور بغیر متہم آدمی کو اپنی صفائی کا موقعہ دیئے یونہی قتل کے احکام جاری کر دیا کرتے تھے۔ ایسا تو کوئی بڑے سے بڑا سفاک ڈکٹیٹر بھی نہیں کرتا۔ وہ بھی کم از کم کچھ جھوٹے گواہ پیدا کر کے اور کوئی جھوٹا ثبوت مہیا کر کے ہی ایک معصوم جان کو قتل کرتا ہے چہ جائیکہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر اس بے ثبوت سفاکی کا اتہام لگایا جائے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ آپ نے اس آدمی کو تو قتل کرانے کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔ لیکن اس کنیز کو آپ نے کچھ نہیں کہا جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی۔ تالی ایک ہاتھ سے تو نہیں بجتی۔ زنا کا ارتکاب مرد اور عورت دونوں ہی کرتے ہیں اور دونوں یکساں مجرم ہوتے ہیں۔ اگر

آپ نے اس زانی کو قتل کرانا چاہا تھا تو زانیہ کو بھی قتل کرانا چاہیئے تھا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اس شخص کو قتل کیوں نہیں کیا۔ ان کو صاف طور پر یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ تلوار لو اور اس کی گردن مار دو۔ یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اس کو جا کر دیکھو۔ اگر وہ مقطوع الذکر ہو تو اسے چھوڑ دینا اور اگر اس کے آلۂ تناسل پاؤ تو قتل کر دینا۔ انہوں نے اختیار تمیزی سے کیوں کام لیا۔ ان کا کام تو تعمیل ارشاد تھا۔ انہیں اسے قتل کر دینا چاہیئے تھا۔

بہر حال ہمارے نزدیک یہ روایت بھی قطعاً اس قابل نہیں ہے کہ اس پر کوئی توجہ کی جائے بلکہ ہم تو اِذَا تَعَارَضَا تَسَاقَطَا کے اصول کے مطابق حضرت عائشہؓ کے متعلق روایت ہو یا حضرت ماریہؓ کے متعلق دونوں کو موضوع اور گھڑی ہوئی سمجھتے ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا تو وہ افک کے احکام بتاتے ہوئے اس قسم کے کسی واقعہ کا خود ہی ذکر فرما دیتا۔ جب اس نے ذکر نہیں فرمایا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان احکام کا سمجھنا ان واقعات پر موقوف نہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی شخص کسی بھی زوجۂ مطہرہ کو متہم بتانے والی موضوع روایات کا ذکر کرنا چاہتا ہے یا کم از کم ان پر لگائے گئے کسی اتہام کا ذکر ضروری سمجھتا ہے تو وہ اپنی عاقبت

کی فکر کرے اور قیامت کے دن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ○

(کتاب السرقۃ)

چوری کرنے والوں کی سزا کے متعلق قرآن کریم میں ایک ہی آیت ہے جو بنیادی اہمیّت رکھتی ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے :۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

(۵/۳۸)

ترجمہ:۔ اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت، تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ سزا ہے اس عمل کی جو انہوں نے کمایا۔ یہ اللہ کی طرف سے سزائے عبرت ہے اور اللہ بڑا غالب حکمت والا ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بنیادی لفظ اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ ہے۔ سوال یہ ہے کہ سرقہ کسے کہتے ہیں؟ ایک آدمی کو ہم چوری کرنے والا یا چوری کرنے والی کب کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ لغت کے اعتبار سے چوری اسے کہتے ہیں کہ کسی غیر کا مال چھپ کر رازداری کے ساتھ

لے لیا جائے۔ نیز جو چیز چرائی جائے وہ قیمتی ہونی چاہیئے۔ کسی نے اگر دوسرے آدمی کے گھر سے ایک گلاس پانی لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا یا کوئی بہت ہی معمولی چیز مثلاً سوئی، دھاگہ، بٹن، آم کی ایک کیری، تھوڑا سا نمک مرچ لے لیا ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ چیز محفوظ جگہ سے لی گئی ہو۔ اگر سڑک پر پڑی ہوئی ہے۔ دروازہ کے باہر پڑی ہوئی ہے۔ کسی غیر محفوظ مقام مثلاً پبلک پارک یا میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ جہاں ہر شخص بلا روک ٹوک آسکتا ہے اور وہاں سے کسی نے کوئی چیز لے لی ہے تو اسے بھی چوری نہیں کہا جاتا۔

فقہاء نے مسجدوں، پبلک اسکولوں، جماعت خانوں وغیرہ کو بھی اسی میں شامل کیا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ان مقامات سے چوری کرنے کی شناعت تو اور بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا ان صورتوں میں سخت سزا دینے کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی وہ چیزیں جو جلد خراب ہو جانے والی ہوں، مثلاً دودھ، دہی، سبزیاں، پکے پھل، پکا ہوا سالن، کچا گوشت وغیرہ ان چیزوں کے لے لینے کو بھی چوری نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ ممکن ہے یہ چیزیں اس نے اس لئے لے لی ہوں کہ ان کے خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے یہ سمجھا ہو کہ میں انہیں استعمال کر لوں تو یہ کام آجائیں گی ورنہ سڑ بھس جائیں گی اس لئے اسے بھی چوری میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ چوری کا ثبوت اس وقت ہوگا جب وہاں کسی شبہ اور تاویل کی گنجائش نہ ہو، مثلاً کسی نے اپنے والدین کے ہاں سے اپنی اولاد کے ہاں سے یا کسی ذی رحم محرم کے

ہاں سے کچھ چرا لیا تو چونکہ اس میں شبہ اور تاویل کی گنجائش ہے کہ وہ اس چیز کو اپنی چیز سمجھ رہا ہو کیونکہ والدین، ماموں، چچا، بھانجا، بھتیجا بیٹا وغیرہ ایسے رشتے ہیں کہ آدمی ان کی چیزوں کو غیروں کی چیز نہیں سمجھتا تو اسے اصطلاح شریعت میں چوری نہیں کہا جائے گا۔ بشرطیکہ معاشرہ کے عرف اور رواج میں اس کی گنجائش ہو اور حاکم مجاز اس تاویل سے مطمئن ہو اور مال مسروقہ اتنا ہو کہ عرف عام میں اسے چوری نہ کہا جاتا ہو۔ لیکن اگر بیٹے نے باپ کی تجوری توڑ کر دس ہزار روپے چرائے ہیں یا بکس اور الماری توڑ کر ماں کے زیورات چرائے ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ عرف عام میں اسے چوری نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا یہ چوری ہوگی اور اس پر قطع ید کی حد جاری کی جائے گی۔ چوری کرنا لوگ اول اول اپنے گھروں ہی سے سیکھتے ہیں۔ لہٰذا اس کا سدباب ضروری ہے۔

بہر حال ان چند شرائط کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر یہ شرائط موجود ہوں تو اس وقت اگر کوئی شخص کسی کی چیز محفوظ مقام سے خفیہ طور پر لیلے تو اسے چوری کرنا کہا جائے گا اور اسے شریعت کے مطابق سزا دی جا سکے گی۔ یہ باتیں انسانوں کی عقل عام سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے لئے نہ کسی نص کی ضرورت ہے اور نہ کوئی بے لچک قانون بنایا جا سکتا ہے۔

ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ مسروقہ چیز قیمتی ہونی چاہیئے۔ اس میں کہ قیمتی چیز کسے کہا جائے گا فقہاء کی رائے میں اختلاف رہا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک وہ ایک چوتھائی دینار کی قیمت کی ہونی چاہیئے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تین درہم قیمت کی ہونی چاہیئے۔ حنفیہؒ کا مذہب یہ ہے کہ وہ دس درہم کی قیمت کی ہونی چاہیئے۔ روایات سے معلوم

ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں ایک ڈھال کی قیمت کے برابر اگر کوئی چیز چرائی گئی تو آپ نے چور کا ہاتھ کاٹ دیا ہے پھر اس میں روایات مختلف ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ڈھال کی قیمت کتنی ہوتی تھی۔ تین درہم سے لے کر دس درہم تک روایات ملتی ہیں۔ اسی اختلاف پر فقہاء کا اختلاف مبنی ہے۔ حنفیہؒ کا قول مبنی بر احتیاط معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ قیمت والی روایات کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ حدود میں احتیاط ہی مدنظر رہنی چاہیئے۔

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ حدود میں قرآن کریم نے جو سزائیں بیان فرمائی ہیں وہ انتہائی سزائیں ہیں۔ ہم نے یہ بھی بتایا تھا کہ عربی زبان میں نکالؐ کا لفظ ایسی سزاؤں پر بولا جاتا ہے جو جرائم کی انتہائی صورتوں میں دی جائیں اور لوگوں کے لئے سامانِ عبرت ہو سکیں اب چونکہ ہمارے عہد میں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بڑا تفاوت ہو چکا ہے۔ ضروری نہیں کہ جو چیزیں آپؐ کے زمانہ میں قیمتی سمجھی جاتی تھیں وہ آج بھی قیمتی سمجھی جاتی ہوں اور جو آج قیمتی سمجھی جا رہی ہیں عین ممکن ہے کہ کل کو قیمتی نہ سمجھی جائیں۔ اس بات کا مدار معاشرہ کے اقتصادی حالات پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی متعین مقدار ہمیشہ کے لئے متعین نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا ہمیں نظام سزا پر بڑی احتیاط سے نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ ہماری پارلیمنٹ کو غور و خوض کے بعد موجودہ حالات کے مطابق قانون سازی کرنی چاہیئے اور بتانا چاہیئے کہ آج کے عہد میں کس قیمت کی چیز پہ ہاتھ قطع کر دینا چاہیئے اور کس قیمت

تک دوسری سزاؤں پر اکتفا کرنا چاہیئے۔

ہمارے نزدیک جیل خانوں میں بند کر دینا اور قید و بند کی سزائیں دینا کچھ مفید نتائج مرتب نہیں کر رہا ہے۔ ہمارے جیل خانے جرائم کی اچھی خاصی تربیت گاہیں بن گئی ہیں۔ جیل خانوں میں جا کر مجرم بجائے کچھ نصیحت حاصل کرنے اور بجائے اپنی اصلاح کرنے کے جرائم میں پختہ کار اور عادی مجرم بن کر نکلتے ہیں۔ وہاں جرائم پیشہ لوگوں کی صحبت میں آدمی بجائے اپنی اصلاح کرنے کے متنوع جرائم سیکھ کر نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں تجویز نہیں کیں۔ ورنہ حق تعالیٰ کے لئے ایسا کرنا کچھ دشوار نہیں تھا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم کے عہد نزول میں جیل خانے نہیں تھے۔ اس لئے قرآن کریم نے قید و بند کی سزائیں نہیں دیں۔ خود قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرہ میں فرعون کے قید خانہ کا ذکر موجود ہے۔ عرب کے آس پاس ایسی متمدن قومیں موجود تھیں جن کے ہاں جیل خانے ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں جیل خانہ بنالیا تھا۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کوئی جیل خانہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن آپ نے لوگوں کو مختلف صحابہ کے محفوظ مکانات میں قید کیا ہے۔ روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ عرب میں جیل خانوں کا رواج نہیں تھا اور وہ جیل خانوں سے واقف نہیں تھے تو جس طرح حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو کشتی بنانا سکھایا تھا اور اس کی تعلیم دی تھی کیا مشکل تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جیل خانے بنانے کی تعلیم دے دیتے۔ لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا

اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قید و بند کی سزائیں دینا حق تعالیٰ کو منظور ہی نہیں تھا۔ لہٰذا جن چوریوں میں ہماری پارلیمنٹ ہاتھ نہ کاٹنے کا فیصلہ کرے اس کے لئے بجائے قید و بند کی سزاؤں کے کوڑے مارنے کی سزا مقرر کر دینی چاہیئے۔ کہ قرآن کریم نے کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی ہے اور یہ سزا اس نے اخلاقی جرائم ہی میں تجویز کی ہے۔

واضح رہے کہ میں جیل خانوں کی افادیت کا انکار نہیں کر رہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقی مجرموں کے لئے جیل خانے مفید مطلب نہیں۔ دوسری انواع کے مجرموں کو قید و بند کی سزائیں دی جا سکتی ہیں۔ نیز جب تک مقدمات کے فیصلے نہ ہو پائیں اتنے عرصہ تک مجرموں کو قید میں رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن دوسرے عادی مجرموں کے ساتھ انہیں اختلاط کی اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ ساتھ ہی ہمیں جیل خانوں کی اصلاح کی طرف بھی خصوصی توجہ دینی چاہیئے تاکہ وہ اصلاح گھر بن سکیں۔ جرائم کی تربیت گاہیں نہ رہیں۔

قطع ید نیز آیت کریمہ میں قطع ید کا لفظ بھی قابلِ غور ہے قَطْعٌ کے معنے کسی چیز کو کاٹ دینا۔ راغب نے کہا ہے کہ یہ لفظ حسی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے قَطَعَ اللَّحْمَ اس نے گوشت کاٹا اور معنوی چیزوں کے کاٹنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے قَطَعَ السَّبِيلَ یعنی ڈاکہ ڈال کر راستہ کو پُرخطر بنا دینا کہ لوگ ڈر کے مارے سفر نہ کر سکیں قَطَعَ لِسَانَهٗ کسی پر احسان وانعام کر کے اس کی زبان بند کر دینا کہ وہ بدگوئی نہ کر سکے۔ قَطَعَ رَحِمَهٗ اس نے قرابت داری کے حقوق کو ادا نہیں کیا۔ قرآن کریم میں ہے۔

يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (۲/۲۷)

ترجمہ:۔ وہ ان رشتوں کو قطع کر دیتے ہیں جنہیں اللہ نے ملانے کا حکم دیا تھا۔

یہاں بھی حسّی قطع نہیں، بلکہ معنوی قطع مراد ہے۔ قَطَعَ خَصْمَهٗ بِالْحُجَّةِ اس نے دلائل و براہین سے فریق مقابل کو ساکت اور لاجواب کر دیا۔ قُطِعَتْ لِسَانُهٗ اس کی زبان جو پہلے بڑی تیز چلا کرتی تھی بند ہو کر رہ گئی۔ قُطِعَتْ يَدُهٗ اس کا ہاتھ بے کار ہو گیا۔ قرآن کریم نے سورۂ یوسف میں قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ کا لفظ ہی استعمال فرمایا ہے:۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِيْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○

(۱۲/۳۰-۳۱)

ترجمہ:۔ اور شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز (مصر) کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی ہے تاکہ اسے رجھالے۔ وہ اس کی چاہت میں اپنا دل ہار بیٹھی ہے۔ ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی کا شکار ہو گئی ہے۔ جب عزیز

(مصر) کی بیوی نے ان کی مکاری کی یہ باتیں سنیں تو انہیں بُلوا بھیجا اور ان کے لئے مسندیں آراستہ کیں (اور دستور کے مطابق) ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک چھری تھما دی (کہ کھانا کھانے میں کام آئے) پھر (جب یہ سب کچھ ہو چکا تو) یوسف سے کہا، ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب یوسف نکل آیا اور ان عورتوں نے اسے دیکھا تو (ایسا پایا کہ) اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بے اختیار پکار اُٹھیں۔ سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ہے ضرور ایک فرشتہ ہے۔ بڑے مرتبہ والا فرشتہ۔

یہاں قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ کے معنے یہ تو نہیں ہیں کہ انہوں نے پہنچوں سے ہاتھ کاٹ کر الگ ڈال دیئے تھے۔ بلکہ اس کے معنے یا تو یہ ہیں کہ کھانا کھاتے کھاتے ان کے ہاتھ فرطِ حیرت سے رُک گئے اور جو پھل وغیرہ وہ کاٹ رہی تھیں وہ کاٹنا ہی بھول گئیں یا یہ معنے ہیں کہ چھری ان کے ہاتھوں میں تھی وہ فرطِ حیرت سے بجائے پھل کاٹنے کے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر بیٹھیں۔ بہرحال یہاں قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ کے معنے ہاتھوں کو روک لینے یا زخمی کر لینے کے ہیں سورۂ عنکبوت میں قوم لوطؑ کے متعلق ہے:۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ (۲۹/۲۹)

ترجمہ:۔ کیا تم (شہوت رانی کے لئے) مردوں کے پاس جاتے ہو اور راستہ بند کرتے ہو۔

اس آیت میں قطع السبیل کے معنے یا تو یہ ہیں کہ تم ڈاکے ڈالتے ہو اور لوگوں کو سفر کرنے سے روک دیتے ہو یا یہ معنے ہیں کہ تم اپنی

بدعملی یعنی لواطت سے افزائش نسل کی راہیں بند کرتے ہو۔ بہرحال دونوں معنے میں حسّی کاٹنا نہیں ہے بلکہ معنوی قطع مراد ہے۔ قُطِعَ الرَّجُلُ کے معنے ہیں، آدمی نا اُمید ہوگیا اور عاجز رہ گیا۔

(راغب، ابن فارس، تاج العروس و محیط المحیط)

اس میں دوسرا لفظ یَدٌ ہے۔ ویسے تو اس کے معنے ہاتھ کے ہیں۔ لیکن اس لفظ کا استعمال عربی زبان میں نہایت وسیع ہے جیسے اُردو زبان میں ہاتھ کا لفظ نہایت ہی وسیع ہے اسی طرح عربی زبان میں بھی یَدٌ کا لفظ بے شمار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً جاہ اور وقار۔ قوت و اقتدار۔ غلبہ و تسلّط۔ ملکیت۔ مددگار۔ امداد اور فریادرسی۔ احسان و انعام۔ حفاظت و صیانت۔ حذاقت و مہارت ندامت و شرمندگی، ذلّت و انقیاد جیسے بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے خود قرآن کریم میں یہ لفظ ان میں سے بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:۔

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ط (۳/۷۳)

ترجمہ:۔ پیغمبر اسلام! کہہ دیجئے کہ فضل اللہ کے اختیار اور قبضہ میں ہے۔

بِيَدِكَ الْخَيْرُ (۳/۲۶)

ترجمہ:۔ بھلائی تیرے قبضہ میں ہے۔

اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ۔ (۲/۲۳۷)

ترجمہ:۔ یا وہ معاف کردے جس کے اختیار میں نکاح کا بندھن باندھنا ہے۔

قُلْ مَنْ بِّيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ ط (۲۳/۸۸)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ ہر چیز کی حکومت کس کے اقتدار میں ہے؟

تَبٰرَكَ الَّذِيْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷/۱)

ترجمہ:۔ بابرکت ہے وہ ذات جس کے قبضہ و اقتدار میں حکومت ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۳۸/۷۵)

ترجمہ:۔ حق تعالیٰ نے فرمایا اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اسے سجدہ کرے جسے میں نے اپنی قدرت سے پیدا کیا تھا؟

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ۔ (۳۸/۴۵)

ترجمہ:۔ اور ہمارے بندوں ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کا تذکرہ کیجئے جو بڑی قوتوں کے مالک تھے۔

قرآن کریم میں اور بھی بہت سی آیات ہیں جن سے ان معانی پر روشنی پڑتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات ہاتھ پاؤں سے منزہ ہے حق تعالیٰ کے ہاتھ سے کوئی کام ہونے کا مطلب یقیناً یہی ہوسکتا ہے کہ اس کی قدرت ارادہ، قبضہ، اقتدار، غلبہ اور تسلّط کی بنا پر وہ کام ہوا ہے۔ لہٰذا قَطْعُ الْيَدِ کے معنے کسی کی قدرت، قبضہ اور اقتدار یا غلبہ و تسلّط کو ختم کردینے کے بھی ہوں گے۔ نیز قطع الید کے معنے ہاتھوں کو زخمی اور بے کار کردینے کے بھی ہوسکتے ہیں۔ جیسا کہ عزیز مصر کی بیوی نے جب شہر کی خواتین کو بلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر فرطِ حیرت و استعجاب سے مبہوت ہوکر ان کے ہاتھ رک گئے

کھے یا انہوں نے اپنے ہاتھوں کو زخمی کر لیا تھا۔ نیز قطع الید کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاتھ کے کسی حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ پانچوں انگلیوں اور ہتھیلی کو پہنچے سے کاٹ دینا بھی قطع الید کہلا سکتا ہے۔ نیز ہاتھ کی کسی انگلی کو یا انگوٹھے کو کاٹ دینا بھی قطع الید کہلا سکتا ہے۔ بہرحال قطع الید کی یہ تمام صورتیں ہو سکتی ہیں۔ خود ہمارے ہاں اُردو زبان کا محاورہ ہے کہ "تم نے تو دستاویز پر دستخط کر کے اپنے ہاتھ ہی کاٹ لئے۔ یعنی اپنے اختیار کو ختم کر دیا اور اپنے آپ کو پابند اور مجبور و معذور بنا لیا۔ یہ تمام صورتیں قطع الید ہی کی ہیں۔ چوری میں حکومتِ وقت کو اس قسم کی قانون سازی کرنی چاہیئے کہ کتنے بڑے جرم میں اسے قطع ید کی کونسی صورت اختیار کرنی چاہیئے۔ بہرحال قطع ید کی یہ صورت کہ ہاتھ کو پہنچے سے کاٹ دیا جائے انتہائی اور آخری سزا ہے جو اسی وقت دی جا سکتی ہے جبکہ کسی آدمی نے بہت بڑی چوری کی ہو۔ اور اسلامی رفاہی حکومت قائم ہو۔ اس کی تمام بنیادی ضروریات کی کفالت حکومت کر رہی ہو۔ اسے چوری کرنے کی کوئی ضرورت اور احتیاج لاحق نہ ہو۔ اگر ان حالات میں کوئی شخص لاکھ دو لاکھ روپئے کی بڑی چوری کرتا ہے تو اس کا ہاتھ کاٹ دینا چاہیئے۔ اس سے کم مقدار کی چوری میں اس کی صرف ایک آدھ انگلی کاٹ دی جائے۔ اس سے کم میں اس کے ہاتھوں کو صرف زخمی کر دیا جائے۔ اس سے بھی کم مقدار میں کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام نہ لے سکے۔ اس کو قید کر دیا جائے یا کوئی اور صورت اختیار کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ہاتھ کا غلبہ و اقتدار اور قوت و استعداد ناکارہ ہو کر

رہ جائے۔ یہ تمام صورتیں قطع الید ہی کہلائیں گی۔ اور اس طرح ہم قرآن کے ارشاد فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا ہی پر عمل کریں گے لیکن جرم کی شدت اور خفت، مجرم کے حالات و کوائف کے اعتبار سے قطع ید کی صورتیں مختلف ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ جرم اگر خفیف ہو تو اس قدر سزا نہیں دی جانی چاہیئے جو شدید جرم میں دی جاتی ہے۔ ایک شخص نے ایک لاکھ روپئے چوری کئے ہیں۔ اور دوسرے شخص نے صرف ایک سو روپے چوری کئے ہیں۔ دونوں کا جرم یقیناً یکساں نہیں ہے۔ لہٰذا دونوں جرائم کی سزا بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ فرق کرنا ضروری ہو گا۔

سوسائٹی اور معاشرہ کے حالات بھی ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے ایک زمانہ میں چند دراہم و دنانیر کی قدر و قیمت اور وقعت بہت زیادہ ہو سکتی ہے اور دوسرے زمانہ میں ہزار روپیہ کی بھی وہ وقعت و منزلت نہیں ہوتی۔ اس لئے اس سلسلہ میں کوئی ایک بات ہمیشہ کے لئے طے نہیں کی جا سکتی۔ خود ہمارے بچپن میں جو ایک روپیہ کی قدر و منزلت اور قیمت ہوا کرتی تھی وہ آج ایک سو روپے کی نہیں ہے لہٰذا یہ بات طے کرنا کہ کتنے مال کی چوری پر کتنی سزا دی جائے ہر زمانہ کی حکومت کو خود طے کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم نے اس کی مقدار متعین نہیں کی کیونکہ یہ مقدار ہر عہد اور ہر زمانہ کے لئے متعین کی ہی نہیں جا سکتی۔ اس نے صرف یہ کہا ہے کہ مجرم کو چور کہا جا سکے۔ اگر اسے چور کہا جا سکتا ہے تو اسے سزا دی جانی چاہیئے اور اگر اسے چور نہیں کہا جا سکتا تو سزا نہیں دی جائے گی۔

اور قطع ید کی سزا بھی دی جائے تو اس کی کیفیت کیا ہونی چاہیئے

کیونکہ چوری کرنے والے کو قید کر دینے سے لے کر ہاتھوں کو زخمی کر دینے۔ ہاتھ کا کچھ حصہ مثلاً ایک انگلی کاٹ دینے اور پورے ہاتھ کو پہنچے سے کاٹ کر الگ کر دینے تک سب قطع ید کی صورتیں ہیں۔ اس کا فیصلہ بھی حکومتِ وقت کو اپنے احوال وظروف کے ماتحت کرنا چاہیئے۔ نیز اگر حکومت رفاہی نوعیت کی نہیں ہے۔ افراد ملّت کی بنیادی ضروریات کی کفالت حکومتِ وقت نہیں کر رہی ہے معاشرہ میں معاشی ناہمواریاں ہیں۔ کوئی لکھ پتی ہے تو کوئی نان شبینہ کو محتاج ہے۔ ایسی حکومت کو قطعاً اختیار نہیں ہے کہ وہ چوری کی حدود قائم کرے۔ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط سالی کے زمانہ میں سرقہ کی حد کو معطل فرما دیا تھا۔ نیز ابو داؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے کہ عباد بن شرجیلؓ بیان کرتے ہیں کہ مجھے قحط سالی نے ستایا تو میں مدینہ کے باغ میں گھس گیا اور میں نے باغ سے پھل توڑ لئے۔ کھائے بھی اور کپڑے میں باندھ کر لے چلا۔ باغ کے مالک نے آکر مجھے پکڑ لیا۔ مجھے مارا اور میرا کپڑا بھی چھین لیا اور مجھے پکڑ کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سے سارا واقعہ بیان کیا تو آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ وہ ناواقف اور جاہل تھا۔ تم نے اسے بتایا نہیں، وہ بھوکا اور گرسنہ تھا تم نے اسے کھلایا نہیں آپ نے اس انصاری سے فرمایا کہ اس کا کپڑا اسے واپس کرو۔ اور مجھے اپنے پاس سے ایک وسق یا نصف وسق (پیمانہ کا نام ہے) کھانے کی چیزیں عطا فرمائیں۔ (ابو داؤد و نسائی بحوالہ جمع الفوائد ص۲۹۰ ج۱)

یہی ابن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ حضرت حاطبؓ کے غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی اور اسے کاٹ کر کھا گئے۔ اور حضرت

عمرؓ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا۔ اول تو آپ نے کثیر ابن الصلتؓ کو حکم دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ دیں۔ لیکن فوراً ہی حضرت عمرؓ کو خیال آیا اور انہوں نے حضرت حاطبؓ سے کہا کہ میرا خیال ہے تم غلاموں کو بھوکا رکھتے ہو۔ میں تم پر اتنا تاوان ڈالوں گا جو تمہیں گراں ہو۔ پھر مزنی سے پوچھا کہ تیری اونٹنی کی کیا قیمت تھی؟ (ابھی مزنی کچھ کہنے نہیں پایا تھا) حضرت عمرؓ نے خود ہی کہا کہ میں اسے چار سو درہم کی فرض کر لیتا ہوں۔ لہٰذا تم اس مزنی کو آٹھ سو درہم ادا کرو۔

(جمع الفوائد ص۲۹۰ ج۱)

بہرحال ملک و ملّت کے حالات و کوائف کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ اندھا دھند حدود کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی نے حالات سے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ وہ بھوکا تھا۔ اس کے بیوی بچے بیمار تھے اسے ان کے علاج کے لئے رقم کی ضرورت تھی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس نے چوری کی ہے تو حکومت اور معاشرہ اس کی چوری کا ذمہ دار ہے۔ اسے اس کا تاوان دینا چاہیئے۔

چنانچہ ابو داؤد اور ترمذی نے حضرت رافع بن عمروؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ڈھیلے مار مار کر ایک انصاری کے نخلستان سے کھجوریں گرا رہا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ "رافع! یہ تم ان کے درختوں پر کلوخ اندازی کیوں کر رہے تھے؟" عرض کیا کہ "یا رسول اللہ بھوک نے مجبور کر دیا تھا" فرمایا، کلوخ اندازی تو نہ کیا کرو، ہاں اِدھر اُدھر جو کھجوریں خود ٹپک پڑیں وہ کھا لیا کرو، اللہ تمہیں شکم سیر اور سیراب کرے۔"

اس واقعہ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت رافعؓ کو کوئی سزا نہیں دی بلکہ پختہ ہو کر خود گر جانے والی کھجوریں کھانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اپنے ایک غلام کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کے پاس لایا کہ اس نے میری بیوی کا آئینہ چرایا ہے۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیجئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ یہ تمہارا ہی تو خادم ہے اور اس نے تمہارا ہی تو مال چرایا ہے۔

نیز حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ مالِ خمس کے غلاموں میں سے ایک غلام نے خمس کے مال ہی میں چوری کر لی تھی۔ اس کا مقدمہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے اس غلام کا ہاتھ نہیں کاٹا اور فرمایا۔ سب اللہ ہی کا تو مال ہے۔ اللہ کے مال نے اللہ کا مال چرا لیا ہے تو کیا ہوا۔ (للقزوینی بضعف بحوالہ جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۹۱)

اصحاب سنن نے حضرت بسر بن ارطاۃؓ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ سفر میں ہاتھ نہیں کاٹے جا سکتے (سفر سے مراد عام سفر اور سفر جہاد دونوں ہیں)۔

بہر حال روایات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین نے ہر چوری پر قطع ید کی سزا نہیں دی، بعض صورتوں میں معاف فرمادیا، بعض صورتوں میں غلام کے مالک سے تاوان دلوایا، بعض صورتوں میں معمولی تعزیر فرمادی اور بعض میں الٹا انعام بھی دیا۔

نیز بعض خاص حالات میں سزائے سرقہ کو معطل ہی فرمادیا

مثلاً سفر میں، قحط میں یا معمولی چیزوں کی چوری پر۔

نیز اصحابِ سنن کی دوسری روایتوں سے جو حضرت عبداللہ بن عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ بھی ثابت ہے کہ غیر محفوظ مال کی سزا قطع ید نہیں اور درخت پر لگے ہوئے پھلوں کی چوری پر بھی قطع ید نہیں، نیز ایک خاص مقدار سے کم قیمت (نصاب سے کم چوری) پر بھی قطع ید کی سزا نہیں بلکہ ان سب صورتوں میں تعزیر ہے یا دوگنا تاوان یا دونوں۔

عباد بن شراحیل کی روایت ہم پہلے پیش کر چکے ہیں اسے غور سے دیکھئے۔ اس میں ایک بڑا ہی بنیادی نکتہ ملے گا۔ جس باغ سے عباد بن شراحیل نے پھل توڑے تھے اور باغ والے نے انہیں مار پیٹ کر ان کا کپڑا ان سے چھین لیا تھا اس سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ:-

مَا عَلَّمْتَهُ إِذَا كَانَ جَاهِلًا وَلَا اَطْعَمْتَهُ إِذَا كَانَ سَاغِبًا۔

ترجمہ:- یہ نادان اور جاہل تھا تو تم نے اسے تعلیم نہیں دی اور یہ بھوکا تھا تو تم نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے کوئی سزا نہیں دی بلکہ خود باغ والے سے اس کا کپڑا واپس دلایا اور خود اپنے پاس سے اسے غلہ مرحمت فرمایا۔ اس حدیث میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے دراصل ایک بنیادی نکتہ ارشاد فرمادیا ہے۔ یعنی چوری کی سزا سے پہلے دو چیزیں ضروری ہیں اول تو اخلاقی اور ذہنی تعلیم و تربیت اور دوسرے معاشی فراغت۔ ان دونوں چیزوں کے بغیر قطع ید کی سزا نہیں دی جا سکتی۔

لہٰذا اگر تعلیم و تربیت سے یہ مرض دور ہو سکے تو ——— قطع ید کے بجائے یہی کرنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ اخلاقی تعلیم اور ذہنی تربیت اور ضروریاتِ زندگی مہیّا ہونے کے بعد بھی اگر کوئی چوری کرے تو وہ اجرائے حد کا مستحق ہوگا۔ یہی صورت حد زنا میں بھی ہے۔ جہاں معاشرے نے جائز نکاح میں ہزار طرح کی مالی اور رواجی رکاوٹیں ڈال رکھی ہوں اور حرام کاری بہ نسبت نکاح کے ہزاروں درجے سہل اور آسان ہو وہاں جرم زنا پر حد جاری کرنا کوئی انصاف نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک بھوک کے مارے کے لئے کچھ غلہ چرا لینے پر حد سرقہ لگانا قرینِ عدل نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حد وہاں لگتی ہے جہاں جائز وسائل کے موجود ہوتے ہوئے ناجائز ذرائع استعمال کئے جائیں اور ایسی حالت میں حدود و تعزیر سے پہلو تہی کرنا ہزار قسم کے جرائم اور فساد فی الارض کا سبب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایسی سوسائیٹیاں جہاں ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

والی کیفیت ہو، وہاں ایسی سزاؤں کے سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اسی لئے قدیم فقہائے کرام نے اس سلسلے میں بہت ہی کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ یعنی وہ بتانا چاہتے تھے کہ شدید محرکات کے باوجود یہ سزائیں نافذ نہیں کرنی چاہئیں۔

۲ دو قابلِ غور نکتے

اس سلسلہ میں دو قابل غور نکتے ہیں جن پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک نکتہ تو یہ ہے کہ سرقہ کی حد کے بیان سے چار آیات پہلے ایک بڑا اصولی

اور بنیادی حکم یہ بتایا گیا ہے کہ:-

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵/۳۳-۳۴)

ترجمہ:- جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی سزا بس یہی ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ یہ ان کے لئے اس دنیا میں تو رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا ہی عذاب ہے بجز ان لوگوں کے جو قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ، خود ہی باز آجائیں (اور توبہ کر لیں) تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ بڑے بخش دینے والے اور مہربان ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا بالکل وہی مفہوم ہے جو سبوتاج (SABOTAGE) کا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہاء کرام نے اس سے مراد ڈکیتی، بغاوت اور ہر وہ فتنہ و فساد لیا ہے جو اسلامی معاشرہ کے خلاف کاری ضرب لگانے کے لئے عمل میں لایا جائے۔ سود خوری کو بھی قرآن کریم نے اللہ اور رسول کے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔

بہر حال بغاوت ہو، ڈاکہ زنی ہو یا جو صورت بھی اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کی سی صورت اختیار کی جائے وہ چوری کی بہ نسبت زیادہ بڑا جرم ہے اور قرآن کریم نے اس کے لئے چار متبادل سزائیں تجویز فرمائی ہیں۔ قتل[1]۔ پھانسی[2]۔ قطع دست و پا[3] اور نفی من الارض[4]۔ (جس کے معنے ملک بدر کرنا بھی ہیں اور قید کر دینا بھی) اب اہل علم کو سوچنا چاہیئے کہ قرآن کریم نے چوری سے بڑے جرم کے لئے چار متبادل سزائیں رکھی ہیں تو اس سے ہلکے جرم یعنی چوری کے لئے صرف ایک ہی سزا کیوں؟ اگر چور سے بڑے مجرم کو ملک بدر یا قید کیا جاسکتا ہے تو چور کو جو چھوٹا مجرم ہے یہی سزا کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ قرآن کریم میں ایسا ہی ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی لفظی پیروی ہی ضروری ہے تو چور کی دوسری چوری پر آپ اس کا الٹا پاؤں کیوں کاٹتے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم نے تو چور کی سزا میں فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا فرمایا ہے فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَھُمَا وَاَرْجُلَھُمَا مِنْ خِلَافٍ تو نہیں فرمایا اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ حدیث شریف میں ایسا ہی آیا ہے اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اجتہاد فرما کر یعنی اسی محاربت کی آیت:۔

اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ۔ (۵/۳۳)

ترجمہ:۔ اور مخالف جہت سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں

ہی سے استنباط فرما کر یہ حکم دیا ہے کہ ایسے بدطینت انسانوں کو جو ایک مرتبہ ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی باز نہ آئیں صرف ایک ہاتھ کاٹ دینا کافی نہیں۔ انہیں بے دست و پا کر دینا چاہیئے اور اس کی

بہترین شکل مِنْ خِلَافٍ ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری گذارش یہی ہے کہ اگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے محاربت کی آیت سے استدلال فرما کر بایاں پاؤں (دوسری چوری میں) کاٹنے کا حکم دیا ہے اور سرقہ کی آیت کی لفظی پابندی کو ضروری نہیں سمجھا تو اسی آیت سے یہ استنباط بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح ایک معاشرے کو مخرب اثرات سے بچانے کے لئے بڑے مجرم (باغی یا ڈاکو) کو ملک بدری یا قید کی سزا بھی دی جاسکتی ہے اسی طرح اگر قاضی مناسب سمجھے تو چھوٹے مجرم (چور) کو بھی یہ سزا دی جاسکتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ ملک کا قید خانہ ایسا ہو جہاں تعلیم و تربیت اور نفسیاتی علاج کے ذریعے ذہنی تربیت دے کر اور کسب معاش کے لئے بہتر ہنر سکھا کر اسے اس سرقہ کی عادت سے باز رکھنے کا قوی امکان ہو۔ جب چور کو معافی بھی دی جاسکتی ہے۔ اور بعض اوقات وہ الٹا انعام بھی پا سکتا ہے۔ جب بھوک میں کسی کے باغ سے گری پڑی کھجوریں کھا پینے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ جب سفر اور قحط میں قطع ید سے احتراز کیا جاسکتا ہے۔ جب خادم کو اس سزا سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے جب ڈنڈ اور معمولی تعزیر پر اکتفا کی جاسکتی ہے اور ان سب حالات میں قطع ید کے قرآنی حکم سے کوئی تعارض یا تناقض لازم نہیں آتا تو کیا صرف ملک بدری اور قید ہی ایک ایسی چیز ہے جو حکم قرآنی کے خلاف جاتی ہے؟

چور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے

دوسری بات اس سلسلہ میں یہ بھی قابل غور ہے کہ اوپر کی زیر بحث آیت محاربہ میں ڈاکوؤں، باغیوں یا دوسرے

سبوتاج کرنے والوں کی سزا بیان فرمانے کے بعد حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵/۳۴)

ترجمہ:۔ مگر یہ مجرمین اگر اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ (گرفتار کرو) تو سمجھ لو کہ اللہ بخش دینے والا مہربان ہے۔

اب ذرا چور کی سزا بھی سن لیجئے۔ چور کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ○ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۵/۳۸-۳۷)

ترجمہ:۔ چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہ ان کے کرتوت کی سزا بھی ہے اور اللہ کی طرف سے (دوسروں کے لئے) عبرت بھی۔ یقیناً اللہ غلبہ اور حکمت والا ہے۔ پھر جو اپنی زیادتی کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح بھی کرلے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں غور کرنے کی بات صرف یہ ہے کہ محاربہ (سبوتاج) عام سرقہ سے بڑا جرم ہے۔ ایسے محاربین چاروں قسم کی سزاؤں سے محفوظ ہوجائیں گے اگر گرفتاری سے پہلے پہلے وہ توبہ کرلیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے۔ لیکن اگر سارق سزا پانے سے پہلے توبہ کرلے اور اس کے ساتھ

اصلاحِ حال بھی کرلے ـــــ بلکہ اگر چوری کا مال واپس بھی کردے ـــــ جب بھی وہ قطع ید سے نہیں بچ سکتا۔ سب کے نزدیک اس پر حد جاری کرنا ضروری ہے۔ اس کی وجہ؟ وجہ صرف یہی بتائی جاتی ہے کہ محاربین کی سزا کے بعد حرفِ استثناء اِلَّا آگیا ہے اور چوروں کی سزا کے بعد اِلَّا کے بجائے فَمَنْ آیا ہے۔ یعنی "اِلَّا" تو استثناء کے لئے آتا ہے اور "فَمَنْ" اس لئے نہیں آتا۔ لہٰذا بڑے مجرم کے لئے توبہ سے معافی ہوسکتی ہے۔ لیکن چھوٹے مجرم کے لئے یہ معافی نہیں ہے شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے احکام القرآن میں یہ بتانے کی بڑی کوشش فرمائی ہے کہ یہ معافی محارب کے لئے کیوں ہے اور سارق کے لئے کیوں نہیں ہے۔ لیکن بات بن نہیں سکی۔ کم از کم ہماری تسلی تو نہیں ہوسکی۔ وہ صرف اس لئے اس تفریق کے قائل ہیں کہ لوگ ایسا ہی مانتے چلے آئے ہیں اور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انہوں نے بڑی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا، ہماری تسلی نہیں ہوسکی۔ شاید اس کی وجہ ہمارا قصورِ فہم ہو۔ واللہ اعلم

آپ ذرا دونوں مجرموں کے لئے الفاظ کا مقابلہ کرکے دیکھئے۔

(محارب)	(سارق)
اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا	فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ۔
ترجمہ:۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں۔	ترجمہ:۔ پھر جو اس جرم کے بعد توبہ کرلے اور اپنی اصلاح کرلے۔
(۲) مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ۔	فَاِنَّ اللّٰهَ یَتُوْبُ عَلَیْهِ۔
ترجمہ:۔ گرفتاری سے پہلے۔	
(۳) ---------	

(۴) فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ:۔ تو سمجھ لو کہ اللہ بڑا غفور ورحیم ہے۔

ترجمہ:۔ تو یقیناً اللہ اس کی توبہ قبول فرمالے گا۔ بیشک اللہ

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ:۔ بڑا غفور ورحیم ہے۔

خوب غور سے دیکھئے۔ کیا سارق کے لئے "فَمَنْ" کا لفظ ٹھیک اسی طرح محل استثناء میں نہیں جس طرح محارب کے لئے "اِلَّا" کا لفظ آرہا ہے۔ قرآن کریم میں تقریباً اسّی جگہ فَمَنْ کا لفظ ہے اور جہاں بھی ایک عام کلیہ بیان کرنے کے بعد "فَمَنْ" کا لفظ آیا ہے وہ محل استثناء ہی میں ہے۔ مُردار، خون، لحم خنزیر، اور ما اہل لغیر اللہ بہ کا حکم بیان کرنے کے بعد کئی جگہ یوں استثناء فرمایا ہے:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔

(۲/۱۷۳)

ترجمہ:۔ پھر جو کوئی دلی خواہش اور زیادتی کئے بغیر حالت اضطرار میں کھالے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔

کیا اس آیت کریمہ میں "فَمَنْ" بالکل اسی طرح محل استثناء میں نہیں ہے جس طرح آیتِ ذیل میں "اِلَّا" ہے۔

------ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ۔

(۶/۱۱۹)

ترجمہ:۔ اور اللہ نے تمہارے لئے ان چیزوں کی تفصیل بیان کردی ہے جو اس نے تم پر حرام کی ہیں بجز اس کے جس کی طرف تم مجبور ہی ہو جاؤ۔

نیز صوم رمضان کا حکم دینے کے بعد:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ (۲/۱۸۳-۱۸۴)

ترجمہ:۔ تم پر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ تم سے پچھلی امتوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ یہ روزے چند گنے چنے دنوں کے ہیں۔

اس آیت میں ایک عام قانون بیان فرما کر اس کے بعد استثناء آرہا ہے:۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط

(۲/۱۸۴)

ترجمہ:۔ تو جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کردے۔

اسی سلسلہ میں آگے ایک کلی حکم آرہا ہے:۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ط

(۲/۱۸۴)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ بمشکل روزہ رکھ سکیں ان پر فدیہ واجب ہے، یعنی وہ ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

لیکن چونکہ یہ حکم لازم نہیں ہے اس لئے اس سے پھر استثناء آرہا ہے:۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ط (۲/۱۸۴)

ترجمہ:۔ پھر جو خوشی سے نیکی کرنا چاہے تو وہ اس کے لئے بہتر ہے۔

کیا ان تمام آیات میں "فَمَنْ" کا لفظ "اِلاَّ" کی طرح محل استثناء میں نہیں ہے؟ ایسی بیسیوں مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ سب کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذوق سلیم خود رہنمائی کر دیتا ہے کہ یہ دو مختلف اندازِ بیان ہیں اور مقصد دونوں کا کوئی استثناء ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا محارب ہو یا سارق، قابو پانے اور گرفتار ہونے سے پہلے پہلے توبہ اور اصلاح کا یقین دونوں کے لئے معافی کا سبب بن سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ چھوٹے مجرم (سارق) کے لئے اس کے امکانات بڑے مجرم (محارب، ڈاکو) کے مقابلہ میں زیادہ ہیں۔

بڑے ہی تعجب کی بات ہے کہ چور پر قابو پا لینے، اسے گرفتار کر لینے، اقرارِ جرم کر لینے، مال مسروقہ کے برآمد ہو جانے کے بعد بھی اگر چوری کی واردات سفر میں، زمانۂ قحط میں، اپنے آقا کے گھر میں یا مال خمس میں ہوئی ہو تو تمام فقہاء متفقہ طور پر چور کو معافی دیدینے کے قائل ہیں۔ لیکن اگر یہ باتیں نہ ہوں البتہ قابو پانے اور گرفتار کئے جانے سے پہلے وہ توبہ کر لے۔ اس کی اصلاح ہونے کا یقین ہو جائے تو ڈاکو اور باغی کو تو معافی دی جا سکتی ہے مگر چور کو معافی نہیں دی جا سکتی۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ آیت سرقہ میں "اِلاَّ" کا لفظ نہیں آیا بلکہ اسی معنی میں "فَمَنْ" کا لفظ آگیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان سزاؤں کا مقصد معاشرہ کی اصلاح ہے یا محض ہاتھ کٹواتے رہنا؟ خود ہی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ معمولی شبہات کو بھی اجرائے حدود سے بچنے کا بہانہ بنا لو اور جہاں تک ممکن ہو مجرم کو اجرائے حد سے بچاؤ کیونکہ غلطی سے سزا کو معاف

کر دینا اس سے کہیں بہتر ہے کہ غلطی سے سزا دیدی جائے۔ لیکن ایک قوی اور معقول شبہ کے ہوتے ہوئے کہ توبہ کے بعد بڑے مجرم کو معاف کیا جا سکتا ہے تو چھوٹے مجرم کو بطریق اولیٰ معاف کیا جانا چاہیئے۔ ہمارے فقہائے کرام سارق کو معاف کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ قاضی کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے کہ مجرم اجرائے حد سے بچ جائے اور اگر سزا دینی ہی پڑے تو جرم کی نوعیت، مجرم کے حالات، معاشرہ کے کوائف ساری باتوں کو نظر میں رکھ کر سزا دے، اور ہر جرم میں انتہائی سزا نہ دے البتہ جرم کی انتہائی شکل میں چور کا دایاں ہاتھ پہنچے سے کاٹ دیا جائے گا اور ہاتھ کو کاٹ کر پہلے زمانہ میں لوہے سے داغ دیا جاتا تھا۔ تاکہ خون بند ہو جائے ورنہ مجرم کی موت واقع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مقصد مجرم کو سزا دینا ہے۔ جان سے مار ڈالنا نہیں ہے۔ لیکن آج کل خون کو روکنے کے لئے داغ لگانے کی ضرورت نہیں میڈیکل سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ٹانکے لگا کر خون کو روکا جا سکتا ہے اس میں بہ نسبت داغ لگانے کے اذیت کم ہے۔ لہٰذا اسی کو اختیار کیا جائے گا۔

جس شخص کا دایاں ہاتھ چوری میں کاٹا جا چکا ہے اگر وہ دوبارہ چوری کرے تو فقہائے حجاز اور فقہائے عراق اس کے قائل ہیں کہ اب اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ بعض اصحاب ظاہر اور کچھ تابعین سے نقل کیا گیا ہے کہ دائیں ہاتھ کے بعد بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیئے کیونکہ قرآن کریم نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ پاؤں کاٹنے کا حکم نہیں

دیا۔ فقہائے حجاز و عراق اس پر اتفاق کرنے کے بعد کہ پہلی چوری میں دایاں ہاتھ اور دوسری چوری میں بایاں پاؤں کاٹنے کے بعد تیسری مرتبہ چوری کرنے میں امام سفیان ثوریؒ اور امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اب کچھ نہیں کاٹا جائے گا۔ قاضی اُسے کوئی دوسری سزا دے اور جس کا مال اس نے چرایا تھا اسے اس کا تاوان دلوائے۔ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری کرنے میں بایاں ہاتھ اور چوتھی مرتبہ چوری کرنے میں دایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۴۵۲-۴۵۳ ج ۲)

ہمارے خیال میں اصحاب ظاہر اور بعض تابعین کا یہ قول اقرب الی القرآن ہے کہ دوسری مرتبہ چوری کرنے پر چور کا بایاں ہاتھ کاٹنا چاہیئے۔ بایاں پاؤں نہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم نے پاؤں کاٹنے کا قطعاً کوئی حکم نہیں دیا۔ لہٰذا پاؤں نہیں کاٹے جا سکتے۔ نیز قرآن کریم نے فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَهُمَا کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ پہلی چوری میں سارق اور سارقہ کے ہاتھ کاٹنے کے لئے یَدَاهُمَا (ان کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں) فرما دینا کافی تھا۔ اَیْدِیَهُمَا (ان کے ہاتھ) جمع کے صیغہ کے ساتھ ارشاد فرمانے سے غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ بعد میں بھی ہاتھ کاٹنے کا عمل نافذ ہو سکتا ہے جمع کا اطلاق، تین اور تین سے زیادہ پر ہوتا ہے۔ لہٰذا دوسری چوری میں بھی ہاتھ ہی کاٹنا چاہیئے اور تیسری مرتبہ چوری کا جرم ثابت ہو جانے پر امام ابو حنیفہؒ اور سفیانؒ ثوری کا مذہب قرآن سے قریب تر ہے کہ اب کچھ نہیں کاٹا جائے گا کیونکہ ہاتھوں کو کاٹنے کا حکم تھا اور دو مرتبہ چوریوں میں دونوں ہاتھ کاٹے

جا چکے ہیں۔ اب ہاتھ ہی نہیں رہے۔ پاؤں کاٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ پاؤں کاٹنے کا حکم قرآن نے نہیں دیا۔

ویسے بھی یہ محض ایک فرضی صورت ہے کہ دو مرتبہ چوری میں دونوں ہاتھ گنوا دینے کے بعد کوئی شخص تیسری اور چوتھی مرتبہ بھی چوری کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔[1]

اگر چوری کئی آدمیوں نے مل کر کی ہے تو ہاتھ کاٹنے کے لئے مسروقہ مال کی جو مقدار مقرر کی جائے۔ اگر ہر چور کے حصہ میں اتنی ہی مقدار آ جائے جس پر ہاتھ کاٹے جا سکتے ہیں۔ تو سب کے ہاتھ کاٹ دیئے جائیں گے۔ اور اگر ہر ایک کے حصہ میں اتنا مال نہیں آتا تو کسی کے بھی ہاتھ نہیں کاٹے جا سکتے۔ پھر ان کو کوڑے مار دیئے جائیں۔

ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ مال مسروقہ کی وہ مقدار جس پر قطع ید کی سزا دی جائے گی اسلامی مملکت کی مجلس قانون ساز کو ملک کی اقتصادی حالات کے پیشِ نظر از سرِ نو متعین کرنی چاہیئے کیونکہ اب وہ اقتصادی حالات نہیں ہیں جو عہدِ رسالت مآب میں تھے۔ اس کے مطابق جو مقدار مقرر کی جائے اگر جماعت کی صورت میں کچھ لوگوں نے مل کر چوری کی ہے تو یہ دیکھنا

---

[1] میں نے ۱۹۵۰ء میں حج کے موقعہ پر حجاز کے ارباب اقتدار سے پوچھا تھا کہ سعودی گورنمنٹ کے قیام کے بعد سے کل کتنے چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے ہیں تو مجھے بتایا گیا تھا کہ تقریباً انیس سال کے عرصہ میں صرف تیرہ ہاتھ کاٹے گئے ہیں۔ اس سے قطع ید کے اثرات کا اندازہ کر لینا کچھ دشوار نہیں۔

ہو گا کہ ہر فرد کے حصّہ میں اتنا مال آتا ہے یا نہیں جس پر قطع ید کی سزا دی جانی چاہیئے۔ اگر ہر فرد کے حصّہ میں اتنی مقدار آجاتی ہے تو قطع ید کی سزا دی جاسکتی ہے ورنہ کوئی دوسری سزا دی جائے۔ اور قطع ید کی تعبیر بھی اس مال کی مقدار کے مطابق ہی طے کرنی چاہیئے یعنی ہاتھ کی ایک انگلی کاٹی جائے، دو انگلیاں کاٹی جائیں یا پہونچے سے ہاتھ کاٹا جائے۔ یہ مال کی مقدار کے مطابق طے کرنا ہوگا۔

شراب کی بوتلیں، خنزیر، اور تمام ناجائز اور حرام چیزیں چوری کر لینے میں ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ کیونکہ وہ شرعاً مال متقوم نہیں ہیں۔ قرآن کریم کے نسخے۔ صلیب، شطرنج، نرد، چوسر، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کو بھی فقہاء نے مال متقوم نہیں مانا چنانچہ ان چیزوں کی چوری کر لینے میں وہ قطع ید کی اجازت نہیں دیتے مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے۔ قرآن کریم نے ان کو کہیں حرام نہیں فرمایا کہ انہیں غیر متقوم قرار دیا جاسکے۔ یہ چیزیں غلط طور پر استعمال کرنے سے ناجائز ہوسکتی ہیں۔ لیکن ان کا جائز استعمال بھی تو ہوسکتا ہے۔ لہٰذا انہیں مال غیر متقوم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

ایسے ادارات سے چوری کرنے میں جو عوام (پبلک) کی ملکیت ہوں مثلاً سرکاری بنک، ڈاکخانے، عدالتیں، ہسپتال وغیرہ سے چوری کرنے میں سرقہ کی سزا دی جائے گی۔ کیونکہ یہ تمام ادارے گو پبلک کی ملکیت ہیں اور چوری کرنے والا شخص خود بھی پبلک ہی کا ایک فرد ہے۔ اس بناء پر یہ کہنا کہ اس چیز کی ملکیت میں وہ خود بھی شریک ہے۔ لہٰذا اس نے کوئی ایسی چیز نہیں چرائی جو بالکلیہ غیروں ہی کی ملکیت ہو، بلکہ اس نے ایسی چیز چرائی ہے جس میں

جزوی طور پر وہ خود بھی شریک ہے، قانونی موشگافی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ سوال یہ ہے کہ اسے عرف عام میں چوری کہتے ہیں یا نہیں۔ اس کی شناعت تو عام چوریوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا چوری میں رکھی گئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کو چوری ہی کہا جاتا ہے۔ پبلک مقامات سے چوری کرنے کو کچھ اور نہیں کہا جاتا۔ رہی اس کی جزوی شرکت تو وہ انتہائی غیر اہم ہے جس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

اس سلسلہ میں ہمارے فقہاء نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں فرمائی ہیں جن کا قرآن کریم کے فلسفۂ سزا سے کوئی تعلق نہیں مثلاً یہ کہنا کہ تین آدمیوں نے مل کر چوری کی۔ ایک نے نقب لگایا۔ دوسرا مکان کے اندر گھسا اور تیسرے نے چوری کا سامان باہر سے پکڑا تو کسی کا ہاتھ نہیں کاٹا جاسکتا۔ جس نے نقب لگایا، اس نے چوری نہیں کی جس نے اندر گھس کر سامان باہر پکڑایا اس نے نقب کردہ مکان سے یعنی ایک غیر محفوظ جگہ سے سامان اٹھایا ہے اور تیسرے شخص نے تو کچھ بھی نہیں کیا صرف سامان پکڑا ہے لہٰذا چوری کا جرم کسی پر بھی ثابت نہیں ہوا۔ محض قانونی موشگافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ نقب لگا کر مکان کو غیر محفوظ بنانا بھی تو چوری کرنے ہی کے لئے تھا۔ اسے چوری کا جزو قرار نہ دینا کون سا قانون ہے؟ ہم اس کی تائید نہیں کر سکتے۔ یہ قانونِ سزا

کو غیر مؤثر بنانے کی ترکیبیں ہیں جن سے خود قرآن اور اسلام بدنام ہوتے ہیں۔ ایسی سزاؤں سے کیا فائدہ جن پر عمل نہ کیا جا سکے۔

(باب قطع الطریق)

قطع طریق عربی زبان میں ڈاکہ زنی کو کہتے ہیں۔ یعنی ہتھیار کا استعمال کر کے۔ لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان کے اموال چھین لینا چوری کرنے میں جیسا کہ ہم نے کتاب السرقہ میں بتایا ہے چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال لیا جاتا ہے لیکن قطع الطریق (ڈاکہ زنی) میں چھپ کر رازداری کے ساتھ دوسروں کا مال نہیں لیا جاتا بلکہ علانیہ ڈرا دھمکا کر اسلحہ دکھا کر دوسروں کا مال لیا جاتا ہے۔ یہ جرم سرقہ سے زیادہ شدید ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کیا جاتا ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (۵/۳۳)

ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کریں اور

زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں ان کی سزا یہی ہے
کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے یا انہیں سولی دی جائے
یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں
یا انہیں سرزمینِ اسلام سے شہر بدر کر دیا جائے۔ یہ دنیا
میں ان کے لئے رسوائی ہوئی اور ان کے لئے آخرت میں
بڑا عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں اَلَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا کا فقرہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ عربی زبان میں حَرْبٌ کے اصل بنیادی معنیٰ ویرانی، تباہی و بربادی، تلف، سلب و نہب کے آتے ہیں۔ (محیط المحیط)

ابن فارس نے لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنے چھیننے کے ہیں۔ یہ لفظ سِلْمٌ (امن وصلح) کی ضد ہے۔

نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں حاء اور راء اکھٹے آئیں ان میں مشقت اور سختی کا مفہوم ہوا کرتا ہے۔
(کتاب الاشتقاق)

اسی وجہ سے حَرْبٌ کے معنے لڑائی اور جنگ کے ہوتے ہیں حَارَبَہٗ اس نے اس سے جنگ کی۔ نیز یہ لفظ سرکشی اختیار کرنے کے معنے میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ کُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہَ

وَرَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ ط (۹/۱۰۷)

ترجمہ:۔ اور جن لوگوں نے مسلمانوں کو باہم ضرر پہنچانے کفر کرنے اور مؤمنوں میں تفرقہ ڈالنے اور ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور رسول کے خلاف سرکشی اختیار کرتے ہیں۔ تاک لگانے اور گھات میں بیٹھنے کا اڈہ بنانے کے لئے پہلے سے ایک مسجد بنا ڈالی ہے۔

میں حَارَبَ کے معنی سرکشی اختیار کرنے ہی کے ہیں۔ لہٰذا سورۂ مائدہ کی آیت (۵/۳۳) میں اَلَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا کے معنے صرف ڈاکہ ڈالنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع معنوں کی حامل ہے۔ ڈاکہ ڈالنے کے لئے ہمارے فقہاء نے قطع الطریق کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم نے بھی سورۃ العنکبوت میں قوم لوطؑ کے متعلق تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَئِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ ط (۲۹/۲۹)

ترجمہ:۔ کیا تم (نفسانی خواہشات کے لئے) مردوں کے پاس آتے ہو اور ڈاکے ڈالتے ہو اور اپنی مجلس میں ناروا باتیں کرتے ہو۔

چنانچہ اس آیت میں صرف ڈاکہ زنی کے لئے قطع سبیل کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ بہرحال ڈاکہ ڈالنا حکومت کے قانون کو طاقت کے ذریعہ سے توڑنا اور سرزمین اسلام میں فتنہ وفساد

پھیلانا ہے جس میں ڈاکہ ڈالنا بھی شامل ہے لہٰذا اس کی وہی سزا ہے جو ایک باغی کی سزا ہوا کرتی ہے۔ اگر ایسے مجرموں کو اس سے پہلے کہ وہ کسی کا مال چھین سکیں یا کسی کو قتل کر سکیں گرفتار کر لیا گیا تو ان کو حکومتِ وقت اسلامی مملکت سے ملک بدر کر سکتی ہے خلفائے راشدین کے وقت میں ایسے مجرموں کو ملک بدر کر دینے کے بعد یہ سزا چونکہ ان کے ارتداد پر منتج ہوئی۔ لہٰذا خلفائے راشدین نے صحابہ کے مشورہ سے ایسے مجرموں کو بجائے ملک بدر کرنے کے قید کر دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ آج کے حالات میں بھی ملک بدر کر دینا ممکن نہیں رہا۔ کیونکہ اگر اپنے ملک سے ان کو نکال دیا گیا تو وہ کہاں جائیں گے جبکہ پاسپورٹ اور ویزا کی پابندیاں ہر ملک کی طرف سے عائد ہیں۔ لہٰذا اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ ایسے مجرموں کو جیسا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں کیا گیا تھا قید کر دیا جائے۔ لیکن ہمارے ہاں جیلیں اور قید خانے جرائم کی تربیت گاہیں بن گئے ہیں اس لئے یا تو ان کی مناسب اصلاح کی جائے یا پھر بجائے جیل بھیجنے کے حکومت وقت کو ڑوں کی سزا تجویز کرے۔ اگر ایسے لوگ دل سے توبہ کر لیں اور آئندہ ایسی حرکت کے اعادہ نہ کرنے کا یقین دلائیں اور حکومت کو اطمینان حاصل ہو جائے تو اُن کو رہا کیا جا سکتا ہے۔

اگر ان ڈاکوؤں نے کسی مسلمان یا ذمی کا مال لے لیا ہے لیکن کسی کو قتل نہیں کیا۔ اور اتنا مال لیا ہے کہ ہر ایک ڈاکو کے حصہ میں اتنا مال آجاتا ہے جس پر حد جاری ہونی چاہیئے (موجودہ حالات میں

حکومتِ وقت کو اس کی مقدار متعین کرنی ہوگی۔ دو، تین، یا دس درہموں پر حد جاری کر دینا آج کے حالات میں صحیح نہیں ہے) تو ایسے مجرموں کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ دینے چاہئیں لیکن یاد رہے کہ یہ انتہائی سزائیں ہیں۔ جرم کی سنگینی اور حالات کے تقاضوں کے ماتحت ہی کورٹ کو یہ سزائیں دینی چاہئیں۔

اگر ان ڈاکوؤں نے مال تو کچھ نہیں لیا۔ البتہ کچھ لوگوں کو قتل کر دیا ہے تو ایسی صورت میں ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ قتل کرنا بطور قصاص کے نہیں ہے بلکہ بطور حد کے ہے۔ لہٰذا اگر مقتولین کے ورثاء معاف کرنا چاہیں تو معاف نہیں کر سکتے نہ ہی خوں بہا لے سکتے ہیں اس پر تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات صحیح ہے۔

اور اگر ڈاکوؤں نے مال بھی چھینا ہے اور قتل بھی کیا ہے تو حکومت کو اختیار ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں کاٹ کر انہیں قتل کر دے۔ یا انہیں پھانسی دیدے۔ خواہ ان کو صرف قتل کر دے۔ خواہ ان کو صرف پھانسی دیدے۔ جرائم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے کورٹ مناسب فیصلہ کرے۔ امام محمدؒ کا ارشاد ہے کہ ان کو قتل کر دیا جائے یا پھانسی دیدی جائے۔ ہاتھ پاؤں نہ کاٹے جائیں۔

اگر پھانسی دی جائے تو شاہراہِ عام پر ان کی لاش لٹکا دی جائے تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو سکے۔ لیکن تین دن سے زیادہ لاش کو نہ لٹکایا جائے۔ کیونکہ تین دن کے بعد لاش گلنی سڑنی شروع ہو جاتی ہے جس سے لوگوں کو اذیت ہوتی ہے اور شہر کی ہوا

بھی خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا تھا کہ اَلَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا کے معنے صرف ڈاکہ ڈالنے ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے نہایت وسیع معانی کو حامل ہے۔ مثلاً مملکت اسلامی کے خلاف بغاوت کرنا، تخریب کاری کرنا، سول نافرمانی کرنا وغیرہ وغیرہ اس لئے ان پر ہم اپنے اپنے مقامات پر بحث کریں گے۔

(باب القصاص والجنایات)

الجنایات، جنایۃ کی جمع ہے۔ جنایۃ عربی زبان میں شر انگیزی کو کہتے ہیں۔ لیکن فقہ کی اصطلاح میں خصوصیت کے ساتھ اس شر انگیزی کو کہتے ہیں جس کا نشانہ انسانی جان یا انسانی اعضاء بنیں۔ یعنی کوئی شخص کسی کو قتل کر دے۔ اس کا کوئی عضو (مثلاً ہاتھ پاؤں) کاٹ دے یا دانت وغیرہ توڑ دے۔

تین چیزیں انسان کی عزیز ترین متاع کہلاتی ہیں۔ جان، مال، آبرو۔ اسلام جیسا کہ انسانی مال اور آبرو کو اہمیت دیتا ہے، اسی طرح وہ انسانی جان کو بھی انتہائی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں ایک آدمی کو بھی قتل کر دینا پوری نوع انسانی کو قتل کر دینے کے مرادف ہے۔ کیونکہ جو آدمی کسی ایک انسان کو قتل کرتا ہے وہ انسانی خون کی حرمت کو پامال کرتا اور دوسرے لوگوں کو اس فعل شنیع کی جرأت دلانے کا سبب بنتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ
فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا
فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (۵/۳۲)

ترجمہ:۔ اسی وجہ سے تو ہم نے بنی اسرائیل پر (تورات میں) لکھ دیا تھا کہ جو کوئی کسی شخص کو بغیر کسی نفس (کے بدلے) کے یا زمین میں فتنہ و فساد پھیلانے کے قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جو کوئی کسی کو مرنے سے بچالے تو اس نے پوری نوع انسانی کو مرنے سے بچالیا۔

کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کے لئے ایک مثال قائم ہو جاتی ہے اور اس طرح انسانی خون کی عزت و حرمت ختم ہوتی ہے سورۂ نساء میں ہے:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ
خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَ
اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○ (۴/۹۳)

ترجمہ:۔ اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے، اس کی جزاء جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور اللہ اس پر لعنت فرمائے گا اور اللہ نے اس کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

حق تعالیٰ نے اتنی اہمیت کسی جرم کو نہیں دی جتنی قتل عمد کے جرم کو دی ہے کہ اس کے لئے پوری پانچ سزائیں بیان فرمادی ہیں

(۱) اس کی سزا جہنم ہوگی۔ (۲) وہ جہنم میں ابدالآباد تک رہے گا۔ (۳) اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا۔ (۴) اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار برسے گی۔ (۵) اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ابدی جہنم کی سزا سوائے کافر اور قاتل عمد کے کسی کے لئے نہیں ہے۔ خود قرآن کریم نے اس سے پچھلی آیت میں فرمایا ہے کہ ایک مؤمن کا یہ کام ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ کسی مسلمان کو عمداً قتل کر دے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۔
(۴/۹۲)

ترجمہ:۔ اور کسی مؤمن کے لئے ممکن نہیں کہ وہ کسی مؤمن آدمی کو قتل کر دے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ط
(۱۷/۳۳)

ترجمہ:۔ اور جس جان کو قتل کرنا اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو۔ البتہ حق کے ساتھ قتل کر سکتے ہو۔

چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی حجۃ الوداع میں ایک لاکھ صحابہ کے مجمع میں یہی نصیحت فرمائی تھی:۔

اَلَا لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ

رِقَابَ بَعْضٍ ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، رزین
عن ابی بکرۃ بحوالہ جمع الفوائد ص۱۵ ج۱ و طبرانی کبیر
عن کلثوم بن جبیر بحوالہ جمع الفوائد ص۱۹۳ ج۱)

ترجمہ :۔ دیکھو، میرے بعد کافر ہو کر اسلام سے نہ
پھر جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

نیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔
سِبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ ۔ (بخاری
مسلم، ترمذی، نسائی عن ابن مسعود بحوالہ جمع الفوائد
ص۱۵۹ ج۲)

ترجمہ :۔ کسی مؤمن کو گالیاں دینا فسق ہے اور کسی مؤمن
سے لڑنا کفر ہے۔

مذکورہ بالا آیت (۱۷/۳۳) ہی میں ہے :۔
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا
فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ○ (۱۷/۳۳)

ترجمہ :۔ اور جو مظلوم کر کے قتل کر دیا جائے تو ہم نے
اس کے وارث (ولی) کے لئے قانونی غلبہ رکھ دیا ہے۔ لہٰذا
وہ خود قتل کرنے میں کوئی زیادتی نہ کرے۔ بلاشبہ اس کی
مدد کی جائے گی۔

یعنی خود اسلامی حکومت کی یہ ڈیوٹی اور فریضہ ہو گا کہ وہ
قانونی کارروائی کر کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔ لہٰذا
مقتول کے ورثاء کو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر قاتل سے انتقام

لینے میں کوئی زیادتی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلاشبہ ان کی پوری پوری
مدد کی جائے گی۔ ہم نے یعنی اسلام نے مقتول کے ورثاء کا انتقام
کا حق تسلیم کیا ہے (جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا) لہٰذا انہیں
اس کا بدلہ ضرور دلوایا جائے گا۔ انہیں از خود کوئی اقدام نہیں
کرنا چاہیئے۔

یہی مضمون سورۂ بقرہ میں بھی بیان فرمایا گیا ہے جہاں
ارشاد فرمایا ہے :۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي
الْقَتْلٰى ۔ (۲/۱۷۸)

ترجمہ :۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے
سلسلہ میں بدلہ دلانا تم پر فرض کیا گیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مقتول سے بدلہ لینا مقتول کے ورثاء کی
ذمہ داری قرار نہیں دی گئی۔ بلکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ
یعنی پورے مسلم معاشرے کو جس کی نمائندہ اسلامی مملکت
ہوتی ہے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا قتل کا جرم کسی فرد کے
خلاف نہیں ہے کہ وہ قاتل سے بدلہ (یعنی قصاص) لیتا پھرے
یہ جرم اسلامی مملکت کے خلاف ہے۔ وہ خود اس کا انتقام
لے گی۔ کیونکہ اس نے معاشرہ کے تمام افراد کے جان، مال، آبرو
کی حفاظت و صیانت کی ذمہ داری قبول کی ہوئی ہے۔ لہٰذا مملکت
کا فرض ہے کہ وہ خود اقدام کرے۔

قصاص امم سابقہ میں

قصاص اور دیت کا حکم اسلام میں کوئی نیا حکم نہیں ہے۔ قدیم اقوام میں بھی جب سے انسان تہذیب و تمدن سے آشنا ہوا ہے۔ اس پر عمل ہوتا تھا۔ امم سابقہ میں بھی جبکہ انسان محض قبائلی زندگی بسر کرتا تھا اس کا وجود ملتا ہے۔ بنی اسرائیل کے متعلق تو خود قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ :-

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ط (۵/۴۵)

ترجمہ :- اور ہم نے بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر سرابر بدلہ ہے۔

بنی اسرائیل کے علاوہ دیگر اقوام میں بھی اس کا رواج ملتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس میں جسے جیمس ہسٹیکنز نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی جلد چہارم چیپٹر "کرائمز اینڈ پنشمنٹ" کے ماتحت مصنف نے لکھا ہے کہ :-

"قدیم زمانہ میں قتل خطاء اور قتل عمد اور دیگر جنایات میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اپنے قبیلہ سے باہر چوری کر لینا یا قتل کر دینا کوئی عیب کی بات نہیں

سمجھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات اسے مستحسن سمجھا جاتا تھا۔ البتہ اگر انتقام کا اندیشہ ہوتا تھا تو اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ آگے چل کر جب اخلاقیات کا تصور پیدا ہوا تو قبیلہ سے باہر اور قبیلے کے اندر دونوں جگہ اس کی برائی تسلیم کر لی گئی ------ ملزم کی دولتمندی اور تنگدستی و فقر و فاقہ کی وجہ سے سزا میں فرق کیا جاتا تھا۔ پہلے اور دوسرے جرم میں بھی سزا کے اعتبار سے فرق کیا جاتا تھا۔ البتہ بعد کے جرائم میں قتل کی سزا دی جاتی تھی۔ پہلی چوری میں ایذا دی جاتی تھی۔ دوسری چوری میں انگلیاں کاٹ دی جاتی تھیں اور تیسری چوری میں ہاتھ اور ہونٹ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اور چوتھی چوری میں جان سے مار ڈالتے تھے -------- بعض قبائل میں جھوٹی گواہی دینے پر زبان کاٹ دی جاتی تھی۔ لیکن یہ عام دستور تھا کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قصاص بالمثل کا رواج تھا۔ یعنی ہاتھ کے بدلے ہاتھ، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون رائج تھا۔"

یہودی قانون اور حمورابی کے قانون میں قصاص کی سزا دی جاتی تھی۔ بعض قبائل میں انتہائی زیادتیاں کی جاتی تھیں۔ صاحبِ اقتدار لوگ جو اپنے آپ کو خدا ہی سمجھتے تھے ایک حاکم

اور مقتدر آدمی کے بدلے میں پورے کے پورے قبیلہ کو قتل کر ڈالتے تھے ------ جادو، خون، محرمات کے ساتھ زنا، دین سے انحراف، بغاوت، زنا اور چوری کی سزا جان سے مار ڈالنا تھی ------ قتل کی سزا کے مختلف طریقے رائج تھے۔ بعض طریقے نہایت ہی تحقیر آمیز، ذلّت آفریں اور نہایت ہی خوفناک ہوا کرتے تھے مثلاً سینہ میں نیزہ مار کر ہلاک کر دینا، آگ سے جلا دینا، اوپر سے گرا دینا، پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دینا، مجرم پر پوری دیوار گرا دینا، وغیرہ وغیرہ۔

دیت کا طریقہ بھی پرانے زمانہ میں رائج تھا جو غالباً قتل کے سلسلہ میں ہوتا تھا۔ جب کہ قاتل دشمن کے انتقام سے بچنے کے لئے مقتول کے ورثاء کو خطیر رقم ادا کرتا تھا۔ لیکن قتل عمد میں دیت کا رواج نہیں تھا ---------- بعض قبائل میں اپنے قبیلہ سے باہر قتل کر دینا کوئی عیب کی بات نہیں تھا۔ اور خون کا بدلہ لینا قومی فرائض میں شمار ہوتا تھا۔ اکثر حالات میں قاتل کو، قاتل کی اولاد کو اور اگر ان دونوں پر دسترس نہ ہو تو قاتل کے قبیلہ کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیا کرتے تھے اور تصور یہ تھا کہ جب تک کسی نہ کسی کو قتل نہ کر دیا جائے مقتول کی روح کو چین نصیب نہیں ہو سکتا ----------

قبائل میں عورت کو مرد کی پراپرٹی (جائیداد) سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے زنا کو ایک قسم کی چوری سمجھا جاتا تھا۔ اور بعض قبائل

میں تو محض ہاتھ لگانے کی سزا بھی موت ہوا کرتی تھی۔ بعض قبائل میں زنا کے جرم میں مرد کو مقطوع کر دیتے تھے۔ اور عورت کے چہرہ کو عیب دار بنا دیتے تھے۔ اور بار بار زنا کے جرم میں عورت کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن عام طور سے مرد اگر زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوئی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ چوری کی سزا عام قبائل میں قتل تھی۔ نیز شہر بدر کر دینا تھی --- ------ اگر کوئی چوری کرتا تھا اور اس کے پاس مال ہوتا تھا تو جس کی چوری کی گئی تھی اسے سارق کے مال سے دوگنا اور بعض مرتبہ دس گنا زیادہ تک دلوایا جاتا تھا۔

حمورابی کے قانون میں قذف (تہمت لگانے) کی سزا بھی موت تھی۔ بغیر گواہوں کے چیز خریدنے کی سزا بھی موت تھی۔ کسی کے گھر میں جا کر چوری کرنے اور کسی کا بچہ اٹھا لینے کی سزا بھی موت تھی۔ قتل خطاء (بلا ارادہ) میں دیت دی جاتی تھی۔ آزاد آدمی کی دیت نصف مانا چاندی۔ غلام اور باندی کے لئے ایک تہائی (⅓) مانا چاندی دی جاتی تھی۔ عورت اور مرد کی دیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کی دیت برابر تھی۔ اگرچہ وہ باقی تمام معاملات میں مردوں اور عورتوں میں مساوات کے قائل نہیں تھے۔ لیکن دیت کے مسئلہ میں مساوات پر عمل کرتے تھے۔ ڈاکٹر یا حکیم کی بے احتیاطی کی وجہ سے کسی کی موت واقع ہو جاتی تھی تو ڈاکٹر یا حکیم کے ہاتھ کاٹ دیتے تھے۔ اگر ایک غلام کی آنکھ ضائع کر دی جاتی تھی تو اس کی

آدھی دیت دی جاتی تھی۔ بعض حالات میں چوری کی سزا موت تھی۔ البتہ اگر ملازم نے سبزی چرالی یا گھر سے کھانے کی چیزیں چوری کرلیں تو ملازم کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔

چینی تہذیب میں قتل، زنا، چوری کے لئے مستقل قوانین نافذ تھے۔ کوڑے لگانے کی سزا بھی دی جاتی تھی جو بید سے دی جاتی تھی، چمڑے کے کوڑے سے نہیں۔ بید مارنے میں وہ اسقدر ماہر ہوتے تھے کہ اگر چاہتے تو تین کوڑوں ہی میں مجرم کی کھال ادھیڑ دیتے تھے اور اگر چاہتے تو ہزار کوڑوں میں بھی جسم کو کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ قتل، ڈاکہ، بغاوت، جعلی سکے بنانے، آگ لگانے کی سزا موت تھی۔ بارہ سال سے کم عمر کی لڑکیوں سے زنا کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ نیز نمک اسمگل کرنے کی سزا بھی موت تھی۔ سزا کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ آدمی کو ایک پنجرے میں قید کر دیا کرتے تھے۔ صاحب عزت اور مقتدر لوگوں کو سخت سزائیں نہیں دی جاتی تھیں۔ عورتوں کو قید و بند کی سزا نہیں دی جاتی تھی۔ البتہ عورت اگر زنا کی مرتکب ہوتی تھی تو شوہر کو اجازت تھی کہ اسے قتل کر دے۔

یونانیوں میں جرم کا تصور اللہ کی نافرمانی کا تھا۔ ان کے ہاں قتل کرنے کے جرم میں عاقبت کی سزا اور اللہ کی ناراضگی سے بچنے کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے گھر بار سے نکل جائے اور ملک بدر ہو جائے۔ البتہ اگر مقتول کے ورثاء دیت قبول کرلیں تو وہ اپنے گھر بار میں رہ سکتا تھا۔ یونانیوں میں دیت کا رواج

عام تھا۔ لیکن قتل خطا (بلا ارادہ قتل) میں سزا میں کمی اور تخفیف ہو سکتی تھی۔

یہودیوں میں قصاص تھا۔ دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون رائج تھا۔ قتل عمد اور قتل خطاء میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔

ہندوؤں میں مشہور تھا کہ سزا اور قصاص سے زندگی بڑھتی ہے اور اگر سزا اور قصاص نہ ہو تو لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں گے۔ جرمانے زیادہ تر کئے جاتے تھے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور کان کے بدلے کان کا رواج تھا۔ قذف (تہمت لگانے) کی سزا زبان کاٹ دینا تھی۔ البتہ برہمنوں کو سخت سزائیں نہیں دی جا سکتی تھیں۔

عرب میں قبل از اسلام جرم کو ایک قسم کی گندگی سمجھا جاتا تھا اور سزا سے صفائی ہو جاتی تھی۔ عربوں میں انتقام میں ایک کے بدلے کئی کئی آدمیوں کو مار ڈالنے کا دستور تھا اور دیت کا طریقہ بھی رائج تھا۔

(انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس بائی جیمس ہیسٹنگز جلد چہارم "کرائمز اینڈ پنشمنٹ")

اسلام سے پہلے عربوں میں انتقام اور بدلہ لینے کی بڑی اہمیت تھی۔ تاریخ العرب قبل الاسلام میں ہے کہ:۔

"اسلام سے پہلے عہد جاہلیت میں انتقام لینے کا تعلق ان کے عقیدہ سے تھا جو مقتول اور مقتول کے اہل وعیال سے متعلق تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں مقتول کی روح کو اس وقت تک قرار نہیں آتا تھا اور نہ اسے سکون حاصل ہو سکتا تھا جب تک اس کے خون کا انتقام نہ لے لیا جائے۔ اس کی قبر پر (اس کی روح کا) ایک پرندہ برابر پھڑ پھڑاتا رہتا تھا جو یہی پکارتا تھا "میری پیاس بجھا دو! میری پیاس بجھا دو!" اور جب تک اس کا انتقام نہ لے لیا جاتا اور قاتل کا یا قاتل کے خاندان کے کسی فرد کا قاتل کے بجائے خون نہ بہا لیا جاتا وہ بیتاب و بیقرار رہتا تھا۔ لہٰذا انتقام لینا محض عزت و شرف، حسب و نسب یا عرف اجتماعی کی بات ہی نہیں تھی بلکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس کا تعلق ان کے عقیدہ اور دینی رائے سے بھی تھا۔ مقتول کی روح برابر بے چین اور بے قرار رہتی تھی۔ لہٰذا جب تک قاتل یا اس کے اعزاء اور خاندان سے انتقام نہ لیا جائے خود مقتول کے اعزاء، اقرباء اور خاندان کی سلامتی کے لئے خطرہ رہتا تھا۔ اور اس ذہنی پریشانی سے نجات کے لئے ضروری تھا کہ ہر ممکن طریقہ سے ضرور ہی انتقام لیا جائے۔ لہٰذا وہ اس کے لئے ہر بڑے سے بڑے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

رہ گئی دیت تو اگرچہ وہ وقتی طور پر مخالفت و عداوت کو روک دیتی تھی لیکن اس سے نہ تو خون دھل سکتا تھا اور نہ دلوں

کو سکون حاصل ہو سکتا تھا۔ بلکہ دیت کو قبول کر لینا کمزوری اور مسکنت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ خون کا عوض مال نہیں ہو سکتا تھا اور نہ وہ دیت کے چند اونٹوں سے دھل سکتا تھا اس کے لئے تو خون ہی ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مقتول کے اعزاء دیت کو قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے اور خون کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہوتے تھے جب تک قاتل کا خون بھی اسی طرح نہ بہا لیا جائے جیسے مقتول کا خون بہایا گیا تھا۔ اکثر مقتول اپنے گھر والوں اور اپنے خاندان کو قسم دے جاتے تھے کہ وہ اس کے خون کو ضرور دھوئیں اور دیت قبول کر کے کسی کوتاہی کا ثبوت نہ دیں خواہ اس کے لئے انہیں کتنے ہی طویل زمانہ تک انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔"

(تاریخ العرب قبل الاسلام صـ ۳۴۱/۴ مطبع المجمع العلمی عراق مطبوعہ ۱۹۵۶ء)

اسلام سے پہلے عربوں میں اگرچہ انتقام کی بڑی ہی اہمیت تھی تاہم خاص حالات میں دیت کا رواج بھی موجود تھا اور اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ مصر کے مشہور مؤرخ جرجی زیدان کہتے ہیں کہ:

"زخمی جب زخم سے مر جاتا تھا اور آزاد ہوتا تھا تو دیت نصف من چاندی ہوا کرتی تھی اور اگر وہ آزاد کردہ غلام ہوتا تھا تو ایک تہائی من چاندی دیت ہوتی تھی۔ اور اگر کوئی طبیب کسی بیمار کا علاج کرتا اور اس کے ہاتھ پر اس کی موت ہو جاتی تو اگر

وہ آزاد ہوتا تھا تو طبیب کو دس شواقل چاندی دینی پڑتی تھی اور اگر مریض آزاد کردہ غلام ہوتا تھا تو طبیب کو پانچ شواقل چاندی دینی پڑتی تھی اور اگر مریض غلام ہوتا تھا تو طبیب کو دو شواقل چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا۔ اگر کوئی کسی آزاد آدمی کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو بدلہ میں اس کی ہڈی بھی توڑ دی جاتی تھی۔ اور اگر آزاد شدہ غلام کی ہڈی توڑ دیتا تھا تو توڑنے والے کو ایک من چاندی تاوان میں ادا کرنی پڑتی تھی اور اگر جس کی ہڈی توڑی گئی ہے وہ غلام ہوتا تو نصف من چاندی کا تاوان دینا پڑتا تھا (عربی میں من کے معنے وہ نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں ہوتے ہیں عربی میں من ایک سیر کو کہتے ہیں) باقی اسی پر قیاس کر لیجئے۔ تورات کے زمانہ میں یہودیوں میں بھی کچھ ایسا ہی قانون رائج تھا"

(العرب قبل الاسلام جرجی زیدان ص ۵۹/۲ مطبوعہ دار الہلال قاہرہ)

دیت کے سلسلہ میں دائرۂ معارف اسلامیہ میں ہے کہ:

"آئین دیت کی تاریخی اصل زمانۂ قبل اسلام کے رواجی دستور میں پائی جاتی ہے جب کہ یہ عرب کے معاشرتی نظام کے ساتھ لازم و ملزوم تھا۔ معاشرے کی بنیاد قبائلی زندگی پر تھی۔ ملک میں کوئی سیاسی اقتدار عام موجود نہیں تھا۔ بلکہ کسی قبیلہ میں علیحدہ شکل میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اپنا انصاف خود چکانے کا رواج تھا جس میں کسی حد تک پنچایت کے فیصلے کو بھی دخل ہوتا تھا۔ قتل کی صورت میں شخصی طور پر بدلہ (۔ ثار) (رک قصاص)

لینے کا قاعدہ خاص طور پر ہر جگہ نافذ تھا۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ اس حق سے باختیار خود کوئی دست بردار ہو جائے اور اس کے بدلے میں دیت لینا منظور کر لے۔ اس دیت کی مقدار اصولاً سو اونٹ مقرر تھی۔ کم از کم اس علاقے کے اندر جہاں اسلام وجود میں آیا۔ اگرچہ بعض روایات میں صرف دس اونٹوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ اس قاعدے پر عمل کرنے میں قبیلے کے تمام افراد کا بالقوہ اور بالفعل قوی اتحاد کام کرتا تھا۔ سارا قبیلہ مجموعی طور پر دیت کے ادا کرنے کا ذمہ دار تھا ---------- اسلام نے اس رواج کی اصل بنیاد میں مداخلت نہیں کی۔ قرآن مجید کی مختلف عبارتیں اس کی صراحۃً تصدیق کرتی ہیں۔ لیکن ان آیات میں بعض ترمیمات پائی جاتی ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ قتل خطاء میں بھی دیت ادا کرنا واجب ہوگا۔

(اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ص ۵۲۴ تا ۵۲۸/۹ ج مطبوعہ دانش گاہ لاہور)

اس ساری تفصیل سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اسلام سے پہلے متمدن اقوام میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں کیا قوانین نافذ تھے اور خود عربوں میں جہاں کوئی متحدہ حکومت قائم نہیں تھی بلکہ قبائلی نظام کے ماتحت ہی وہ زندگی بسر کرتے تھے۔ کیا رواج نافذ تھے۔ اسلام نے انہی رواجات اور قوانین کو بنیاد بنا کر اپنے قوانین نافذ کئے تھے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے چھٹے خطبہ میں اجتہاد کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ

رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اقتباس پیش کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

"لیکن جہاں تک مسئلہ اجتہاد کا تعلق ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان احادیث کو جن کی حیثیت سراسر قانونی ہے ان احادیث سے الگ رکھیں جن کا قانون سے تعلق نہیں (یعنی فقہی اور غیر فقہی احادیث کو مترجم) پھر اول الذکر کی بحث میں بھی ایک بڑا اہم سوال یہ ہوگا کہ ان میں عرب قبل اسلام کے اس رسم ورواج کا جسے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، یا جس میں حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی بہت ترمیم کر دی، کس قدر حصہ موجود ہے۔ لیکن یہ وہ حقیقت ہے جس کا اکتشاف مشکل ہی سے ہو سکے گا۔ کیونکہ علمائے متقدمین شاذ ہی اس رسم ورواج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ہمیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں کہ جس رسم ورواج کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا، خواہ حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالصراحت منظوری دی یا خاموشی اختیار فرمائی اس پر کیا سچ مچ ہر کہیں اور ہر زمانے میں عمل کرنا مقصود تھا؟ شاہ ولی اللہ نے اس مسئلے میں بڑی سبق آموز بحث اٹھائی ہے۔ ہم اس کا مفاد ذیل میں پیش کریں گے۔ شاہ ولی اللہ کہتے ہیں انبیاء کا عام طریق تعلیم تو یہی ہے کہ وہ جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں ان پر اسی قوم کے رسم ورواج اور عادات وخصائص کے مطابق شریعت نازل کی جاتی ہے۔ لیکن جس نبی کے سامنے ہمہ گیر اصول ہیں، اس پر نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول نازل کئے جائیں گے، نہ یہ ممکن ہے کہ وہ ہر قوم کو اپنی

اپنی ضروریات کے لئے الگ الگ اصول عمل متعین کرنے کی اجازت دے۔ وہ کسی ایک قوم کی تربیت کرتا اور پھر ایک عالمگیر شریعت کی تشکیل میں اس سے تمہید کا کام لیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں وہ اگرچہ انہی اصولوں کو حرکت دیتا ہے جو ساری نوع انسانی کی حیات اجتماعیہ میں کارفرما ہیں، پھر بھی ہر معاملے اور ہر موقعہ پر عملاً ان کا اطلاق اپنی قوم کی مخصوص عادات کے مطابق ہی کرتا ہے۔ لہٰذا اس طرح جو احکام وضع ہوتے ہیں۔ (مثلاً تعزیرات) ایک لحاظ سے اسی قوم کے لئے مخصوص ہوں گے پھر چونکہ احکام مقصود بالذات نہیں، اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ان کو آئندہ نسلوں کے لئے بھی واجب ٹھہرایا جائے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جو اسلام کی عالمگیر نوعیت کو خوب سمجھ گئے تھے احادیث سے اعتناء نہیں کیا۔ الخ

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ خطبۂ ششم ص ۲۶۵-۲۶۶

ترجمہ سید نذیر نیازی مطبوعہ بزم اقبال۔ کلب روڈ۔ لاہور)

علامہ اقبالؒ نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہما کے اقتباس سے جو نتائج اخذ فرمائے ہیں ان کے بیان میں ذرا سا الجھاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جناب علامہ قرآن کریم کے بیان فرمودہ احکام اور قوانین کو بھی ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے واجب العمل نہیں سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ سید نذیر نیازی مرحوم کو اسی بناء پر حاشیہ میں کہنا پڑا ہے:۔

"یہاں شاہ صاحبؒ کی عبارت سے ایک غلط فہمی کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس امر کی صراحت ناگزیر ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک میں تو یہی "عالمگیر شریعت" نازل ہوئی جس کی طرف شاہ صاحب اشارہ فرما رہے ہیں۔ رہا اس کے اطلاق میں قوموں کے احوال وخصائص کا مسئلہ سو یہ قانون کا مسئلہ ہے، شریعت کا نہیں۔ قرآن پاک کا صاف وصریح ارشاد ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔ (۱۳/۴۲) مترجم (حوالہ بالا)

ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم چونکہ تمام دنیا کے لئے ہے وہ صرف عربوں کے لئے نہیں ہے۔ اس میں کسی ملک، کسی قوم اور کسی زمانہ کی تخصیص نہیں کی جا سکتی وہ اللہ کا آخری پیغام ہے۔ اس کے بعد کوئی دوسرا پیغام آنے والا نہیں ہے اس لئے اس کی ہدایات ابدالآباد تک کے لئے ہیں۔ البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کو جو عملی جامہ پہنایا ہے وہ عربوں کے معاشری حالات اور ان کے احوال وظروف کے مطابق ہی پہنایا ہے۔ ہر نبی الٰہی ہدایات کے مطابق بطور خمیر کے کسی ایک قوم ہی کو تیار کرتا ہے تاکہ باقی اقوام کے لئے ان کے ذریعہ سے ہدایت کا سامان بہم پہنچائے تو ایک نبی کی یہ عملی تشکیل ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ کے لئے صورۃً بھی لابدی

نہیں ہوتی۔ الٰہی ہدایات کی یہ عملی تشکیل مختلف اقوام وملل اور مختلف زمانوں میں صورۃً مختلف ہو سکتی ہے جب کہ ان ہدایات الٰہیہ کی روح اور اسپرٹ ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔

[تفصیل کے لئے مولانا عبید اللہ سندھی کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" ملاحظہ ہو]

صورت زیر بحث میں قصاص اور دیت کے سلسلہ میں قرآن کریم نے قصاص کا حکم دیا ہے اور دیت کا حکم بھی دیا ہے لیکن دیت (خون بہا) کیا ہوگی اور کس مقدار میں ہوگی اسے قرآن کریم نے متعین نہیں فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جزئیہ کی عملی تشکیل عربوں کے معاشرتی حالات کو سامنے رکھ کر فرمائی اور سو اونٹ دیت کے سلسلہ میں مقرر فرما دیئے۔ کیونکہ عربوں میں اونٹ بکثرت ہوتے تھے اور یہی ان کے ہاں مال کی صورت تھی۔ لیکن دنیا کے ہر خطہ میں اونٹ نہیں ہوتے اور نہ وہ ہر علاقے میں مالی معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانہ میں اس کے معاشرتی حالات کے اعتبار سے دیت کی شرح مقرر کرنی پڑے گی اور جو قوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تربیت سے تیار کی تھی وہ دوسری قوموں میں ان کے معاشرتی حالات کے مطابق ہی اس کی تعیین اس طرح کرے گی کہ قرآنی ہدایت کی روح اور اسپرٹ تو وہی رہے گی دوسری قوموں کے حالات وکوائف کے مطابق اس میں صورۃً تبدیلی ہو جائے جو قریب قریب ناگزیر ہے۔ چنانچہ یہ

تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

دائرۂ معارف اسلامیہ میں ہے:۔

"تاہم بہت عرصہ نہ گذرنے پایا تھا کہ یہ قانون مسلمانوں کے جدید معاشرے کے حالات کے لئے عملاً سازگار نہ رہا۔ معاشرہ ترقی کر کے بہت جلد ایسی جماعت بن گیا جو نظری طور پر متحد اور بالخصوص ایک منظم ریاست کی صورت میں نمودار ہوئی۔

ان مخالفانہ مطالبات کے زیر اثر کام کرتے ہوئے ماہرین قانون نے دیت (اور ذاتی انصاف کے قانون (رک۔ قصاص) کا ایک نظریہ قائم کیا جس کے اندر مختلف میلانات کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ یہ نظریہ عموماً سنی اور شیعہ دونوں مسلکوں میں یکساں پایا جاتا ہے ------

دیت کی موجودہ صورت

موجودہ زمانہ میں دیت کا نظام دو خاص شکلوں میں مقامی حالات کے مطابق باقی نظر آتا ہے۔

بدوی قبائل میں جو بالطبع ہر نظام حکومت سے دلی مخالفت رکھتے ہیں ذاتی انتقام کا طریقہ ابھی تک جاری ہے جس کے ساتھ ساتھ دیت سے بھی حسب موقع کام لیا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد چند خصوصیات کے لحاظ سے ایسے رسم و رواج پر ہے جو قدیم عرب کے رسم و رواج سے ملتا جلتا ہے۔ اگرچہ ہر قبیلے میں اس کی صورت الگ الگ ہے ------

متعلقہ حکومتیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکیں کہ ان

جماعتوں کے طریق عمل پر چند پابندیاں عائد کر دیں جن کا دائرۂ اثر بھی محدود ہے۔

چنانچہ مصر، اردن اور شام میں یہ رسم تقریباً عام ہے کہ قتل عمد کے سوا ہر صورت میں دیت واجب ہے۔ دیت کے اجزائے ترکیبی میں قبیلے قبیلے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ صرف چالیس نر اونٹ یا چالیس نر اونٹ اور ایک دوشیزہ لڑکی یا نقد روپیہ (مثلاً مصر میں ۴۰۰ مصری پونڈ یا ۳۰۰ مصری پونڈ یا ۵۰ مصری پونڈ وغیرہ) عورت کی دیت مرد کی دیت سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض قبائل میں اس کی مقدار مرد کی دیت سے چار گنا یا آٹھ گنا تک زیادہ ہوتی ہے۔ اثباتِ جرم کے لئے آگ یا پانی سے گذرنے کا امتحان اکثر عمل میں آتا ہے۔ بعض قبائل میں عمل قسامت بھی دیکھا جاتا ہے۔

زیادہ ترقی یافتہ اور سیاسی حیثیت سے زیادہ منظم قوموں میں دیت دراصل اس لئے باقی رہی کہ اس کی نوعیت مذہبی حکم کی سی ہو گئی تھی۔ اس کی مخصوص مثال حکومت عثمانیہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہاں انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے قریب زمانۂ حال کے مطابق قانون کی اصلاح ہو چکی تھی اور نقصان رسیدہ کے معاوضے کا قانون (معاوضے کے صحیح معنوں کے لحاظ سے) نافذ کر دیا گیا تھا۔ اور اس کے مطابق قانون عامہ باقاعدہ معمول بہ ہو چکا تھا۔ پھر بھی اہل مقدمہ کے قصاص کا اور آگے چل کر دیت کے مطالبہ کا حق باقی رکھا گیا۔ خاص طور پر

۱۸۶۳ء کے قانون تعزیرات میں سرکاری طور پر دیت کی مقدار دو سو چوبیس تر کی پونڈ معین کی گئی تھی۔

اب عملی طور پر یہ سب باتیں، دستور سازی سے غائب ہو چکی ہیں۔ لیکن پہلے حالات کے آثار جن کا مٹانا سخت مشکل ہے ابھی تک باقی ہیں۔ بعض ممالک جیسے شام میں عدالتیں اگرچہ قانون کی ظاہراً و باطناً پابند ہیں اور دیوانی اور فوجداری قوانین زمانۂ حال کے تقاضے کے مطابق ۱۹۴۹ء سے جاری ہیں۔ پھر بھی وہ دیات ادا کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں جس کی مقدار قتل انسان کی صورت میں یکمشت رقم ہوتی ہے اور اس کی کمی بیشی قتل عمد یا قتل خطاء کے لحاظ سے معین کی جاتی ہے۔

(اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جلد نہم ص ۵۲۴ تا ۵۲۸
مطبوعہ دانش گاہ پنجاب۔ لاہور)

قصاص اور دیت کے اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہم قرآن کریم کی فقہی جزئیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

(القصاص)

قصاص کا مادہ قصص (ق ص ص) ہے۔ اس کے بنیادی معنے کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہوتے ہیں۔ کسی کے نقش قدم پر چلنا۔ (تاج العروس) ابن فارس نے کہا ہے کہ اس لفظ کے بنیادی معنے کسی چیز کا پیچھا کرنے اور جستجو کرنے کے ہیں۔

سورۂ کہف میں ہے:۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ○ (۱۸/۶۴)

ترجمہ:۔ موسیٰ نے کہا! اسی کو تو ہم تلاش کر رہے تھے چنانچہ دونوں اپنے نشاناتِ قدم کی پیروی کرتے ہوئے واپس لوٹے۔

سورۂ قصص میں ہے:۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○ (۲۸/۱۱)

ترجمہ:۔ ام موسیٰ نے موسیٰ کی بہن سے کہا! اس کے

پیچھے پیچھے جاؤ، چنانچہ وہ کنارہ سے اسے دیکھتی ہوئی چلتی رہی اور فرعون کے لوگوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

قَصَّ عَلَيْهِ الْخَبَرَ قَصَصًا - اسے وہ خبر بتا دی، اس پر اسے مطلع کر دیا۔ چونکہ واقعہ کے متعلق اس کے وقوع پذیر ہونے کے بعد ہی بتایا جاتا ہے اس لئے اس میں پیچھے چلنے کے معنے پائے جاتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں ہے:۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ (۱۲/۱۳)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! ہم آپ سے بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ اَلْقِصَّةُ معاملہ، خبر اور واقعہ کو کہتے ہیں جو وقوع پذیر ہو چکا ہے اور اس کے بعد ہی لوگوں سے بیان کیا جائے گا۔ قَصَّ الشَّعْرَ اس نے بال کاٹے۔ اَلْمِقَصُّ قینچی کو کہتے ہیں جس سے بال کاٹے جائیں۔ بال کاٹنا بھی بال پیدا ہو جانے کے بعد ہی عمل میں آتا ہے۔ اگر کسی کے بال ہی نہ ہوں تو کیا کاٹا جائے گا۔ اَلْقِصَاصُ مجرم کا اس طرح پیچھا کرنا کہ اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہے۔ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دیدینا۔ قانونِ عدل کا مجرم کے پیچھے پیچھے چلنا۔ اس کی تلاش اور جستجو کرنا۔ راغب نے اس کے معنے خون کے پیچھے خون بہا (مالی بدلہ دیت) کا آنا کئے ہیں۔ (مفردات) قرآن کریم نے اس لفظ کو خصوصیت کے ساتھ جرم قتل کی سزا کے سلسلہ میں استعمال کیا ہے۔ اس میں خون کے بدلے خون اور خون کے بدلے دیت

دونوں شامل ہیں۔ چنانچہ ان معنوں کے لحاظ سے قِصَاصٌ کا لفظ جرم قتل کی سزا کے لئے ہوگا۔ خواہ وہ موت کی سزا ہو یا دیت ہو۔ پھر کثرت استعمال سے اس کے معنے جرم کے بدلے کے کئے جانے لگے۔

جرم قتل کے متعلق پہلی آیت سورۂ بقرہ میں آئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ط (۲/۱۷۸)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے بارے میں تم پر قاتل کا پیچھا کرنا (یا قتل کا بدلہ لینا اور سزا دینا) فرض کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثاء اور اولیاء کو نہیں فرمایا گیا ہے، بلکہ خطاب جماعت مؤمنین کو یعنی مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو ہے۔ اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل کا پیچھا کرے اس کی تلاش اور جستجو کرے اور اسے اس کے جرم کی سزا دے۔ جس کو تکلیف اور اذیت پہنچائی گئی ہے اسے اس کا بدلہ دلایا جائے۔ مجرم کو یونہی نہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ کسی انسان کو قتل کر کے یا اسے ایذاء پہنچا کر دندناتا پھرے اور اپنے کرتوت کی سزا نہ پا سکے۔ قصاص کے معنے ہمارے ہاں عام طور پر صرف سزائے موت کے کر دیئے جاتے ہیں جو صحیح نہیں ہیں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے۔ قِصَاصٌ کے معنے قتل کے مجرم کا پیچھا کرنا۔ اس کا تعاقب کرنا اور اس کی

تلاش و جستجو کرنا ہیں تاکہ اسے اس کے جرم کی سزا دی جاسکے صرف سزائے موت کے نہیں ہیں۔ وہ سزائے موت بھی ہوسکتی ہے، سزائے دیت بھی ہوسکتی ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، ناک بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت کی سزا بھی ہوسکتی ہے۔

اسلام سے پہلے دنیا بھر میں یہ رواج تھا کہ قتل کے مجرم سے انتقام لینا مقتول کے ورثاء اور اس کے خاندان کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ یعنی وہ خود مجرم کا پیچھا کریں، اس کو تلاش کریں اور اس سے انتقام لیں۔ اس دور میں عموماً منظم حکومتیں نہیں تھیں۔ زیادہ تر قبائلی نظام رائج تھا۔ جہاں کسی درجہ میں منظم حکومتیں قائم بھی تھیں وہاں بھی وہ اپنی ابتدائی شکل میں تھیں لیکن عرب میں تو ابتدائی شکل میں بھی منظم حکومت کا کوئی وجود نہیں تھا۔ لہٰذا اس کا امکان ہی نہیں تھا کہ اس قسم کی جنایات کی سزا کی ذمہ داری حکومت کی قرار دی جائے۔ چنانچہ مقتول کے ورثاء اور اولیاء خود ہی قاتل کو تلاش کرتے اور اس سے انتقام لیتے تھے۔ اجتماعی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے افراد کے لئے یہ کام آسان نہیں تھا کہ وہ اصل مجرم کو تلاش کرلیں اور اسی سے انتقام لیں۔ لہٰذا اس سلسلہ میں بڑی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ صحیح قاتل نہ مل سکے تو قاتل کے خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ نیز اگر مقتول کا خاندان متمول اور طاقتور ہوتا تھا تو ایک آدمی کے بدلے ایک ہی آدمی کو قتل نہیں

کرتے تھے بلکہ ایک آدمی کے بدلے دس دس آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اگر مقتول غلام یا عورت ہوتی تھی تو چونکہ مقتول طاقتور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کے بدلے میں قاتل کے خاندان سے آزاد آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ رواج عزت، حسب و نسب اور عرف اجتماعی کی وجہ سے ہی نہیں تھا بلکہ یہ ان کے عقیدہ اور دینی و مذہبی رائے کی وجہ سے بھی تھا۔ تاریخ العرب قبل الاسلام کا اقتباس اس سلسلہ میں پہلے گذر چکا ہے۔

چونکہ عربوں میں مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کر دینا ضروری نہیں تھا بلکہ قاتل کے گھر یا خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دینا ضروری سمجھا جاتا تھا اس لئے قرآن کریم نے مذکورۂ بالا آیت (۲/۱۷۸) میں ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ یہ رواج غلط ہے۔ مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کو قتل کیا جانا چاہیئے۔ اس کے گھر یا خاندان کے کسی دوسرے آدمی کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ جس نے جرم کیا ہے اسی کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى

(۲/۱۷۸)

ترجمہ: آزاد قاتل کی جگہ اسی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل غلام کی جگہ اسی غلام کو قتل کیا جائے گا۔ قاتل عورت کی جگہ اسی عورت کو قتل کیا جائے گا۔

چنانچہ شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ:

"اور حق تعالیٰ کا ارشاد اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ اسی کا بیان ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور اسی کی تاکید ہے۔ حق تعالیٰ نے اس میں اس حال کو بیان فرمایا ہے جس کے لئے یہ کلام صادر ہوا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو شعبیؒ اور قتادہؒ نے بیان فرمائی ہے کہ عرب کے دو خاندانوں میں جنگ چلتی آرہی تھی۔ ان میں ایک خاندان کو دوسرے خاندان پر برتری حاصل تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اس کے بغیر راضی نہیں ہو سکتے کہ اپنے ایک غلام کے بدلے میں تمہارے آزاد آدمی کو اور اپنی عورت کے بدلے تمہارے مرد کو قتل کریں گے۔ تو حق تعالیٰ نے ان کی تردید کرتے ہوئے یہ حکم نازل فرمایا کہ ـــــ مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص (بدلہ) فرض کیا گیا ہے آزاد کی جگہ وہی آزاد اور غلام کی جگہ وہی غلام قتل کیا جائے گا (جس نے قتل کے جرم کا ارتکاب کیا ہے) ـــــ اس سے اس کا ابطال کیا گیا ہے جو وہ چاہتے تھے اور ان کو تاکید کی گئی ہے کہ قصاص کی فرضیت قاتل ہی پر ہے کسی دوسرے پر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ غیر قاتل کو قتل کر دیتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کو اس سے منع فرما دیا ہے اسی مضمون کی وہ روایت بھی ہے جس میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ـــــ اللہ کے

نزدیک قیامت کے دن ظالم ترین شخص تین آدمی ہوں گے۔ (۱) وہ آدمی جو قاتل کے بجائے کسی دوسرے آدمی کو قتل کر دے (۲) وہ آدمی جو حرم میں کسی کو قتل کر دے اور (۳) وہ آدمی جو عہد جاہلیت کا انتقام وصول کرے الخ

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۵۶ ج ۱ مطبوعہ المطبعۃ البہیۃ المصر ۱۳۴۷ھ)

اسلام نے عرب میں پہلی مرتبہ ایک منظم حکومت قائم فرمائی اور قبائلی نظام حکومت کو ختم کیا۔ اور اس طرح قانونی فرماں روائی کی بنیاد رکھی۔ آیت مذکورہ بالا میں خطاب مقتول کے ورثاء کو نہیں فرمایا گیا بلکہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو خطاب فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى۔ (۲/۱۷۸)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے بارے میں قصاص (قاتل کی تلاش، جستجو، پیروی اور اس سے بدلہ لینا) تم پر (تمہاری ہیئتِ اجتماعیہ پر) فرض کیا گیا ہے۔

یعنی قتل کا جرم کسی فرد کے خلاف نہیں ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کرے اور اگر اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ مجرم کو پکڑ کر اس سے انتقام لے سکتا ہو تو اس سے بدلہ لے لے۔ اور اگر مجرم کوئی

بڑا آدمی ہو جس پر مقتول کے ورثاء کو دسترس نہ ہو سکے تو وہ صبر کر کے بیٹھ رہیں بلکہ یہ جرم مسلمانوں کی پوری ہیئت اجتماعیہ اور اسلامی معاشرہ کے خلاف ہے۔ لہٰذا معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مجرم کا پیچھا کرے اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے۔ پورے معاشرہ کا فریضہ ہے کہ وہ قاتل سے مقتول کا بدلہ لینے کا انتظام کرے۔ قتل عمد کی صورت میں قتل اور قتل خطاء کی صورت میں خوں بہا وصول کرے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ جرم قابل دست اندازیٔ پولیس ہے۔ اس میں مستغیث مقتول کے ورثاء نہیں بلکہ خود اسلامی حکومت ہوتی (CROWN VS-) ہے۔ ورثاء جرم کے شاہد ہو سکتے ہیں مستغیث نہیں ہوں گے۔

جو چیز کسی پر فرض کی جاتی ہے اس کی ادائیگی وہی کرتا ہے جس پر وہ فرض کی گئی ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ (۲/۲۱۶) كُتِبَ عَلَيْكُمْ ..... الْوَصِيَّةُ (۲/۱۸۰) کی وجہ سے صیام، قتال اور وصیت کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ لہٰذا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ (۲/۱۷۸) کے معنے بھی یہی ہوں گے کہ قصاص تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ اب اگر قصاص کے معنی صرف سزائے موت کے لئے جائیں تو ظاہر ہے تمام مسلمانوں پر سزائے موت تو فرض نہیں ہے۔ سزائے موت تو قتل عمد کے مجرم ہی پر فرض ہے مگر یہاں اس کی فرضیت تمام مسلمانوں پر فرمائی گئی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ قصاص کے

معنے سزائے موت کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنے قاتلوں کو تلاش کرنے۔ ان کی جستجو کرنے، ان کا تعاقب کرنے، انہیں کیفر کردار تک پہنچانے، اور ان سے مقتول کا بدلہ وصول کرنے کے ہیں، کیونکہ یہی چیزیں تمام مسلمانوں پر فرض ہو سکتی ہیں اور فرض ہیں۔ سزائے موت تو تمام مسلمانوں پر فرض نہیں ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطاء۔ قتل عمد یہ ہے کہ آدمی جان بوجھ کر کسی کو بالارادہ قتل کر دے اس کی سزا، سزائے موت ہے اور قتل خطاء یہ ہے کہ غلطی سے کوئی آدمی کسی کے ہاتھ سے قتل ہو جائے مثلاً کسی نے ایک ہرن پر گولی چلائی اور وہ غلطی سے کسی انسان کو لگ گئی۔ اس صورت میں قاتل کو خوں بہا یعنی دیت دینی لازم ہے۔

(قتل عمد)

قتل عمد یہ ہے کہ کوئی آدمی دوسرے آدمی کو کسی ہتھیار سے یا کسی ایسے طریقے سے قتل کر دے جس سے عموماً قتل کیا جاتا ہو تو اسے قتل عمد کہا جائے گا کسی کو خاصے بڑے پتھر سے مار ڈالنا یا آگ سے جلا دینا بھی قتل عمد میں شامل ہے غرضیکہ کسی ایسے طریقے سے کسی کی جان لے لینا جس سے عام طور پر قتل کا کام لیا جاتا ہو قتل عمد کہلائے گا خواہ کسی آلہ کے ذریعہ سے ہو یا بغیر آلہ کے مثلاً زہر پلا دینا یا گلا گھونٹ دینا یا جوڈو کراٹے

سے ایسی ضرب لگانا۔ یا پانی میں ڈبو دینا وغیرہ جس سے دوسرے کی موت واقع ہو جائے۔

قتل عمد کے سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً ج (۴/۹۲)

ترجمہ:۔ اور مؤمن کے لئے ناممکن ہے کہ وہ کسی مؤمن کو قتل کر دے اِلّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔

اس سے آگے ہے:۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○ (۴/۹۳)

ترجمہ:۔ اور جو کوئی کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا غضب اس پر نازل ہوگا اور اللہ کی لعنت اور پھٹکار اس پر برسے گی اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اسی سلسلہ میں سورۂ مائدہ میں ہے:۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ط وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ

اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (۵/۴۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے تورات میں یہودیوں پر فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک اور دانت کے بدلے دانت کی سزا دی جائے اور زخموں کا بھی بدلہ ہو۔ تو جو کوئی معاف کر دے تو اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کریں تو وہی لوگ تو ظالم ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اگرچہ جو احکام بیان کئے گئے ہیں وہ بنی اسرائیل کے لئے ہیں لیکن چونکہ ان احکام کی تبدیلی یا نسخ کو نہ قرآن کریم نے بیان کیا اور نہ سنت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا اس لئے یہ احکام ہمارے لئے بھی ایسے ہی واجب العمل ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے لئے واجب العمل تھے کیونکہ شرائع من قبلنا ہمارے لئے بھی ایسے ہی حجت ہوتی ہیں جیسا کہ وہ گذشتہ امم کے لئے حجت ہوتے تھے بجز اس صورت کے کہ قرآن کریم نے یا سنت نبوی نے ان کو تبدیل نہ کر دیا ہو۔ لہٰذا جو شخص کسی مسلمان کو جو محفوظ الدم ہو عمداً قتل کر دے اس کو مقتول کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔

آزاد آدمی غلام کے بدلے میں

اسی طرح اگر کوئی شخص جو آزاد ہو کسی غلام کو قتل کر دے تو اس غلام کے بدلے میں اس آزاد آدمی کو قتل

کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا خیال ہے کہ غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور غلام اور آزاد میں مساوات موجود نہیں ہے۔ حنفیہؒ کا خیال ہے کہ قصاص میں جیسا کہ آزاد آدمی مَعْصُوْمُ الدَّمْ ہوتا ہے ایسے ہی غلام بھی معصوم الدم ہوتا ہے۔ عصمتِ دم جیسا کہ دین سے حاصل ہوتی ہے ایسے ہی دار سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ آزاد آدمی اسلامی مملکت (دار الاسلام) کا باشندہ ہے ایسے ہی غلام بھی اسلامی مملکت کا باشندہ ہے۔ لہٰذا وہ بھی معصوم الدم ہے۔ خون کی عصمت میں دونوں برابر ہیں۔ لہٰذا مساوات قائم ہے۔ لہٰذا قصاص نہ لینے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ (جان کے بدلے جان) فرمایا ہے اور انسانی جان جیسے آزاد آدمی میں ہے ایسے ہی غلام میں بھی ہے۔ لہٰذا آزاد اور غلام میں فرق و امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔

ذمی کے بدلے میں مسلم

اگر ایک اسلامی مملکت میں کوئی مسلمان کسی غیر مسلم (ذمی) کو قتل کر دے تو امام شافعیؒ کے نزدیک غیر مسلم کے بدلے میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا خیال یہی ہے کہ چونکہ دونوں میں مساوات نہیں ہے۔ ایک مسلمان ہے

اور دوسرا کافر۔ مسلمان اور کافر برابر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حضرات حنفیہؒ کا خیال یہاں بھی وہی ہے کہ چونکہ دونوں اسلامی مملکت (دار الاسلام) کے باشندے ہیں۔ لہٰذا عصمتِ دار دونوں کو حاصل ہے اور غیر مسلم کی حفاظت و صیانت کا حکومت نے عہد کیا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کی جان کی حفاظت بھی حکومت کا فریضہ ہے۔ لہٰذا دونوں میں قصاص ہونا چاہیئے۔ قرآن کی رو سے ہم فقہائے حنفیہؒ کی تائید کریں گے۔ ہماری دلیل وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کر دی ہے۔ کہ قرآن کریم نے اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے (یعنی جان کے بدلے جان) انسانی جان جیسی ایک مسلمان میں ہوتی ہے۔ غیر مسلم میں بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ امام شافعیؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے استدلال فرمایا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ:

لَا یُقْتَلُ مُؤْمِنٌ بِکَافِرٍ۔

ترجمہ:۔ کوئی مؤمن کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔

اس ارشاد کو امام بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اور ابوداؤد و ابن ماجہ نے حضرت عبداللہ ابن عمرو سے اور بخاری نے اپنی تاریخ میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حنفیہؒ نے ارشاد قرآنی کے ساتھ

(ملاحظہ ہو جصاص) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے استدلال فرمایا ہے جسے دار قطنی، بیہقی، امام محمدؒ امام شافعیؒ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ذمی اور معاہد کے بدلے میں مسلمان کو قتل فرمایا تھا۔ اور ارشاد فرمایا تھا کہ :-

اَنَا اَحَقُّ وَ اَوْلٰی مَنْ اَوْفٰی بِذِمَّتِہٖ۔

ترجمہ :- میں اس کا زیادہ حق دار اور اقرب ہوں کہ اپنے عہد اور ذمہ داری کو وفا کروں۔

ہمارے نزدیک آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کریم سے قریب تر ہے۔ رہ گئی پچھلی حدیث تو وہ بھی ہمارے خلاف نہیں ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی مؤمن ایسے کافر کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا جو حربی اور غیر معاہد ہو۔

(مذکورہ بالا احادیث کے لئے الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ص ۵۶۲/۴۷ بر حاشیۂ ہدایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی اور اعلاء السنن ص ۸۲/۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی ملاحظہ فرمائیے۔)

مستامن کے بدلے میں

اگر کوئی غیر مسلم امان لے کر اسلامی مملکت میں آیا ہو اور اسے کوئی مسلمان قتل کر دے تو فقہائے حنفیہؒ بھی اس کے قائل ہیں کہ اس کے بدلے میں مسلمان قاتل کو قصاص میں قتل نہیں

کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یہ دلیل دی ہے کہ امن حاصل کر کے آنے والا غیر مسلم مستقل طور پر یا ابدی طور پر محفوظ الدم نہیں ہے۔ لہٰذا اُسے کوئی مسلمان یا ذمی اگر قتل کر دے تو اس میں قاتل کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی قرآن کریم نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ :-

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (۹/۶)

ترجمہ :- اگر مشرکین میں سے آپ سے کوئی پناہ مانگے تو آپ اسے پناہ دے دیجئے حتی کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امن (حفاظت) کی جگہ تک پہنچا دیجئے۔ یہ حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (حقیقت کا) علم نہیں رکھتے۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی مشرک بھی تم سے امان طلب کرے اور تم اسے امان دینا مناسب سمجھو تو ضرور امان دو اس کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایسے محفوظ مقام تک پہنچا دیا جائے جہاں اس کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اگلی آیتوں میں مشرکین ہی کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے کہ ان سے تو کوئی معاہدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو وہ نہ تو تمہارے کسی رشتہ کا لحاظ کریں گے نہ کسی معاہدہ کا۔ ایسے

لوگوں کے متعلق بھی یہی حکم ہے کہ اگر وہ امان یا پناہ مانگیں اور تم مناسب سمجھو تو انہیں امان دیا جائے اور ان کی پوری حفاظت کی جائے اور ان کو ان کے محفوظ و مامون مقام تک پہنچایا جائے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ مستقل طور پر محفوظ الدم نہیں ہیں۔ اس لئے اگر کوئی اُنہیں قتل کر دے اور قتل کرنے والا مسلمان یا ذمی ہو تو قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا قرآن کے خلاف ہے۔ حضرات فقہائے کرام کے زمانے میں جو حالات ہوں سو ہوں مگر موجودہ حالات میں ویزا لے کر جو غیر مسلم ہمارے ملک میں آتے ہیں وہ عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی حکومتوں کو ہماری مملکت تسلیم کرتی ہے۔ اور ان سے ہمارے معاہدے ہیں جن کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ جن حکومتوں کو ہم تسلیم نہیں کرتے مثلاً اسرائیل اور جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومتیں ان کے لوگ ویزا لے کر بھی ہمارے ملک میں نہیں آسکتے۔ وہ اس ضمن میں آتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے محولہ بالا آیت میں حکم دیا ہے کہ اگر وہ بھی امان حاصل کرنا چاہیں تو انہیں امان دے سکتے ہو، ان کی حفاظت کی جائے اور کلام اللہ کو سننے کے بعد انہیں ان کے محفوظ مقام تک پہنچایا جائے۔ باقی تمام مستأمن (ویزا لے کر آنے والے) معاہد ہیں اور ان کے متعلق قرآن کریم کا صریح ارشاد ہے کہ:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ

الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (۹/۷-۸)

ترجمہ:۔ مشرکین کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کوئی عہد کیسے ہو سکتا ہے۔ بجز ان لوگوں کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر لیا تھا۔ تو جب تک وہ تمہارے لئے معاہدہ کی پابندی کریں تم بھی ان کے لئے معاہدہ کی پابندی کرو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ (عہد شکنی سے) پرہیز کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (ان سے جدید معاہدے) کیسے ہو سکتے ہیں، اور وہ اگر تم پر غالب آجائیں تو تمہارے بارے میں وہ نہ کسی رشتہ داری کا لحاظ کریں گے اور نہ کسی معاہدہ کا۔ وہ اپنے منہ سے (نکلی ہوئی باتوں سے) تمہیں خوش کرتے ہیں لیکن ان کے دل ان کی باتوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور ان میں سے اکثر فاسق ہی ہیں۔

سورۂ توبہ کی یہ آیات مشرکین عرب کے متعلق ہیں جن کے متعلق تمام فقہاء بالاتفاق اس کے قائل ہیں کہ ان سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ ان سے یا تو اسلام قبول کیا جا سکتا ہے یا وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ ان کو ذمی بنا کر نہیں رکھا جا سکتا

لیکن ان کے متعلق بھی حق تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر وہ پناہ طلب کریں اور تم انہیں پناہ دیدو تو ان کے جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کا فریضہ ہے۔ حتی کہ کلام الٰہی سنانے کے بعد انہیں ان کے محفوظ و مامون مقام تک پہنچا دینا بھی مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ عرب کے سوا دوسرے نومسلموں کے لئے بھی بدرجۂ اولیٰ اس کی پابندی ضروری ہوگی۔ ویسے عالم جنگ میں بھی کوئی مسلمان اگر کسی کافر کو پناہ دیدے تو اس امان کا احترام کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جسے کسی مسلمان نے پناہ دیدی ہو، پناہ دینے والا مرد ہو یا عورت ہو یا غلام ہو، اسے قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ چنانچہ ابو داؤد میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ اگر کوئی عورت بھی مسلمانوں کی طرف سے کسی کافر کو پناہ دیدے تو یہ پناہ دینا جائز ہوگا۔ یعنی اس کی پابندی سب کو لازم ہوگی۔

(بحوالہ جمع الفوائد ص ۱۳ ج ۲ مطبوعہ مطبعہ خیریہ میرٹھ)

بخاری اور مسلم میں ہے کہ:۔

فتح مکہ کے موقعہ پر حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ اس وقت غسل فرما رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا "یہ کون ہے؟" ام ہانیؓ نے کہا کہ "میں ام ہانی ہوں"۔ پھر حضرت ام ہانیؓ نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول! میرا ماں جایا بھائی (حضرت علیؓ) کہتا ہے کہ وہ ہبیرہ کے لڑکے (یعنی میرے شوہر) کو قتل کر دیں گے۔

حالانکہ میں اسے پناہ دے چکی ہوں"۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تم نے جس کو پناہ دیدی ہم نے بھی اسے پناہ دیدی"۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الغسل، باب التستر فی الغسل۔ وکتاب الصلوٰۃ، باب الصلوٰۃ فی الثوب الواحد عن ام ہانیؓ وصحیح مسلم کتاب الحیض)

اس سے ظاہر ہے کہ جب عین میدانِ جنگ میں کسی بھی مسلمان کے پناہ دیدینے کے بعد چاہے پناہ دینے والی عورت ہی کیوں نہ ہو اس کا احترام تمام مسلمانوں پر فرض ہے تو جو لوگ خود حکومتِ وقت کی امان کے بعد اسلامی حکومت میں داخل ہوں اس کا احترام کیوں ضروری نہیں ہوگا۔ موجودہ حالات میں جو کفار اسلامی حکومت میں امان کے ساتھ (ویزا لے کر) داخل ہوتے ہیں ان کے جان و مال کی حفاظت تمام مسلمانوں کا فرض ہے اور ان کا حکم وہی ہونا چاہیئے جو ان کفار کا ہوتا ہے جو مستقل طور پر ذمی کی حیثیت سے دارالاسلام میں رہتے ہوں۔ لہٰذا ایسے مستأمن کو اگر کوئی مسلمان قتل کر دے تو قصاص میں ایسے قاتل کو قتل کیا جانا چاہیئے۔ ھذا ما رأیتہ واللہ اعلم

قصاص میں کوئی امتیاز نہیں

تمام فقہاء متفق ہیں کہ اگر مقتول عورت ہو یا بچہ ہو، اندھا ہو، اپاہج اور معذور ہو، لنگڑا یا لولنجا ہو یا مجنون ہو تو اس کے قاتل کو جو مرد ہو، بالغ ہو، بینا ہو، صحیح

الاعضاء ہو اور عاقل ہو تو اگر قاتل نے عمداً قتل کیا ہے تو قاتل کو قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ کیونکہ قاتل اور مقتول کے درمیان ان تفاوتوں کا لحاظ کرنے سے قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا اور لوگوں کی جانیں محفوظ نہیں رہیں گی۔ ہم بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان۔ (اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ) کا حکم دیا ہے اور جان جیسے ایک مرد میں ہوتی ہے عورت میں بھی ہوتی ہے، جیسے ایک عاقل و بالغ میں ہوتی ہے ایک مجنون اور نابالغ بچہ میں بھی ہوتی ہے۔ جیسے ایک تندرست اور توانا آدمی میں ہوتی ہے ایک نابینا اور اپاہج اور معذور میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جان اور جان میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم کا یہی ارشاد ہے۔

بیٹے کے بدلے میں باپ

اگر باپ یا ماں نے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا ہو یا دادا، دادی نے اپنے پوتے کو اور نانا، نانی نے اپنے نواسے کو قتل کر دیا ہو تو امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد ابن حنبلؒ کا ارشاد ہے کہ قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ البتہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر ماں، باپ، دادا، دادی اور نانا، نانی نے بچہ کو واقعی ذبح کیا ہو تو انہیں قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ البتہ اگر انہوں نے تادیباً کوئی چیز پھینک کر ماری اور وہ کسی نازک مقام پر لگ گئی جس سے بچہ کی موت واقع ہو گئی تو چونکہ تادیب و تنبیہ کا شبہ موجود ہے اس لئے ان کو قصاص میں قتل نہیں کیا

جائے گا۔ جمہور فقہاء نے حضرت عمرؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ کی اس حدیث سے استدلال فرمایا ہے جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ باپ کو بیٹے کے قتل پر قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس حدیث کو دار قطنی، ترمذی اور حاکم و بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔ بیہقی نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے۔ ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ یہ حدیث مشہور ہے۔ اہل حجاز اور اہل عراق سب نے اس حدیث کو قبول فرمایا ہے۔

(اعلاء السنن ص۱۸۶ ج۱۷ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی)

چونکہ باپ، ماں۔ دادا، دادی اور نانا، نانی میں شفقت پدری و مادری کے باوجود اس کا امکان بہت ہی بعید ہے کہ وہ عمداً اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ لہٰذا زیادہ تر احتمال اسی کا ہے کہ باپ ماں وغیرہ کے ہاتھوں اگر اولاد کا قتل عمل میں آیا ہے تو وہ خطأً ہی ہوا ہوگا۔ اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمادیا ہوگا کہ باپ کو بیٹے کے قصاص میں قتل نہ کیا جائے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات نقل کئے گئے ہیں وہ مخصوص واقعات و حالات سے متعلق ہو سکتے ہیں انہیں عام قانون نہیں کہا جا سکتا۔ فقہاء کی طرح حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم مفروضات پر قانون سازیاں نہیں فرماتے تھے بلکہ جب کوئی واقعہ پیش آجاتا تھا اور اس کا حکم آپ سے دریافت کیا جاتا تھا تو صورتِ حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے

اس کا حکم آپ بیان فرمادیا کرتے تھے۔ لہٰذا عین ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس واقعہ میں یہ ارشاد فرمایا ہو اس میں تنبیہ و تادیب کا شبہ موجود ہو اس لئے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا ہو۔ قرآن کریم نے عام مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھود کرید کرنے سے منع فرمایا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (۵/۱۰۱)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم (فرضی) چیزوں کے متعلق سوالات نہ کیا کرو کہ اگر ان کا حکم ظاہر کر دیا جائے تو تمہارے لئے تکلیف کا باعث بن جائے۔

اسی آیت میں اس کے بعد ہے:۔

وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ○ (۵/۱۰۱-۱۰۲)

ترجمہ:۔ اور اگر تم قرآن کے نزول کے زمانہ میں ان کے متعلق سوالات کرو گے تو تمہیں ان کے احکام بتادیئے جائیں گے۔ اللہ نے تمہیں اب تو معاف فرمادیا (لیکن آئندہ احتیاط رکھو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت فرمانے والے اور بڑے ہی بردبار ہیں۔ تم سے پہلے بھی ایک

قوم (بنی اسرائیل) نے ایسے ہی سوالات کئے تھے پھر جب ان کو ان کا حکم بتادیا گیا تو) وہ ان کے منکر بن گئے۔

احادیث کا شانِ نزول

خود حق تعالیٰ نے اپنے اصول اور احکام، مسائل کی صورتیں فرض فرما کر نازل نہیں فرمائے۔ بلکہ جب تک کوئی مسئلہ واقعی طور پر پیش نہیں آگیا اس کا حکم نہیں بنایا۔ چنانچہ کتاب الٰہی کی تکمیل میں تیئیس ۲۳ سال کا عرصہ لگ گیا۔ حق تعالیٰ کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک دفعہ ہی پوری کی پوری کتاب نازل فرما دیتا۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ تدریجی طور پر احکام نازل فرمائے کہ جب کوئی حادثہ پیش آگیا تو اس کا حکم نازل فرمادیا۔ اور مسلمانوں کو بھی مسائل کی کھوج کرید کرنے سے منع فرمادیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لامحالہ اسی سنت الٰہی کی پیروی فرمانا تھی۔ آپ نے بھی جو احکام بیان فرمائے ہیں لامحالہ وہ بھی یونہی فرضی طور پر بیان نہیں فرمادیئے ہوں گے۔ بلکہ واقعات وحادثات کے بعد ہی بیان فرمائے ہوں گے۔ مگر ہماری یہ غلط نگہی حیرت ناک ہے کہ کتاب الٰہی کے متعلق تو جو قانون کی کتاب (Text Book) ہے۔ اس کے بیان فرمودہ احکام واصول میں تو ہم ان واقعات وحوادث (شانِ نزول) کی تلاش وجستجو اور چھان بین کرتے ہیں جن کے سلسلہ میں وہ اصول واحکام نازل ہوئے تھے۔ لیکن ان کی تشریح وتبیین میں جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں ہم قطعاً اس کی فکر نہیں کرتے

کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ تشریح و تبیین کب فرمائی تھی۔ کن حالات میں فرمائی تھی۔ کس واقعہ میں فرمائی تھی۔ حالانکہ قانون کی جو اصولی اور بنیادی کتاب (Text Book) ہے۔ اس میں ہمیں اس کی جستجو نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ قانون کے تو الفاظ دیکھے جاتے ہیں کیونکہ قانون کا ہر لفظ اپنے معنے اور اپنا مقصد رکھتا ہے۔ وہ واقعات و حوادث کا پابند نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے یہ فیصلہ فرما رکھا ہے کہ:

اَلْعِبْرَۃُ لِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا لِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ۔

ترجمہ:۔ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوگا۔ مخصوص واقعہ کا جس میں وہ وارد ہوا ہے کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

کیونکہ ایک قانون کی حیثیت ہی یہ ہونی چاہیئے اور ہوتی ہے لیکن قرآنی احکام کے لئے تو ہم شانِ نزول کی تلاش کرتے ہیں لیکن ان واقعات و حوادث کی ہم کوئی فکر ہی نہیں کرتے جن پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ان اصول و احکام کو منطبق (APPLY) فرمایا تھا۔ چنانچہ ارشاداتِ نبوی کے متعلق ہمیں نہ ان کی تاریخ معلوم ہے۔ نہ وہ واقعہ یا حادثہ معلوم ہے جس پر آپؐ نے قرآن کریم کے کسی حکم کو منطبق فرمایا تھا۔ اس طرح ہم نے اصل قانون کو فرع بنا ڈالا ہے اور فرع کو اصل بنا ڈالا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم نے فقہ میں بڑی ہی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔

بہرحال اس مسئلہ میں ہم امام مالکؒ کے قول کو ترجیح

دیتے ہیں اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو کسی خاص واقعہ پر محمول کرنے پر مجبور ہیں جس میں تنبیہہ و تادیب کا شبہ موجود تھا لہٰذا وہ قتل عمد نہیں بلکہ قتل خطا تھا۔ واللہ اعلم۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں ایسے والدین کا وجود بھی عنقا نہیں ہے جو اپنی توہم پرستانہ شقی القلبی کا بدترین نمونہ ہیں۔ اخبارات اس کے شاہد ہیں کہ باپ نے بیٹے کو کسی جنسی اشتعال میں یا خواب میں بیٹے کو قربان کرتے ہوئے دیکھ کر بیٹے کو پوری شقاوت کے ساتھ ذبح کر ڈالا۔ کیا ایسے باپوں کے متعلق بھی یہی کہا جائے گا کہ باپ نے شفقت و مرحمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیٹے کو ذبح کر دیا تھا۔ ایسے والدین یقیناً اس کے مستحق ہیں کہ انہیں عبرتناک سزا دی جائے اور تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے۔

مجھے ان حضرات پر حیرت ہوتی ہے جنہوں نے اپنے موقف کی تائید میں یہ دلیل پیش فرمائی ہے کہ باپ ماں تو بچہ کی حیات کا سبب ہیں ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اولاد کو قتل کر دیں گے۔ لہٰذا ماں باپ کو اولاد کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات نے کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہوتا ہے میں کوئی فرق نہیں کیا۔ یقیناً والدین کو ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں۔ لیکن سوال تو اس کا ہے کہ اگر وہ قتل کر دیں تو کیا ان کو اس کی سزا دی جائے گی یا نہیں۔

کون نہیں جانتا کہ عربوں میں دختر کشی کا رواج تھا اور لوگ اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ کیا لڑکیاں اولاد نہیں ہوتی تھیں۔ خود قرآن کریم نے اس قبیح رسم کا تذکرہ کئی جگہ کیا ہے مثلاً :-

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ○ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ○

(۸۱/۸)

ترجمہ :- اور خیال کرو جب زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم میں قتل کی گئی تھی۔

ایسے درندہ صفت انسان ہر زمانہ اور ہر معاشرہ میں ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ تو اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اسے سزا یقیناً دی جانی چاہیئے۔ قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ کا عام قانون بیان کیا ہے۔ اس نے کہیں ماں باپ، دادا دادی، اور نانا نانی کا استثناء نہیں فرمایا عدالت کو دیکھنا چاہیئے کہ بچہ کا قتل عمداً ہوا ہے یا کسی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر عمداً قتل ہوا ہو تو قتل عمد کی سزا دی جائے اور خطاً قتل ہوا ہے تو قتل خطاء کی کارروائی کی جائے۔

اپنے غلام مدبّر اور مکاتب کے بدلے

فقہاء نے ایک مسئلہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اپنے غلام یا مدبّر یا مکاتب کے بدلے میں مالک کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ اقسام اب موجود نہیں ہیں۔ لیکن اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ یہ اقسام وجود پذیر ہو جائیں تو ہمارا

خیال ان کے متعلق بھی یہی ہے کہ مالک کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ مالک اگر اپنے غلام یا مدبر یا مکاتب کو قتل کر دے تو مالک کو قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام نخعیؒ کا ارشاد ہے کہ مالک قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۳۹۸/۲)

حنفیہ میں سے امام زفرؒ کا بھی یہی خیال ہے۔

(اعلاء السنن ص ۹۴/۱۸)

ہمارا خیال ہے کہ امام نخعیؒ اور امام زفرؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ قرآن کریم نے جان کے بدلے جان کا حکم دیا ہے۔ اور جان غلام اور مدبّر اور مکاتب میں بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس قرآنی حکم میں غلام اور مدبّر و مکاتب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

ہمارے فقہائے کرام نے اس کی یہ دلیل دی ہے کہ غلام مدبر اور مکاتب کے قصاص کے حق کا ولی خود مالک ہوتا ہے اور کسی چیز کو اگر صاحبِ حق کی اجازت سے تلف کر دیا جائے تو ضمان ساقط ہو جاتا ہے۔ اور یہاں تو خود صاحبِ حق ہی تلف کرنے والا ہے۔ لہٰذا قصاص ساقط ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص کسی آدمی سے خواہش کرے کہ مجھے قتل کر دو اور وہ آدمی اسے قتل کر دے تو قتل کرنے والے آدمی پر قصاص نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس نے خود مقتول کی خواہش پر اسے قتل کیا ہے۔ (اعلاء السنن ص ۹۴/۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

لیکن یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے خیال میں یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ غلام، مدبر اور مکاتب کے حق قصاص کا ولی خود اس کا مالک ہوتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں یقیناً ایسا تھا۔ لیکن اسلام کے آجانے کے بعد حق قصاص کی ولی خود اسلامی حکومت ہوتی ہے۔ کوئی فردِ واحد نہیں ہوتا۔ اس پر ہم تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں اس سلسلہ میں فقہائے کرام نے جو مثال پیش فرمائی ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔ آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے خواہش کرے کہ تو مجھے قتل کر دے اور اس اجازت کی وجہ سے قاتل، جرم قتل سے بری الذمہ ہو جائے۔ آدمی کی جان حق تعالیٰ کی ملکیت ہے۔ لہٰذا اس کے خون کی ولی بھی اسلام کی نمائندہ حکومت ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی کے کہنے سے اگر کوئی آدمی جرم کرے تو جرم پھر بھی جرم ہی رہے گا۔ اگر کسی نے کسی کے کہنے پر کسی آدمی کو قتل کر دیا تو قتل پر اُکسانے والا بھی مجرم ہے اور قتل کرنے والا بھی۔ مجرم یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تو فلاں کے کہنے پر قتل کیا ہے۔ لہٰذا مجرم وہ ہے جس نے مجھے قتل کرنے کو کہا تھا۔ لہٰذا اسے قصاص میں قتل کیا جائے۔ ایسے ہی مذکورہ صورت میں بھی مجرم دونوں ہیں۔ جس نے قتل کیا وہ بھی مجرم ہے اور جس نے خواہش کی تھی کہ مجھے قتل کر دو وہ بھی مجرم ہے۔ خواہش کرنے والا چونکہ مر چکا ہے اس لئے اس سے قصاص تو نہیں لیا جا سکتا۔ وہ عذاب الٰہی کا مستحق ہوگا اور قاتل چونکہ زندہ ہے۔ اس لئے اس سے قصاص

لیا جائے گا۔

دوسرے کے غلام کے بدلے

اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کے غلام کو قتل کر دیا تو امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ، ابو ثورؒ اور لیثؒ کا قول یہ ہے کہ قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ قاتل اور مقتول ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ نیز قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ۔ (۲/۱۷۸)

ترجمہ: تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین کے سلسلہ میں۔ آزاد، آزاد کے بدلے میں۔ غلام، غلام کے بدلے میں اور عورت، عورت کے بدلے میں۔

لہٰذا آزاد آدمی کو آزاد آدمی کے بدلے ہی میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ غلام کے بدلے میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات کا یہ استدلال اگر صحیح ہے تو پھر غلام اگر کسی آزاد آدمی کو قتل کر دے یا کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو قتل کر دے تو وہاں بھی قصاص نہ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ کا وہ مطلب نہیں ہے جو یہ حضرات اس سے نکال رہے ہیں۔ بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس آزاد آدمی نے قتل کیا ہے وہی قتل کیا جائے گا۔ وہ اپنے بدلے میں اپنے کسی غلام یا معتقد کو قتل کے لئے پیش نہیں کر سکتا یا جس غلام نے قتل کیا ہے وہی غلام قتل کیا جائیگا۔

جس عورت نے قتل کیا ہے وہی عورت قتل کی جائے گی۔ زمانۂ جاہلیت میں جو یہ دستور تھا کہ وہ قاتل کے خاندان کے کسی بھی آدمی کو قتل کر دیتے تھے وہ غلط تھا۔ نیز قوی اور زور آور خاندان والے قاتل کے خاندان سے اپنے غلام کے بدلے میں آزاد آدمی کو، عورت کے بدلے میں مرد کو اور ایک مقتول کے بدلے دس دس آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے وہ بھی غلط تھا۔ قصاص میں صرف اسی آدمی کو قتل کیا جا سکتا ہے جس سے جرم کا ارتکاب ہوا ہو۔ دوسروں کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور نخعیؒ اس کے قائل ہیں کہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی کے غلام کو قتل کر دیا ہے تو قاتل کو قتل عمد میں قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ ہم اسی قول کے حق میں ہیں۔ کیونکہ انسانی جان قابلِ احترام ہے اور اس کو قتل کرنا حرام ہے۔ وہ آزاد ہو تب بھی اور غلام ہو تب بھی۔

(بدایۃ المجتہد ص ۳۹۸ ج ۲)

اگر قصاص کا وارث بیٹا ہو

ہمارے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور اس بیوی کا وارث اس کا بیٹا ہے جو قاتل (شوہر) کا بھی بیٹا ہے۔ تو چونکہ حقِ قصاص کا وارث بیٹا ہے۔ لہٰذا قصاص ساقط ہو جائے گا کیونکہ بیٹا اپنے باپ سے قصاص نہیں لے سکتا۔ ہمیں اس سے بھی اختلاف ہے۔ ہم اس بنیاد کو تسلیم نہیں کرتے کہ حق قصاص کا وارث اور ولی

مقتولہ کا بیٹا ہے۔ ہمارے نزدیک حق قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہوتی ہے نہ کہ مقتول کے ورثاء۔ لہٰذا حکومت ہی مدعی ہوتی ہے اور وہی حق قصاص کی وارث ہوتی ہے۔ لہٰذا بیٹے اور باپ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مقتول کے ورثاء اگر نابالغ ہوں

ہمارے بعض فقہاءؒ کا خیال ہے کہ اگر مقتول کے ورثاء نابالغ ہوں یا کوئی ایک وارث یا چند وارث نابالغ ہوں تو چونکہ حق قصاص کے ولی مقتول کے وارث ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک ورثاء بالغ نہ ہو جائیں یا جو ورثاء نابالغ ہوں وہ بالغ نہ ہو جائیں اس وقت تک قصاص کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ احتمال موجود ہے کہ بالغ ہونے کے بعد یہ ورثاء قصاص کو معاف کر دیں۔ لہٰذا ان کے بالغ ہونے کا انتظار کیا جائے گا۔ بالغ ہو جانے کے بعد وہ بھی اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص کا فیصلہ ہو سکے گا اور اگر وہ معاف کر دیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ جو ورثاء بالغ ہیں وہ اگر قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص کا فیصلہ کر دیا جائے گا، نابالغوں کے بالغ ہو جانے کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ ہم امام ابوحنیفہؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ مگر ان کے استدلال سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک حق قصاص کے ولی مقتول کے ورثہ نہیں ہیں کہ اگر بالغ ورثاء قصاص کا مطالبہ کریں تو قصاص لیا جائے۔ حقِ

قصاص کی ولی اسلامی حکومت ہے۔ لہٰذا ورثاء کے بالغ یا نابالغ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پانی میں ڈبو کر مار ڈالنا

اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر کسی بچہ کو یا بڑے آدمی کو پانی میں ڈبو کر مار ڈالا تو امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قصاص نہیں لیا جا سکتا کیونکہ پانی کوئی ایسی دھار دار چیز نہیں ہے جس سے عادۃً قتل کیا جاتا ہو۔ لہٰذا قتل عمد نہیں ہوا۔ لیکن صاحبین یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نیز امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یہ قتل عمد ہے۔ لہٰذا قصاص میں ڈبونے والے کو قتل کیا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قاتل کو اسی طرح پانی میں ڈبو کر قتل کیا جائے گا جس طرح اس نے مقتول کو ڈبویا تھا۔ ہمارے نزدیک اس صورت میں قصاص جاری ہونا چاہیئے۔ عدالت کو اختیار ہے کہ وہ قتل کی جو صورت چاہے اختیار کرے۔ اگر لوگوں کو عبرت اور سبق دینا ضروری ہو تو وہ اسے پانی میں غرق کر کے بھی مار سکتی ہے اور اس کی ضرورت نہ ہو تو اس کی گردن بھی اڑا سکتی ہے اور تختۂ دار پر بھی چڑھا سکتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ ارشاد دراصل قتل عمد کی اس غلط تعریف پر مبنی ہے کہ قتل عمد اسے کہتے ہیں کہ قاتل بالارادہ کسی کو کسی دھار دار آلہ، یا دھار دار آلہ کے قائم مقام کسی آلہ سے مثلاً دھار دار لکڑی سے، دھار دار بانس کے پتھے

سے یا دھار دار پتھر کے ٹکڑے سے قتل کر دے یا آگ میں جلا دے یہ تعریف صحیح نہیں ہے۔ قتل عمد کی تعریف میں ہر وہ قتل داخل ہے جس سے قاتل کا مقصد کسی کو قتل کرنا ہو، خواہ وہ دھار دار آلہ ہو یا کوئی اور ذریعہ ہو۔ مثلاً زہر دیدینا۔ آگ سے جلا دینا، پانی میں غرق کر دینا، بڑے پتھر سے کچل دینا۔ بلند مکان سے گرا دینا، جوڈو کراٹے سے کسی ایسی رگ پر ضرب لگانا جس سے مضروب مر جائے۔ باکسنگ میں کسی نازک مقام پر ضرب لگانا جس سے مضروب کی جان چلی جائے۔ سب صورتیں اس میں داخل ہیں۔ قتل عمد کی تعریف ہی چونکہ فقہاء نے غلط کی تھی اس لئے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف یہ فیصلہ فقہاء کو منسوب کرنا پڑا۔ واضح رہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تمام فقہی جزئیات خود مرتب نہیں فرمائیں انہوں نے اصول مرتب فرمائے تھے۔ بعد کے فقہاء نے ان کے اصول پر جزئیات کی تخریج فرمائی ہے۔ اور چونکہ یہ تخریجات ان کے اصول پر فرمائی گئی ہیں اس لئے ان کی نسبت امام صاحبؒ کی طرف کر دی گئی ہے۔

قصاص میں سزائے موت کا طریقہ

قتل عمد میں سزائے موت کا فیصلہ ہو جائے تو سزائے موت کس طرح دی جائے؟ اس میں بھی اختلاف ہے امام ابو حنیفہؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ سزائے موت کا طریقہ صرف یہی ہے کہ قاتل کا سر تلوار سے قلم کر دیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ

امام محمدؒ، ثوریؒ اور عطاءؒ کا یہی مذہب ہے۔ اس کے برخلاف امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد ابن حنبلؒ اور عمر ابن عبدالعزیزؒ کا مذہب یہ نقل کیا گیا ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کو قتل کیا تھا بالکل اسی طرح قاتل کو قتل کیا جائے گا بشرطیکہ وہ طریقہ ناجائز اور حرام نہ ہو، مثلاً کسی نے نابالغ لڑکی سے جبراً زنا کیا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی تو اس میں مماثلت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر کسی نے کسی بچہ کو غرق کر کے مار ڈالا، زہر دے کر مار ڈالا، پتھر سے سر کچل کر مار دیا تو ان طریقوں میں مماثلت ممکن ہے۔ لہٰذا وہی طریقے اختیار کئے جائیں گے جو قاتل نے مقتول کو قتل کرنے میں اختیار کئے تھے۔ ان حضرات نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے بھی استدلال فرمایا ہے جو سورۂ بقرہ میں ہے کہ :-

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ص (۲/۱۹۴)

ترجمہ :- تو جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کر سکتے ہو جیسی اس نے زیادتی کی ہے۔

اور سورۂ شوریٰ میں ہے :-

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط (۴۲/۴۰)

ترجمہ :- اور برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے۔ تو جو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔

نیز سورۂ یونس میں ہے :-

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا۔ (۱۰/۲۷)

ترجمہ :- اور جن لوگوں نے برائیاں کمائی ہیں تو برائی کا بدلہ اسی کے مثل کے ساتھ دیا جائے گا۔

ان تمام آیاتِ کریمہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ جیسا کچھ کسی نے کیا ہے اسی طرح اس سے بدلہ لیا جائے۔ جس طرح قاتل نے کسی کو قتل کیا ہے بعینہٖ اُسی طرح قاتل کو بھی قتل کیا جائے۔

فقہائے حنفیہؒ کا خیال ہے کہ یہ مماثلت طریقۂ قتل میں ضروری نہیں ہے۔ یہ مماثلت اس میں ہے کہ جس طرح قاتل نے مقتول کی جان لی ہے ایسے ہی قاتل کی جان بھی لے لی جائے۔ مماثلت صرف جان لے لینے میں ہے۔ جان لینے کے مخصوص طریقہ میں نہیں ہے۔ اور یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ ایک بچہ کو پتھر سے ایک مرتبہ سر کچل کر مارا جا سکتا ہے۔ لیکن اتنے ہی بڑے پتھر سے قاتل (بڑے آدمی) کا سر ایک مرتبہ کچل کر اسے نہیں مارا جا سکتا اگر ایک مرتبہ سر کچلنے کے بعد قاتل نہ مرا تو کیا اس کا سر دوبارہ کچلا جائے گا۔ اگر دوبارہ کچلا جائے گا تو مماثلت نہ رہی اور اگر قاتل کو اس کے بعد رہا کر دیا جائے تو اس میں خون مسلم کو رائیگاں کرنا ہے جس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :-

لَا قَوَدَ اِلَّا بِالسَّيْفِ۔

ترجمہ :- سزائے موت تلوار ہی سے دی جا سکتی ہے۔

یہ حدیث مختلف طریقوں سے احادیث کی کتابوں میں مروی ہے۔ نیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-

اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ ۔

ترجمہ :- جب تم کسی کو قتل کرو تو خوبی کے ساتھ قتل کرو۔

نیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کو نشانہ بنا کر مار ڈالنے اور صورت و ہیئت کو بگاڑنے (مُثْلَہ کرنے) سے بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔

(ان تمام احادیث کے لئے دیکھئے اعلاء السنن ص۷۸-۷۹ ج۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

جانوروں کے متعلق بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :-

اللہ نے ہر چیز پر احسان فرمانے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تمہیں چاہیئے کہ تم اپنی چھری کو خوب تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

(مسلم۔ کتاب الصید والذبائح)

ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جب میں کسی بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں بکری پر ترس آتا ہے تو حق تعالیٰ بھی تم پر رحم فرمائے گا۔

(مسند احمد ابن حنبلؒ ص۴۳۶ ج۳)

قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بے شمار مقامات پر حسنِ عمل اور احسان کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ہم جو کام بھی کریں خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ کریں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے سزائے موت کے لئے جو تلوار کی تخصیص فرمائی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح مقتول کی جان آسانی سے جلد نکل جاتی ہے اور اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں آسان ترین طریقۂ قتل یہی تھا کہ جس سے مقتول کو کم سے کم اذیت ہوتی تھی۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ قیامت تک کے لئے ہم اسی طریقہ کے پابند ہو جائیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جنگی اسلحہ میں تیر و تلوار اور نیزے وغیرہ بہترین جنگی اسلحہ تھے۔ لہٰذا آپ نے ان ہتھیاروں کا استعمال سیکھنے اور ان میں مہارت حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن آج جنگی اسلحہ توپ و تفنگ، بمبار طیارے اور ٹینک و میزائل ہیں آج کے حالات میں وہی احکام جو اس عہد میں تیر و تلوار نیزوں اور منجنیق کے لئے تھے، اب موجودہ اسلحہ پر منطبق کرنا ہوں گے۔ مقصد یہ ہے کہ قاتل کی جان تو لی جائے مگر آسان ترین طریقے سے لی جائے۔ آج اگر دوسرے طریقے تلوار سے بہتر ہو سکتے ہیں تو یقیناً ان کو اختیار کرنا ہوگا۔ پھانسی دینا۔ بجلی کے جھٹکے سے مار ڈالنا۔ گردن اڑا دینا۔ توپ دم کر دینا۔ گولی مار دینا، سب اس میں داخل ہیں۔ حکومتِ وقت کو فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ان میں سے کون سا طریقہ آسان تر ہے۔ مقصد سزا دینا ہے۔ شقاوت قلبی

کا مظاہرہ کرنا نہیں ہے۔ لیکن اگر حاکمِ وقت لوگوں کی تادیب اور عبرت کے لئے قاتل کو اسی طریقہ سے سزا دینا چاہیئے جس طرح اس نے مقتول کو قتل کیا تھا تو عدالت کو اس کا حق ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی کو پتھر سے سر کچل کر مروادیا تھا کیونکہ اس نے بھی ایک مسلمان بچی کو اسی طرح قتل کیا تھا۔ اسے طحاوی وغیرہ نے روایت کیا ہے اور اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

(اعلاء السنن ص ۱۸۷ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

ہمارے خیال میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے تادیب وعبرت کی خاطر ایسا کیا تھا لہٰذا اس طرح کی حدیثوں کو تعزیر پر محمول کرنا چاہیئے۔

کسی نے ہل سے کسی کو قتل کر دیا

کسی شخص نے کسی آدمی کو کسان کے ہل سے مار ڈالا تو اگر اس نے ہل کے پھل سے اُسے مارا تھا جو لوہے کا ہوتا ہے اور اس میں دھار ہوتی ہے تو اگر اس نے دھار کی طرف سے مارا ہے اور مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قاتل کو سزائے موت دی جائے گی۔ اور اسے قتل عمد شمار کیا جائے گا اور اگر اس نے لوہے سے دھار کی طرف سے نہیں مارا بلکہ اس کی پشت کی طرف سے مارا ہے تو امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ارشاد ہے کہ یہ قتل عمد ہے اور قاتل سزائے موت کا مستحق ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر مقتول زخمی ہو گیا تھا تو قتل عمد شمار ہو گا ورنہ

قتل خطاء شمار ہو گا اور بجائے سزائے موت کے دیت واجب ہو گی۔ لیکن اگر قاتل نے ہل کی لکڑی سے مارا ہے تو یہ قتل خطاً شمار ہو گا۔ اور دیت واجب ہو گی۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ تفصیل قطعاً غیر قرآنی ہے۔ ان تمام صورتوں میں جہاں قاتل نے عمداً قتل کیا ہے، اسے قتل عمد ہی سمجھنا چاہیئے اور قاتل کو سزائے موت ہی دی جانی چاہیئے آلۂ قتل کا لوہے کا بنا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو دو پتھروں کے درمیان سر کچل کر مروایا تھا۔ اور سزائے موت ہی دی تھی (روایت اوپر گزر چکی ہے) پتھر نہ لوہے کا بنا ہوا ہوتا ہے نہ اس میں لوہے کی طرح دھار ہوتی ہے۔ اگر قتل عمد میں یہ شرط رکھ دی جائے کہ وہ صرف دھار دار آلہ سے قتل کرنے ہی میں ہوتا ہے تو لازم آتا ہے کہ زہر دے کر مار ڈالنے میں، پانی میں غرق کر کے مارنے میں، آگ سے جلا کر مار ڈالنے میں بھی سزائے موت نہ دی جا سکے بلکہ دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ اس طرح تو خونِ مسلم کی ارزانی ہو جائے گی اور لوگ دوسرے ایسے طریقوں سے قتل کرنا شروع کر دیں گے جن میں وہ قتل عمد کی سزا سے بچ سکیں اور دیت ادا کر کے چھٹکارا حاصل کر لیں جو قانون کا مقصد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطاً۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ قاتل کا ارادہ واقعی قتل ہی کرنے کا تھا یا اس کا مقصد محض تادیب تھی اور بلا ارادہ

مقتول کی موت واقع ہوگئی۔

مختلف اسباب سے موت واقع ہونا

اگر کسی شخص نے خودکشی کی کوشش کی اور اپنے کو زخمی کرلیا۔ اس کے بعد اس پر شیر نے بھی حملہ کرکے زخمی کردیا، یا اسے سانپ نے ڈس لیا۔ پھر اس کے بعد کسی دشمن نے بھی اس پر حملہ کردیا۔ اس کے بعد اس کی موت واقع ہوگئی۔ اب یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی موت کا اصل سبب کیا تھا۔ اس نے خودکشی کی بھی کوشش کی تھی اور خود کو زخمی کرلیا تھا۔ اسے شیر نے بھی زخمی کردیا تھا یا سانپ نے بھی ڈس لیا تھا۔ پھر اس پر اس کے دشمن نے بھی حملہ کیا۔ اب معلوم نہیں کہ موت کا اصل سبب کیا تھا۔ ایسی صورت میں قاتل پر ایک تہائی دیت واجب ہوگی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل بھی دیا جائے اور اس کی نماز جنازہ بھی ادا کی جائے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اسے غسل تو دیا جائے مگر اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔ کیونکہ اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی تھی۔ لہٰذا تعزیرًا اس کی نماز جنازہ نہ ہونی چاہیئے کیونکہ اس نے خودکشی کرکے حرام موت مرنے کی کوشش کی تھی۔

ہم امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کی تائید کرتے ہیں خودکشی سے مرنا یقینی نہیں ہے جب کہ دوسرے دو بھی موجود ہیں۔

جنگ میں کوئی مسلمان قتل ہوجائے

اگر مسلمان کفار سے جنگ کر رہے ہوں۔ گھمسان کی جنگ ہو رہی ہو۔ دورانِ جنگ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان ہی کے ہاتھوں سے قتل ہوجائے۔ قاتل نے یہ سمجھا کہ میں جس کو قتل کر رہا ہوں وہ کافر ہے تو قاتل پر نہ تو سزائے موت واجب ہوگی نہ دیت البتہ اسے قتل کا کفارہ دینا چاہیئے۔

کوئی مسلمانوں پر تلوار سونت لے

اگر کوئی شخص مسلمانوں پر تلوار سونت لے اور مسلمانوں کو قتل کرنا چاہے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسے قتل کردیں۔ اس کا خون معاف ہے۔ اس کو قتل کرنے والے کو نہ سزائے موت دی جا سکتی ہے اور نہ اس پر دیت واجب ہوگی نہ کفارہ۔ یہ شخص باغی ہے اور اس پر باغیوں کے احکام نافذ ہوں گے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

مَنْ شَهَرَ عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ سَيْفًا فَقَدْ اَطَلَّ دَمَهٗ۔

(بزار عن حذیفہؓ وعن ابی ہریرۃؓ وابو نعیم عن انسؓ)

ترجمہ:۔ جو مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھالے تو اس نے اپنے خون کو مباح کردیا۔

نیز آپ کا ارشاد ہے:

مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

(بخاری و مسلم عن ابن عمر و عن ابی موسیٰ و لمسلم عن ابی ہریرۃ و لمسلم من حدیث سلمۃ مَنْ سَلَّ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا۔

بحوالہ الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ص ۳۶۷ ج ۲ ہدایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

اگر کوئی پاگل یا کوئی نابالغ بچہ کوئی ہتھیار اٹھالے اور کسی مسلمان پر حملہ کرنا چاہے یا کوئی جانور کسی پر حملہ کردے اور اسے کوئی مار دے تو حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ اسے قتل کرنے والے پر دیت واجب ہوگی اور امام ابو یوسفؒ کے خیال میں جانور کی صورت میں مالک کو اس کی قیمت (تاوان میں) ادا کرنی ہوگی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ان تمام صورتوں میں قاتل پر کچھ بھی واجب نہیں ہوگا کیونکہ اس نے مدافعت میں اسے قتل کیا ہے ورنہ وہ اسے مار ڈالتا۔ ہم امام شافعیؒ کے قول کی تائید کرتے ہیں۔

تعجب ہے کہ اگر کوئی عاقل و بالغ مسلمانوں پہ ہتھیار اُٹھالے اور انہیں قتل کرنے کے درپے ہو تو فقہاء فرماتے ہیں کہ اسے قتل کر دینا واجب ہے اور اس کو قتل کرنے میں نہ سزائے موت واجب ہوتی ہے نہ دیت لیکن اگر یہی حرکت کسی دیوانہ یا نابالغ بچہ یا چوپایہ سے سرزد ہو تو دیت یا چوپائے کی قیمت تاوان میں دلوائی جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ دیوانہ، نابالغ بچہ اور چوپایہ مرفوع القلم تو ہیں مگر اس کے یہ معنے تو نہیں کہ ہم ان سے اپنی مدافعت کے حق سے بھی محروم ہو جائیں۔ مرفوع القلم

ہونے کے صرف یہ معنیٰ ہیں کہ آخرت میں اُن سے مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ مگر ہمیں اپنی حفاظت اور مدافعت کرنے کا بہرحال حق ہے اور ہونا چاہیئے۔

(قصاص فیما دون النفس)

اگر کسی نے کسی کی جان تو نہیں لی۔ لیکن کسی کے کسی عضو کو نقصان پہنچا دیا ہے تو اس میں بھی مظلوم کو ظالم سے بدلہ دلانا ضروری ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ○ (۵/۴۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا برابر کا بدلہ ہے تو جو کوئی شخص معاف کر دے تو وہ (قیامت میں، اس کے گناہوں کا) کفارہ بن جائے گا۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل فرمودہ احکام کے مطابق فیصلے نہ کرے تو وہی لوگ

ظالم ہیں۔

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر تورات میں یہ حکم نازل فرمایا تھا کہ اگر کوئی کسی کو قتل کر دے تو جان کے بدلے جان کا قانون نافذ ہوگا نیز اگر کسی کی آنکھ بیکار کر دے تو مجرم کی آنکھ کو ویسا ہی نقصان پہنچایا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کی ناک کاٹ لی ہے تو اس کی بھی ناک کاٹی جائے گی۔ اگر کسی نے کسی کا کان کاٹ لیا ہے تو اس کا بھی کان کاٹا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کا دانت توڑ دیا ہے تو اس کا بھی دانت توڑا جائے گا۔ اگر کسی نے کسی کو زخمی کر دیا ہے تو زخم کا بھی بدلہ دلایا جائے گا۔ یعنی اس کو بھی ویسا ہی زخم پہنچایا جائے گا۔ حق تعالیٰ کے ان احکام کی پابندی لازمی ہے۔ اگر کوئی اللہ کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرتا تو ایسے ہی لوگ ظالم کہلائیں گے۔

یہ حکم تورات کا تھا اور اس کے مخاطب بنی اسرائیل تھے۔ لیکن فقہاء کا یہ اصول ہے کہ شرائع من قبلنا ہمارے لئے بھی حجت اور واجب العمل ہوتے ہیں جب تک ان احکام کا نسخ ثابت نہ ہو جائے۔ شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اس آیت کریمہ میں قصاص کے متعلق جو کچھ بنی اسرائیل پر تورات میں فرض کیا گیا تھا اس کی خبر دی گئی ہے کہ نفس اور اعضاء مذکورہ میں بدلہ (قصاص) کا حکم تھا۔ اور امام ابویوسفؒ

نے اس آیت کے ظاہر سے استدلال فرمایا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان قصاص کا قانون نافذ ہوگا۔ یعنی عورت کی جان کے بدلے مرد کی جان لی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کریم نے اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ فرمایا ہے (یعنی جان کے بدلے جان) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابویوسفؒ کا مذہب یہی ہے کہ شرائع من کان قبلنا (پچھلی امتوں کی شریعتیں) ان کا حکم ثابت رہتا ہے جب تک حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد یا نص قرآنی سے اس کا نسخ معلوم نہ ہو جائے۔ اور آیت کریمہ کے ذیل میں حق تعالیٰ کا ارشاد وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ، اس آیت کے نازل ہونے کے وقت اس حکم کے ثابت ہونے کی دلیل ہے۔ اول تو یہ کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ حکم ان احکام میں سے ہے جو حق تعالیٰ نے نازل فرمایا تھا۔ اور اس میں کسی زمانہ کی تخصیص نہیں فرمائی گئی تو یہ حکم تمام زمانوں میں ثابت رہنا چاہیئے جب تک اس کو منسوخ کرنے والی کوئی آیت وارد نہ ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت بنی اسرائیل پر ظلم اور فسق کا وصف بیان فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی آیت کریمہ کے نازل ہونے کے وقت پیروی نہیں کرتے تھے۔ یا تو وہ اس کا انکار کرتے تھے یا جو اللہ نے ان پر فرض کیا تھا اس پر (اپنی سستی اور مفاد پرستی کی بناء پر) انہوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ قصاص (بدلے)

کا قانون تمام نفوس (اور اعضاء) میں نافذ ہونا چاہیئے جبتک اس کے نسخ یا تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو جائے۔

(احکام القرآن ص ۵۳۴-۵۳۵ ج ۲ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ ۱۳۴۷ھ)

لیکن آیت کریمہ میں ایک جملہ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ بھی آرہا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ تمام زخموں میں بدلہ کا قانون برابر سرابر یعنی مساوات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کسی نے کسی کے عضو کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا ہی اسے بھی نقصان پہنچایا جاسکے۔ اس میں کمی اور زیادتی نہ ہو۔ اس آیت کے علاوہ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔ (۲/۱۹۴)

ترجمہ:۔ جو شخص تم پر زیادتی کرے تو تم اس پر اتنی ہی زیادتی کر سکتے ہو جتنی اس نے تم پر زیادتی کی تھی۔

سورۂ شوریٰ میں ہے کہ:۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا۔ (۴۲/۴۰)

ترجمہ:۔ برائی کا بدلہ برائی ہے، اسی کے برابر۔

نیز سورۂ یونس میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا (۱۰/۲۷)

ترجمہ:۔ اور جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہے،

انہیں برائی کا بدلہ اُس جیسا ہی دیا جاسکتا ہے۔

ان تمام آیات کا تقاضا یہی ہے کہ کسی برائی کا انتقام لیا جائے تو اس میں مساوات ضروری ہے۔ کسی قسم کی کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی۔

ہمارا خیال ہے کہ اعضاء کو نقصان پہنچانے میں قطعی مساوات قائم رکھنا خاص خاص صورتوں کے علاوہ تمام صورتوں میں ممکن نہیں ہے۔ البتہ جہاں قطعی مساوات ممکن ہو وہاں بدلہ دلادیا جائے لیکن جہاں کمی اور زیادتی کا احتمال ہو وہاں بجائے صورۃً انتقام کے اگر خوں بہا پر زخمی شخص کو راضی کیا جاسکے تو اس کی کوشش کرنی چاہیئے۔ یا عدالت کو کوئی تعزیری سزا دینی چاہیئے۔

پہنچے یا کہنی یا بغل سے ہاتھ کاٹ دینا

کسی نے دوسرے شخص کا ہاتھ اس کے پہنچے سے یا کہنی سے یا شانہ کے جوڑ سے کاٹ دیا تو چونکہ اس نے جوڑ سے ہاتھ کو کاٹا ہے۔ اس میں مماثلت ممکن ہے لہٰذا مجرم کا ہاتھ بھی اسی جوڑ سے کاٹا جاسکتا ہے۔ یہاں بدلے یعنی قصاص کی یہ صورت بھی ممکن ہے کہ مجرم کا ہاتھ بھی کاٹا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر مجرم نے جوڑ سے ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ بازو کے یا ذراع کے درمیان سے ہاتھ کو توڑ دیا ہے جس میں بعینہٖ مماثلت ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں دیت یعنی خوں بہا پر فیصلہ کرنا چاہیئے۔ ابن ابی شیبہ

نے حضرت عمرؓ سے ضعیف سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ "ہم ہڈیوں میں قصاص نہیں لیں گے۔ نیز حضرت ابن عباسؓ سے بھی نقل کیا ہے کہ "ہڈیوں میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے۔ لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ سندوں کا ضعیف ہونا اس سلسلہ میں مضر نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے ان احادیث سے استدلال نہیں کیا۔ ہمارا استدلال قرآن کریم کی اُن آیات سے ہے جو ہم نے اوپر نقل کر دی ہیں۔ ضعیف احادیث سے تائید کا کام لیا جا سکتا ہے۔

(اعلاء السنن ص ۱۱۱ ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی۔ ہدایہ ص ۵۶۹ ج ۴ مع درایہ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

آنکھ اگر نکال دی جائے

اگر کسی نے دوسرے آدمی کی آنکھ کا ڈھیلا جڑ سے نکال دیا تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ اس میں قصاص (بدلہ) نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ آنکھ کے ڈھیلے کو نکال دینے میں مماثلت ممکن نہیں ہے۔ اور اگر آنکھ اپنی جگہ پر موجود ہے۔ لیکن اس کی روشنی جاتی رہی یعنی بصارت غائب ہو گئی تو اس میں قصاص یعنی بدلہ لیا جائے گا اس کی صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ مجرم کے چہرہ پر بھیگی ہوئی روئی رکھ دی جائے اور جس آنکھ کی بصارت زائل کرنی ہو اس کے سامنے آئینہ گرم کر کے سامنے کر دیا جائے۔ آنکھ کی روشنی زائل ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے جو حکم ابن عتیبہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کسی آدمی کے تھپڑ مارا جس سے اس کی بصارت

زائل ہو گئی۔ آنکھ کا ڈھیلا اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس نے قصاص کا مطالبہ کیا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح بدلہ دلایا جائے۔ اتفاق سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اُدھر سے گذرے تو انہوں نے بتایا کہ اس کے چہرے پر روئی رکھی جائے۔ پھر آفتاب کے سامنے اس کے چہرے کو کر دیا جائے اور اس کے قریب آئینہ کر دیا جائے اور اس کا عکس آنکھ پر ڈالا جائے اس کی بصارت زائل ہو جائے گی اور آنکھ اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ اس روایت کی تخریج زیلعی نے کی ہے۔ لیکن اس کی سند جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے قال عبد الرزاق قال اخبرنا معمر عن رجل عن الحکم بن عتیبۃ۔ اس کی سند میں معمر کے استاذ جن سے وہ روایت نقل کر رہے ہیں ایک مجہول آدمی ہیں اور حکم ابن عتیبہ کی ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہوئی لہٰذا حدیث منقطع بھی ہے۔

(اعلاء السنن ص ۱۱۱ ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس فریئر روڈ کراچی)

صاحبِ ہدایہ نے حنفیہ کا مسلک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کے مطابق نقل کیا ہے۔ اور زیلعی نے بتایا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں پیش آیا تھا اور اُنہوں نے صحابۂ کرام سے مشورہ فرمایا تھا تو حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا تھا۔

(ہدایہ ص ۵۶۹ ج ۴ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)

لیکن ابن رشد نے لکھا ہے کہ :-

اگر کسی نے کسی کے تھپڑ مار دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی یا کوڑے سے مارا اور جس کو مارا تھا اس کی آنکھ پھوٹ گئی یا کچھ ایسا ہی کوئی اور عمل کیا جس سے آنکھ پھوٹ گئی جس سے بظاہر کسی عضو کو تلف کرنے کا ارادہ نہیں ہوتا جیسے تھپڑ مارنا اور آنکھ پھوٹ جانا تو جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ شبہ عمد ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) نہیں ہے اور اس میں مکمل دیت (خوں بہا) دینا ہوگی۔ اور یہی امام مالکؒ سے اہل عراق کی روایت ہے۔ لیکن مشہور مذہب یہی ہے کہ یہ عمد ہے اور اس میں قصاص (بدلہ) دلانا ہوگا۔

(بدایۃ المجتہد ص ۴۰۷ ج ۲ مطبوعہ مصطفی البابی الحلبی مصر۔ اڈیشن دوم)

اس سلسلہ میں جمہور فقہاء کا مذہب بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ جو روایت صاحب ہدایہ اور اعلاء السنن کے مصنفؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پیش فرمائی ہے وہ علاوہ اس کے کہ ضعیف اور منقطع ہے اس میں یہی صورت بیان کی گئی ہے کہ کسی نے دوسرے آدمی کے تھپڑ مارا تھا جس سے مضروب کی آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ تھپڑ مارنے سے آنکھ پھوڑ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے عمد شمار کرنا اور بدلہ دلوانا قابل حیرت ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے اس قسم کے فیصلے کی نسبت صحیح ہو سکتی ہے۔ اسی روایت کی بناء

پر فقہاء نے یہ فیصلہ فرما دیا اور اس کے مضمرات پر غور نہیں فرمایا۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ :-

"میں کہتا ہوں کہ معمر کے استاد مجہول ہیں اور حکم عن علیؓ منقطع ہے لیکن اس کا کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ یہ مسئلہ قیاسی ہے۔ اور ضعیف روایت تائید اور تقویت کے لئے درست ہو سکتی ہے۔" (اعلاء السنن ص ۱۱۱ ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

اگر یہ مسئلہ واقعی قیاسی ہے تو قیاس تو اس فیصلہ کے خلاف جا رہا ہے جو مشہور مذہب کے مطابق فقہائے کرام نے فرمایا ہے۔ قیاس تو جمہور کے قول کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ تھپڑ مارنے سے آنکھ کا پھوڑ دینا کبھی بھی مقصد نہیں ہوا کرتا۔ اسے عمد کہنا قیاس کے خلاف ہے۔ ھذا ما رأیتہ واللہ اعلم

دانت توڑ دینا

اگر کسی نے دوسرے کو پتھر یا کسی دوسری چیز سے مارا اور اس کا دانت ٹوٹ گیا تو اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو فقہائے حنفیہؒ کا خیال ہے کہ جتنا مجروح کا دانت ٹوٹا ہے اتنا ہی دانت ریتی سے گھس دیا جائے اور اگر پورا دانت جڑ سے نکل گیا ہے تو اس میں قصاص (بدلہ) اس طرح لیا جائے گا کہ مجرم کا دانت بھی جڑ سے نکال دیا جائے۔ لیکن بعض فقہاء کا خیال ہے کہ جڑ سے دانت نہیں نکالا جائے گا بلکہ دیت (خوں بہا) دلوایا جائے گا۔ کیونکہ دانت کو جڑ سے نکال دینے میں اندیشہ ہے کہ

مجرم کا دانت خراب ہو جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اسے ریتی سے جڑ تک گھس دیا جائے۔

(ہدایہ ص ۵۶۹ ج ۴ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی مع حواشی)

حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے تو سال بھر تک انتظار کیا جائے گا اگر وہ دانت سال بھر میں سیاہ پڑ جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ پورا دانت بیکار ہو گیا۔ لہٰذا بدلے یا دیت کا فیصلہ سال بھر تک انتظار کرنے کے بعد کیا جائے اور اگر دانت سال بھر میں سیاہ نہیں پڑا تو جتنا دانت مجروح کا ٹوٹا ہے اس کے بقدر اس کے دانت کو ریتی سے گھس دیا جائے یا اسی کے بقدر اس کے نقصان کی تلافی خوں بہا (دیت سے) کر دی جائے۔

(اعلاء السنن ص ۱۱۲ ج ۱۸ مطبوعہ آرٹ پریس کراچی)

ممکن ہے کہ حضرات فقہائے کرام کے زمانہ میں جڑ سے دانت نکال دینے میں کوئی قباحت پیش آتی ہو اور دانت کا کچھ حصہ ریتی سے گھس دینے میں سہولت ہوتی ہو۔ لیکن ہمارے عہد میں صورتِ حال ایسی نہیں ہے۔ پورا دانت جڑ سے نکال دینے میں آج کوئی قباحت نہیں ہوتی بلکہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے۔ البتہ دانت کا بعض حصہ ریتی سے گھس دینے میں واقعی قباحت ہے اور اس میں پوری مماثلت مشکل ہے۔ بہر حال قرآن کریم نے آیت نمبر (۵/۴۵) میں اَلسِّنَّ بِالسِّنِّ کا حکم صادر فرمایا ہے

اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر پورا دانت جڑ سے ٹوٹ گیا ہے۔ یا دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا اور سیاہ پڑ گیا ہے اور پورا دانت ہی خراب ہو گیا ہے اور مجرم نے بالقصد ایسا کیا ہے تو مجرم کا پورا دانت نکال دیا جانا چاہیئے۔ اگر دانت کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا ہے اور مجرم کا دانت اسی قدر گھس کر کم کیا جا سکتا ہے تو عمد کی صورت میں اس کا بدلہ بھی دلا دیا جائے اور اگر پوری مماثلت مشکل ہو تو دیت پر فیصلہ کیا جائے۔ امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انس ابن مالکؓ کی پھوپھی ربیعؓ نے ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا تھا۔ قوم نے قصاص (بدلے) کا مطالبہ کیا اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ لے کر آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے قصاص (بدلے) کا حکم صادر فرمایا۔ اس پر حضرت انس ابن مالکؓ کے چچا انس ابن النضرؓ نے عرض کیا۔ اے رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کی قسم اس کا دانت نہیں توڑا جائے گا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے انسؓ! کتاب اللہ کا حکم قصاص ہی کا ہے۔ لیکن اس کے بعد قوم راضی ہو گئی اور انہوں نے دیت (خوں بہا) لینا منظور کر لیا۔ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب الصلح، باب الصلح فی الدیۃ عن

انس ابن مالک و کتاب الجہاد باب قول اللہ عزوجل
"من المؤمنین رجال صدقوا")

یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور قرآن کریم کے مطابق ہے لہٰذا ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہڈی توڑ دینے میں قصاص نہیں

اگر کسی نے دوسرے آدمی کی ہڈی توڑ دی ہے تو اس میں قصاص (بدلے) کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہڈی کو توڑ دینے میں قطعاً مماثلت ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص نے کسی کے لاٹھی یا اور کوئی چیز ماردی جس سے اس کے ہاتھ پاؤں یا پسلی وغیرہ کی ہڈی ٹوٹ گئی تو اس کا بدلہ دلانا ممکن نہیں ہے۔ اس کا امکان نہیں کہ قصاص دلانے کے لئے مجرم کو ضرب پہنچائی جائے تو بالکل اتنی ہی ہڈی ٹوٹے اور وہیں سے ٹوٹے جہاں سے اس نے توڑی تھی لہٰذا اس صورت میں دیت کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ:-

"ہم ہڈیوں میں قصاص (بدلہ) نہیں دلا سکتے۔"

نیز ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ:-

"ہڈیوں میں قصاص نہیں ہے۔"

ان دونوں روایتوں کو زیلعی نے نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے درایہ میں کہا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ضعیف اور منقطع ہے اور ابن عباسؓ کا قول بھی ضعیف ہے۔ لیکن اول

تو ہمیں یہ تسلیم نہیں کہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ کیونکہ ابن حجرؒ نے حجاج کی وجہ سے ان حدیثوں کو ضعیف کہا ہے مگر حجاج حنفیہ کے نزدیک ضعیف نہیں بلکہ حسن الحدیث ہے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا استدلال ان احادیث سے نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے حکم وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ (زخم برابر سرابر ہیں) سے ہے۔ ہڈیوں کو توڑنے میں چونکہ بعینہٖ مماثلت ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ہم یہاں بجائے قصاص (بدلے) کے دیت کے قائل ہوئے ہیں۔ واللہ اعلم

مادون النفس میں شبہ عمد نہیں ہوتا

قتل نفس میں ہمارے فقہاء تین قسموں کے قائل ہیں۔ قتل عمد[1]۔ قتل شبہ عمد[2]۔ قتل خطاء[3] لیکن قرآن کریم نے صرف دو قسمیں ہی بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطاء۔ تیسری قسم یعنی قتل شبہ عمد بیان نہیں کی۔ یہ قسم قرآن کریم پر اضافہ ہے جس کے ہم قائل نہیں ہیں کیونکہ ہم قرآن کریم پر کسی خبر واحد سے اضافہ کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے۔ لیکن مادون النفس میں ہمارے فقہاء بھی شبہ عمد کے قائل نہیں ہیں جو قطعاً صحیح اور قرآن کریم کے مطابق ہے جس کی ہم تائید کرتے ہیں۔

عورت اور مرد، آزاد اور غلام اور دو غلاموں میں قصاص

اگر کسی مرد نے کسی عورت کی آنکھ پھوڑ دی، ٹانگ توڑ دی

دانت، پسلی یا ٹانگ توڑ دی یا اور کوئی زخم پہنچا دیا، یا کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے ساتھ یہی حرکت کر دی یا دو غلاموں نے آپس میں ایک دوسرے کو فیما دون النفس کوئی زخم پہنچا دیا تو فقہائے حنفیہ رح اس کے قائل ہیں کہ ان تمام صورتوں میں قصاص یعنی بدلے کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ صرف دیت دلائی جا سکتی ہے۔ امام شافعی رح اس کے خلاف قصاص کے قائل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسانی اعضاء کا حکم بھی وہی ہے جو انسانی نفس کا ہے البتہ اگر کسی آزاد آدمی نے کسی غلام کے عضو کو نقصان پہنچایا ہے تو قصاص (بدلہ) کا قانون جاری نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں عورت اور مرد، آزاد اور غلام یا غلام اور غلام میں کسی قسم کا فرق کرنا صحیح نہیں ہے۔ عورت اور مرد کی صورت میں ہم امام شافعی رح کے مسلک کی تائید کرتے ہیں اور آزاد اور غلام اور غلام اور غلام کی صورت میں ہم امام شافعی رح سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں ہر انسان قابل احترام ہے۔ اس کی جان اور اس کے تمام اعضاء محترم ہیں مثلاً:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ ۔ (۱۷/۷۰)

ترجمہ:۔ ہم نے اولادِ آدم کو مکرم و محترم بنایا ہے۔

اور

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ (۹۵/۴)

ترجمہ:۔ ہم نے انسان کو بہترین توازن اور استواری

میں پیدا کیا ہے۔

ایک عورت بھی اسی طرح اولادِ آدم اور انسان ہے جس طرح ایک مرد اولادِ آدم اور انسان ہوتا ہے۔ ایک آزاد آدمی اور غلام بھی یکساں آدم کی اولاد اور انسان ہے۔ لہٰذا ان میں کسی قسم کا فرق و امتیاز برتنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ حنفیہ رح کی طرف سے یہ دلیل دی گئی ہے کہ اعضاء کا حکم اموال کا حکم ہے۔ چنانچہ مرد کے ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار مقرر کی گئی ہے اور عورت کے ہاتھ کی قیمت اس کا نصف ہے۔ لہٰذا اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ مرد کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے پانچ سو دینار کا نقصان کیا ہے اور عورت کا ہاتھ کسی نے کاٹ دیا ہے تو اس نے ڈھائی سو دینار کا نقصان پہنچایا ہے۔ چونکہ دونوں صورتوں میں نقصانات برابر نہیں ہیں اس لئے قصاص (بدلے) کا قانون نافذ نہیں ہو سکتا۔ جس بنیاد پر یہ دلیل قائم ہے ہمارے خیال میں وہ بنیاد ہی صحیح نہیں ہے۔ قیمت کا یہ فرق خود متنازعہ فیہ ہے۔ اس پر ہم دیات کے باب میں بحث کریں گے۔ بہرحال قرآن کریم کا حکم نہایت واضح اور دو ٹوک ہے:۔

اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۔ (۵/۴۵)

ترجمہ:۔ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ،

ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخم برابر برابر ہیں۔

قرآن کریم نے عورت اور مرد آزاد اور غلام کی جان اور اعضاء میں کسی فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھا تو ہمیں کسی فرق و امتیاز برتنے کا حق کہاں سے مل گیا۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے واضح احکام میں تخصیص نہیں کی جا سکتی۔

کافر اور مسلم میں قصاص

اگر کسی مسلمان نے کسی ذمی کافر کے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچا دیا یا مستأمن اور معاہد کافر کے کسی عضو کو نقصان پہنچا دیا تو ہمارے فقہاء قصاص (بدلے) کے قائل ہیں۔ ہم اس کی تائید کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہمارے فقہاء کے نزدیک ایک مسلمان عورت اور ایک مسلمان غلام ایک ذمی کافر سے بھی کم تر ہے کہ ذمی کافر کے سلسلہ میں وہ بدلے کے قائل ہیں لیکن مسلمان عورت اور مسلمان غلام کے سلسلہ میں بدلے کے قائل نہیں ہیں۔ یا للعجب!

نصف بازو سے ہاتھ کاٹ دینا یا زخم جائفہ پہنچانا۔

اگر کسی نے دوسرے کا ہاتھ نصف بازو (ساعد) سے کاٹ دیا تو اس میں قصاص نہیں ہوگا بلکہ دیت (خوں بہا) دلایا جائے گا کیونکہ یہ ہڈی کو مجروح کرنا ہوا اور ہڈیوں میں چونکہ مساوات ممکن نہیں ہے۔ اس لئے قصاص (بدلہ) نہیں دلایا جا سکتا۔

ایسے ہی اگر کسی نے دوسرے کو ایسا زخم پہنچا دیا جو اندر تک سرایت کر گیا یعنی پیٹ میں خنجر یا نیزہ گھونپ دیا یا سینہ میں برچھی مار دی اور وہ اندر تک پہنچ گئی یا کمر اور معدہ میں چاقو مار دیا جو اندر تک پہنچ گیا۔ اور وہ خلاف معمول کچھ عرصہ بعد اچھا ہو گیا تب بھی قصاص (بدلہ) کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا کیونکہ ایسے زخم عموماً اچھے نہیں ہوا کرتے بلکہ جان لیوا ثابت ہوتے ہیں۔ اگر مجرم کو ایسا ہی زخم لگایا گیا تو زیادہ تر اسی کا احتمال ہے کہ وہ اس زخم سے مر جائے گا۔ چونکہ مجروح اچھا ہو گیا ہے اس لئے مجرم کو سزائے موت تو نہیں دی جا سکتی۔ کوئی ضروری نہیں کہ مجرم بھی اس زخم سے اچھا ہو جائے۔ لہٰذا دیت پر فیصلہ کرنا ہوگا۔ مجرم کو اتنا ہی زخم پہنچایا جا سکتا ہے جتنا اس نے مجروح کو پہنچایا ہے۔ اسے ایسا زخم نہیں پہنچایا جا سکتا جس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔

کسی لونجے یا ناقص الید شخص نے اچھے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا

اگر کسی آدمی نے جس کا ہاتھ شل ہے یا اس کا ہاتھ ناقص ہے یعنی اس کی کچھ انگلیاں کٹی ہوئی ہیں ایک ایسے آدمی کا ہاتھ کاٹ دیا جو تندرست ہے۔ تو جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے یا تو مجرم کا ناقص ہاتھ ہی کاٹنے پر راضی ہو جائے یا اس کی دیت لے لے۔ اسے دونوں باتوں کا اختیار ہے۔ اس کی رضامندی کے مطابق حاکمِ وقت فیصلہ کر سکتا ہے۔

قتل عمد میں قصاص حق حکومت ہے

ہمارے حضرات فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اگر قاتل اور اولیاء مقتول میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور جس مقدار مال پر مصالحت ہوئی ہے وہ قاتل کو ادا کرنا ہوگا۔ مال کی مقدار قلیل ہو یا کثیر ہو، اس کی پابندی کرنی ہوگی۔ حضرات فقہاء کرام نے اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝

(۲/۱۷۸)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر مقتولین کے بارے میں بدلہ (جانی یا مالی) فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد کی جگہ وہی آزاد، غلام کی جگہ وہی غلام، اور عورت کی جگہ وہی عورت (جس نے قتل کا ارتکاب کیا ہے) قتل کیا جائے گا۔ تو جسے (مالی بدلہ میں) اس کے بھائی (ولی مقتول) کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے تو دستور کے مطابق اس کا پیچھا کرنا اور حسن کارانہ انداز

میں اس کی ادائیگی کرنا ضروری ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور مہربانی ہے۔ تو جو شخص اس کے بعد بھی کوئی زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں قِصَاصٌ کا لفظ قابل غور ہے ہم "القصاص" کے باب میں اس کی لغوی تحقیق تفصیل سے بیان کر چکے ہیں وہاں ہم نے بتایا تھا کہ "قِصَاصٌ" کے معنے مطلق بدلے کے ہوتے ہیں۔ بدلہ جانی بھی ہو سکتا ہے اور مالی بھی اور یہ دونوں بدلے "قصاص" کے مفہوم میں داخل ہیں بلکہ ہم نے مفردات راغب سے نقل کیا تھا کہ انہوں نے قِصَاصٌ کے معنے خون کے پیچھے خوں بہا (مالی بدلہ اور دیت) ہی کے کئے ہیں۔ لہٰذا قصاص کے مفہوم میں مالی بدلہ بھی داخل ہے۔ اس کے بعد یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ انسانی جان غیر متجزی اور غیر منقسم ہے جس کے اجزاء نہیں ہو سکتے البتہ مالی بدلہ متجزی اور منقسم ہے۔ یعنی اس کے اجزاء ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ سے مراد مالی بدلہ ہی ہو سکتا ہے۔ جانی بدلہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے" سے واضح ہے کہ جانی بدلہ میں سے کچھ معاف کر دینے کے تو کوئی معنے ہی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جان میں سے کچھ حصہ معاف نہیں کیا جا سکتا البتہ مالی بدلہ میں سے کچھ معاف کیا جا سکتا ہے۔

قتل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک قتل عمد اور دوسرے قتل خطاء۔ قتل عمد میں قاتل کو قتل کیا جاتا ہے یعنی مقتول کا جانی بدلہ اس کے ورثاء کو دلایا جاتا ہے۔ اور قتل خطاء میں مقتول کے ورثاء کو مقتول کا مالی بدلہ یعنی دیت (خوں بہا) دلایا جاتا ہے۔ لہٰذا فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ قتل عمد سے متعلق نہیں ہے بلکہ قتل خطاء سے متعلق ہے۔ قتل خطاء میں دیت واجب ہوتی ہے جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ مقتول کے ورثاء میں کوئی وارث اپنا حصہ معاف کر سکتا ہے۔ یا تمام ورثاء دیت کی رقم میں سے کچھ رقم معاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آدھی جان، تہائی جان اور چوتھائی جان معاف نہیں کی جا سکتی۔

امام ابوبکر جصاص رازی نے لکھا ہے کہ:۔

اور ابن عباس رضؓ سے مروی ہے جس کی سند ہم پہلے بیان کر چکے ہیں[1] کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، قتل عمد میں قتل کیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف کر دے۔ اور سلیمان ابن کثیر نے روایت کی ہے کہ عمرو ابن

[1] سند یہ ہے حدثنا عبد الباقی بن قانع قال حدثنا موسی ابن زکریا التستری قال حدثنا سھل بن عثمان العسکری ابو معاویۃ عن اسمٰعیل بن مسلم عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(احکام القرآن ص ۱۵۹/۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ ۱۳۴۷ھ)

دینار نے بیان کیا طاؤس سے انہوں نے ابن عباس سے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص انبوہ میں قتل کر دیا جائے اور قاتل معلوم نہ ہو یا تیر افگنی میں یا خشت باری میں پتھر، کوڑے یا لاٹھی سے مارا جائے تو اس کی دیت قتل خطاء کی دیت ہوگی اور جو عمداً قتل کیا جائے تو جان لی جائے گی۔ پھر جو شخص قاتل اور ورثاء مقتول کے درمیان روک بن جائے (اور قاتل کو قتل نہ کرنے دے) تو اس پر اللہ کی اور ملائکہ کی اور تمام آدمیوں کی لعنت برسے گی۔ تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں حدیثوں میں بتادیا ہے کہ قتل عمد میں واجب صرف قَوَدْ (قتل کرنا) ہی ہے۔ اور اگر ورثاء کو دیت لینے کا بھی اختیار رہتا تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم دیت کا بیان کئے بغیر صرف قَوَدْ (قتل کرنے) کے بیان پر اکتفاء نہ فرماتے۔ کیونکہ یہ جائز نہیں ہے کہ مقتول کے وارث کو دو چیزوں (قتل اور خوں بہا) میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا حق ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم دیت کا بیان نہ فرمائیں اور صرف قَوَدْ (قتل) کے بیان پر اکتفاء فرمائیں۔ کیونکہ اس سے تو اس تخییر کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس کے بعد اس میں تخییر کو بھی قبول کر لیا جائے تو وہ پہلے حکم کا نسخ ہوگا۔

(احکام القرآن ص ۱۷۵/۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ

انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس بائی جیمس ہیسٹنگز جلد چہارم باب کرائمز اینڈ پنشمنٹ کے حوالہ سے اصل یہودی کتب سے ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ :-

"یہودیوں میں قصاص تھا، دیت نہیں تھی۔ جان کے بدلے جان، کان کے بدلے کان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، ہاتھ کے بدلے ہاتھ اور پاؤں کے بدلے پاؤں کا قانون رائج تھا۔ قتل عمد اور قتل خطاء میں فرق نہیں کیا جاتا تھا"

چونکہ یہودیوں میں قتل عمد اور قتل خطاء میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے دونوں میں فرق کیا۔ قتل عمد میں قَوَدٌ (قتل) اور قتل خطاء میں دیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لئے ایک تخفیف اور رحمت تھی کہ اس نے قتل خطاء میں تخفیف فرمادی اور دیت کی اجازت مرحمت فرمادی۔ یہ سہولت بنی اسرائیل کو حاصل نہیں تھی۔ ان کے ہاں قتل میں صرف ایک ہی سزا ــــ قَوَدٌ ــــ یعنی قتل کر دینا تھی۔

حضرت ابن عباس رضؓ کی روایت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے

ایک روایت نقل کی جاتی ہے جسے شیخ الاسلام امام ابوبکر جصاص رازی نے بھی نقل کیا ہے۔ حدثنا عبد الباقی بن

قانع قال حدثنا الحمیدی قال حدثنا سفیان الثوری قال حدثنا عمرو بن دینار قال سمعت مجاھدا یقول سمعت ابن عباس رضؓ یقول (کی سند کے ساتھ) بنی اسرائیل میں قصاص (قَوَدٌ یعنی قتل) کا حکم تھا اور ان میں دیت نہیں تھی۔ تو حق تعالیٰ نے اس اُمت سے فرمایا ــــ "اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے مقتولین کے بارے میں" اپنے اس ارشاد تک ــــ "تو جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ حصہ معاف کر دیا جائے"

ابن عباس رضؓ نے کہا ــــ "عفو یہ ہے کہ وہ قتل عمد میں دیت کو قبول کرے" اور یہ کہ ــــ "اور دستور کے مطابق اس کا پیچھا کرنا ہے اور حسنِ سلوک کے ساتھ اسے دیت ادا کرنی ہے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے (اس میں جو تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا) تو جو اس کے بعد زیادتی کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے" ــــ ابن عباس رضؓ نے کہا کہ یعنی دیت قبول کر لینے کے بعد قتل کر دے"

(احکام القرآن للجصاص الرازی ص ۱۷۶ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ بہیہ مصریہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قتل عمد میں بنی اسرائیل کے لئے صرف قَوَدٌ یعنی قتل کا حکم تھا اور امت محمدیہ پر حق تعالیٰ نے یہ سہولت فرمادی کہ

قاتل کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے اور اس سے دیت (خون بہا) بھی لی جاسکتی ہے اگر مقتول کے ورثاء اس پر راضی ہوجائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا غالباً یہ خیال تھا کہ قتل خطأ میں بنی اسرائیل کے لئے بھی دیت کی سہولت موجود تھی لیکن قتل عمد میں دیت کی سہولت موجود نہیں تھی۔ اور قرآن کریم کے ارشاد ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ سے مراد یہی ہے کہ امت محمدیہ کو قتل عمد میں بھی اگر ورثاء راضی ہوجائیں دیت (خون بہا) کی سہولت عطا فرمادی گئی۔ اسی بات کی طرف حق تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے تخفیف اور رحمت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خود تو اسرائیلی کتب کے عالم نہیں تھے۔ انہوں نے کعب الاحبار وغیرہ جیسے علمائے بنی اسرائیل سے معلومات حاصل کیں اور انہی معلومات کو بیان فرمادیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ معلومات صحیح نہیں تھیں یہودیوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوگئے تھے وہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم تو نہیں تھے۔ مگر یہودی ہونے کی وجہ سے مسلمان ان کی باتوں پر اعتماد کرلیتے تھے۔ ان یہودی علماء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو غلط معلومات بہم پہنچائیں خواہ قصداً خواہ اپنی کم علمی کی وجہ سے اور چونکہ وہ بظاہر مسلمان تھے اس لئے ان پر اعتماد کرلینا اور ان کی معلومات کو صحیح سمجھ لینا کچھ مستبعد نہیں تھا۔ لیکن اس ذرا سی

غلط بیانی نے ملاحظہ فرمائیے، مسئلہ کو کس قدر الجھادیا ہے۔ ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ کا تقاضا یہ تھا کہ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں امت محمدیہ کو سہولت بہم پہنچانا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو سہولت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بتائی گئی اس سے مسئلہ کی نوعیت ہی بدل گئی۔ حق تعالیٰ نے جو تخفیف اور رحمت فرمائی تھی وہ تو یہ تھی کہ قتل خطاء میں بنی اسرائیل کے لئے دیت کی سہولت موجود نہیں تھی وہ امت محمدیہ کو عطا فرمادی گئی لیکن بتانے والے نے یہ بتایا کہ قتل عمد میں بھی دیت کی سہولت دیدی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خون مسلم کو وہ ارزانی حاصل ہوگئی جو حق تعالیٰ کا مقصد نہیں تھا اور مال دار اور دولت مند آدمیوں کے لئے کچھ مشکل نہ رہا کہ وہ جسے چاہیں قتل کردیں اور مقتول کے ورثاء کی غربت اور ناداری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گرانقدر رقوم کی پیشکش کرکے سزا سے بچ جائیں۔ البتہ اگر قاتل غریب ہے تو وہ تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے۔ خیال تو فرمائیے کہ یہ بات حق تعالیٰ کا مقصد کیسے ہوسکتی ہے۔ اور اس سے عدل و انصاف کے تقاضے کہاں تک پورے ہوسکتے ہیں۔ اگر قانون کی حکمرانی کا یہی تصور ہے کہ دولت مند اپنی دولت کے بل بوتے پر انصاف خرید سکتے ہیں اور تختۂ دار پر چڑھنے کے لئے صرف غریب اور نادار لوگ ہی ہیں تو ایسے طرز عمل کو قانون کی حکمرانی کہنا حق و انصاف کا منہ چڑانا نہیں تو یہ اور

کیا ہے۔

اس سلسلہ میں انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ اس کی بیان کردہ تفصیلات اصل (اوریجنل) ماخذ پر مبنی ہیں اور اس کے تفصیلات دینے والے خود بھی اپنے مضامین میں سند (AUTHO RITY) ہوتے ہیں۔ جبکہ حضرت ابن عباسؓ کے متعلق ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ انہیں یہ معلومات کس یہودی سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہ عالم آدمی تھا یا عامی آدمی تھا۔

اس پوری تفصیل کے بعد اس مسئلہ پر غور فرمائیے جو ہم نے ہدایہ سے نقل کیا ہے۔ اس مسئلہ کو دوبارہ سامنے لے آئیے۔ مسئلہ یہ ہے کہ :

"اگر قاتل اور مقتول کے اولیاء میں مال کی کسی مقدار پر صلح ہو جائے تو قصاص (بدلہ) ساقط ہو جائے گا اور مال کی جس مقدار پر مصالحت ہوئی ہے، وہ قلیل مقدار ہو یا کثیر ہو وہ قاتل کو ادا کرنی ہوگی۔ اس کی پابندی ضروری ہے۔"

(۱) اس کا مطلب ایک تو یہ ہوا کہ مال دار آدمی اپنی دولت کے بل پر سزا سے صاف بچ سکتا ہے اور صرف نادار غریب لوگ ہی سزایاب ہو سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ خون مسلم کی ذمہ داری حکومت کی کچھ بھی نہیں یہ مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ وہ جسے چاہیں معاف کر دیں اور جس سے چاہیں اپنے مقتول کے خون کا سودا کر لیں۔ حکومت

مجبور ہے کہ وہ مقتول کے ورثاء کی مرضی کے تابع فیصلے کرے حالانکہ ہم بتا چکے ہیں کہ آیت کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے ——"اے پیروانِ دعوت اسلامی! مقتولین کے بارے میں، تم سب پر قصاص فرض کیا گیا ہے"—— یعنی اس حکم کی مخاطب پوری جماعت مؤمنین ہے۔ مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ ہے۔ یعنی حکومت ہے۔ قصاص (بدلہ) لینا مقتول کے ورثاء کا فریضہ نہیں بلکہ حکومتِ اسلامیہ کا فریضہ ہے جس کی ادائیگی حکومت اسلامیہ کو کرنی ہے لیکن اس روایت ابن عباسؓ نے حکومت کے تمام اختیارات مقتول کے اولیاء کو سونپ کر حکومت کو بے دست و پا بنا دیا ہے۔ یہ عجیب صورتِ حال ہے کہ جس پر قرآن کریم ایک فریضہ عائد کر رہا ہے اسے کوئی اختیار نہ ہو بلکہ اختیارات اسے ہوں جس کا فریضہ نہیں ہے۔

رہ گئی وہ دونوں روایتیں جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ابوبکر جصاص رازیؒ نے نقل فرمائی ہیں اور جس میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ الفاظ منسوب فرمائے گئے ہیں کہ "قتل عمد میں قتل ہی کیا جائے گا بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف فرما دے"—— اس روایت میں یہ ٹکڑا کہ —— "بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی معاف کر دے"—— حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اپنا قول معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی زیادہ تر روایتیں مرسل

ہیں۔ کیونکہ وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بہت کمسن تھے۔ انہوں نے زیادہ تر روایات خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنیں۔ بلکہ دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے سن سن کر بیان کی ہیں۔ ایک روایت جو ان سے اس سے پہلے بیان کی جا چکی ہے وہ بھی کسی ایسے صحابی سے مروی ہے جو فی الحقیقت یہودی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے۔ یہودیت سے اسلام کی طرف آنے والے صحابہ سب کے سب یہودی کتب کے عالم نہیں تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ دونوں روایتیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کس صحابی سے سنی تھیں۔ زیادہ تر امکان یہی ہے کہ یہ روایتیں بھی انہوں نے کسی ایسے ہی صحابی سے سنی ہوں گی جو یہودی کتب کے عالم نہیں تھے اور انہوں نے ایک غلط بات اپنی لاعلمی کی وجہ سے بیان کر دی ہو۔ نیز یہ بھی امکان ہے کہ خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مذہب چونکہ پچھلی روایت کی وجہ سے یہی تھا کہ قصاص حق حکومت نہیں بلکہ حقِ ورثائے مقتول ہے اس لئے انہوں نے اپنی معلومات کی بناء پہ ایسا ہی بیان فرمایا ہو اور بعد کے راویوں نے اسے مرفوع نقل کر دیا ہو۔ یعنی اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دی ہو۔ چونکہ ان روایات میں یہ احتمالات موجود ہیں۔ اس لئے ہمیں ان سے استدلال نہیں کرنا چاہیئے۔

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال۔

ترجمہ:۔ جب کسی بات میں مخالف احتمال پایا جائے تو اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ھذا ما رأیتہ واللہ اعلم

اگر ورثاء میں کوئی معاف کر دے

مقتول کے ورثاء میں سے اگر وارث خون معاف کر دے یا اپنے حصہ کے بقدر مال پر صلح کر لے تو ہمارے فقہاء کا خیال ہے کہ قصاص ساقط ہو جائے گا اور باقی ورثاء کو بھی بقدر ان کے حصص کے دیت میں سے رقم وصول کرنی پڑے گی۔ یہ مسئلہ بھی اسی مسلمہ اصول پر مبنی ہے کہ قصاص حقِ ورثاء ہے۔ حق مملکت نہیں۔ اگر کسی ایک وارث نے اپنا حق قصاص معاف کر کے ساقط کر دیا یا مال پر صلح کر کے ساقط کر دیا تو باقی ورثاء کا حق بھی ساقط ہو گیا کیونکہ قَوَدْ (جان کے بدلے جان) کی تجزی یعنی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس اصول کی کمزوری ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک قَوَدْ (یعنی جان کے بدلے جان) کا قانون اور اس کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ مقتول کے ورثاء کی نہیں ہے۔ مال کی کسی مقدار پر صلح یا معافی (خصوصی حالات میں) حکومت ہی کر سکتی ہے ورثاء نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے دلائل تفصیل سے بیان کر چکے ہیں اور فقہاء کے دلائل پر بحث کر چکے ہیں۔ اس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر کوئی جماعت کسی کو قتل کر دے

اگر لوگوں کی ایک جماعت کسی ایک

آدمی کو قتل کر دے تو اس کے بدلے (قَوَدْ) میں پوری جماعت کو قتل کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چونکہ مقتول ایک فرد واحد ہے تو اس کے بدلے میں ایک آدمی ہی کو قتل کیا جائے باقی کو رہائی مل جائے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے اپنے مؤطا میں اور امام شافعیؒ نے اپنی مسند میں امام مالک عن یحییٰ ابن سعید ابن المسیب کی سند سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے پانچ یا سات آدمیوں کو ایک آدمی کے بدلے (قَوَدْ) میں قتل فرما دیا تھا جسے انہوں نے خفیہ طور پر قتل کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اگر اس کے قتل میں تمام صنعاء کے باشندے شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دیتا۔ اس روایت کو دار قطنی نے بھی مغیرہ ابن شعبہ عن اسعد بن زرارہ بن جزءٍ اور طبرانی نے بھی نقل کیا ہے نیز امام بخاری نے عن نافع عن ابن عمرؓ اور ابن ابی شیبہ نے بھی نقل کیا ہے نیز ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

(دیکھئے درایہ بر حاشیہ ہدایہ ص ۵۷۲ ج ۴ مطبوعہ کلام پبلشنگ کراچی)

ہمارے ناقص خیال میں فقہاء کا یہ مسلک قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ کیونکہ جرم قتل میں سب شریک ہیں اور ان سب کو سزا ملنی چاہیئے۔

کسی ایک آدمی نے جماعت کو قتل کر دیا

اگر کسی ایک آدمی نے

پوری ایک جماعت کو قتل کر دیا اور ان سب کے ورثہ نے حکومت سے فریاد کی تو ان سب کے بدلے (قَوَدْ) میں قاتل کو قتل کر دیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مثلاً دس آدمیوں کے بدلے میں صرف ایک قاتل کے قتل کو نا کافی سمجھا جائے اور مقتولین کے ورثاء کو اس کے علاوہ اور کچھ نہیں دلایا جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مقتول کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی مقتولین کے بدلے میں اس سے ہر ایک کا خوں بہا وصول کیا جائے گا جو باقی مقتولین کے ورثاء کو دلایا جائے گا اور اگر یہ معلوم نہ ہو سکے کہ پہلا مقتول کون تھا تو قاتل کو تمام مقتولین کے بدلے میں قتل کیا جائے گا اور سب مقتولین کی دیتیں بھی وصول کی جائیں گی جو سب میں مساویانہ تقسیم کر دی جائیں گی یا قرعہ اندازی کی جائے گی جس کے نام کا قرعہ نکل آیا اس کے بدلے میں قاتل کو قتل کیا جائے گا اور باقی کو دیتیں دلوائی جائیں گی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ قتل کرنے والا ایک آدمی ہے اور مقتول ایک جماعت ہے لہٰذا ایک جماعت کے بدلے میں جب ایک ہی آدمی کو قتل کیا جائے تو مماثلت نہیں پائی گئی۔ حالانکہ قصاص میں مماثلت ضروری ہے اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ قاتل اگر جماعت ہو اور مقتول ایک ہی آدمی ہو تو ایک مقتول کے بدلے میں جماعت کو قتل کر دیا

جاتا ہے تو مماثلت تو وہاں بھی نہیں پائی جاتی تو امام شافعیؒ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہاں حکم شرعی (حضرت عمرؓ کے ارشاد) کی بناء پر قیاس کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے عکس کے لئے کوئی حکم شرعی موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس میں قیاس پر عمل کیا جانا چاہیئے۔

حیرت ہے کہ امام شافعیؒ کی طرف یہ مسئلہ کیسے منسوب کر دیا گیا۔ حالانکہ بالکل بدیہی امر ہے کہ ہر مقتول کی طرف سے حکومت الگ الگ مدعی ہے اور ہر دعویٰ قاتل کو قتل کرنے ہی کا ہے لہٰذا قاتل کا قتل مستقل طور پر ہر جرم کے مساوی اور مماثل ہے لہٰذا مماثلت پائی جا رہی ہے۔ کوئی دعویٰ بھی قاتل کو قتل کرنے کے سوا کسی اور چیز کا مدعی نہیں ہے۔ لہٰذا تمام دعوے ایک ہی چیز کے ہیں اور قاتل کو قتل کرنے سے ہر دعوے کی سزا پوری ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک ہی قتل سے تمام دعووں کی تکمیل ہو جاتی ہے اور یہ قتل ہر دعوے کے لئے الگ الگ مماثل ہے۔ ہم حنفیہؒ کے مسلک کو ترجیح دیتے ہیں۔

قاتل اگر اپنی موت سے مر جائے

اگر قتل عمد کا قاتل قَوَدَ (سزائے موت) سے پہلے ہی مر جائے تو قصاص ساقط ہو جائے گا۔ حنفیہؒ کا مسلک یہی ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ قتل عمد میں قَوَدَ (سزائے موت) اور دیت دونوں میں سے ایک لازم تھی۔ قَوَدَ (سزائے موت) تو ساقط ہو گئی لیکن اس کا بدل یعنی دیت ساقط نہیں

ہوئی لہٰذا قاتل کے ورثہ سے دیت وصول کی جائے گی۔ ہمارے نزدیک حنفیہ کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ قتل عمد میں صرف قَوَدَ واجب ہوتی ہے اور قتل خطاء میں صرف دیت۔ چونکہ قَوَدَ (سزائے موت) کا محل باقی نہیں رہا اس لئے قصاص ساقط ہو گیا۔ تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اگر دو آدمیوں نے کسی کا ہاتھ کاٹ دیا

اگر دو آدمیوں نے مل کر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا تو فقہائے حنفیہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں آدمیوں کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا بلکہ ہاتھ کی دیت دلائی جائے گی اور دونوں نصف نصف دیت ادا کریں گے۔ کیونکہ کسی ایک نے بھی پورا ہاتھ نہیں کاٹا بلکہ ہاتھ کا کچھ حصہ ہر ایک نے کاٹا ہے۔ لہٰذا قطع ید کا مکمل جرم کسی ایک سے بھی سرزد نہیں ہوا کہ بدلہ دلایا جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ کیونکہ اعضائے انسانی کا حکم نفس انسانی کے تابع ہے۔ اگر دو آدمی مل کر کسی کو قتل کر دیں تو دونوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا دو آدمی اگر ہاتھ کاٹتے ہیں تو ان دونوں کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ ہمارے نزدیک امام شافعیؒ کا قول قرآن سے قریب تر ہے۔ حنفیہؒ کا یہ فرمانا کہ قطع ید کا جرم کسی ایک سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا قابل قبول نہیں۔ کیونکہ قتل کی صورت میں جب دو آدمی مل کر کسی کو قتل کریں تو بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے کہ قتل جرم کسی ایک

سے مکمل طور پر سرزد نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں قاتلوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

کسی نے کسی کو گولی ماری اور اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی مر گیا

کسی نے ایک آدمی پر گولی چلائی اور وہ مر گیا لیکن اس کے ساتھ ہی گولی کسی دوسرے آدمی کو بھی لگ گئی اور وہ بھی مر گیا۔ تو جس شخص پر اس نے عمداً گولی چلائی تھی اس کے بدلے میں اسے قَوَدْ (جان کے بدلے جان) میں قتل کیا جائے گا اور جس کو ساتھ ہی گولی لگ گئی اور وہ مر گیا اس کے لئے اس سے دیت وصول کی جائیگی۔ کیونکہ یہ قتل خطأ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ اس نے شکار پر گولی چلائی اور وہ کسی آدمی کو لگ گئی اور وہ مر گیا تو یہ قتل خطاء ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں دونوں قتل، قتل عمد ہیں۔ اور دونوں کے بدلے اسے قتل ہی کیا جائے گا۔ دوسرے آدمی کے لئے اس پر دیت واجب نہیں ہوگی۔ غور فرمائیے کہ اگر یہ صورت پیش آجائے کہ زید نے عمرو پر عمداً گولی چلائی اور وہ عمرو کو نہیں لگی بلکہ بکر کو لگ گئی تو کیا اسے قتل خطاء کہا جائے گا؟ اور قاتل کو قَوَدْ (جان کے بدلے جان) میں قتل نہیں کیا جائے گا اور صرف دیت دلائی جائے گی۔ اس طرح تو قتل و غارت کا دروازہ کھل جائے گا کہ جس کو جی چاہے گولی مار دیجئے اور کہہ دیجئے کہ میں تو فلاں آدمی کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن غلطی

سے فلاں کو لگ گئی۔ لہٰذا یہ قتل خطاء ہے۔ میں دیت ادا کروں گا۔ مجھے قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔

شکار کی مثال صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ شکار پر گولی چلانا جرم نہیں ہے اور کسی انسان پر عمداً گولی چلانا جرم ہے۔ شکار کی صورت میں گولی چلانے والے نے عمداً جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ وہ گولی کسی آدمی کو لگ گئی۔ تو مآل اور نتیجۃً جرم بالخطاء ہوا۔ لیکن صورت مذکورہ میں ارتکابِ جرم عمداً ہوا ہے۔ گولی کسی دوسرے کو لگ جانا امر دیگر ہے۔ فاعل (یعنی قاتل) قتل عمد کا مجرم ہوا ہے۔ البتہ مقتول (یعنی مفعول) قتل خطاء کا نشانہ بنا ہے۔ قاتل کو اپنے فعل کی سزا ملتی ہے اور ملنی چاہیئے۔ کیونکہ مقتول بالخطاء کی وجہ سے قاتل بالعمد قاتل بالخطاء نہیں بن سکتا۔ فاعل کو اپنے فعل کی وجہ سے سزا ملتی ہے۔ مفعول کی وجہ سے نہیں۔

قصاص عثمان ذی النورین
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(تاریخ اسلام کا وہ ہنگامہ خیز قانونی مسئلہ
جو خلیفہ سوم کے ۱۸ ذی الحجہ کو مظلومانہ
قتل کے بعد پیش آیا)

تمام مہذب دنیا کا یہ اصول ہے اور مسلمہ اصول ہے کہ کسی بھی حکومت کے حسن و قبح کا معیار یہ ہے کہ اس کے دور میں قانون کو بالادستی حاصل تھی یا نہیں۔ اگر کسی حکومت کے عہد میں قانون کی حکمرانی تھی تو وہ ایک بہترین حکومت ہے اور اگر اس کے عہد میں قانون کو بالادستی حاصل نہیں تھی تو ایک بدترین حکومت کا مصداق ہوگی۔

اسلام جس بنیاد پر اپنی حکومت قائم کرتا ہے وہ بھی یہی ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران، راعی اور رعایا، بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص، سب اس کے تابع ہیں۔ کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں۔ اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔ دوست ہو یا دشمن، حربی کافر

ہو یا معاہد، مسلم رعیت ہو یا غیر مسلم، مسلمان وفادار ہو یا باغی برسرجنگ، غرض جو بھی ہو۔ شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے۔ جس سے کسی حال میں بھی انحراف یا تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۡ اِعْدِلُوْا ۡ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ

(۵/۸)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم اللہ کے لئے کاربرآر اور انصاف کے ساتھ نگراں بنو۔ تمہیں کسی قوم کی عداوت ناانصافی پر برانگیختہ نہ کرے۔ انصاف ہی کرو۔ یہی امر تقویٰ سے قریب تر ہے۔

اور

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

(۴/۱۳۵)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوت ایمانی! تم انصاف کے ساتھ کاربرآر اور اللہ کے لئے نگراں بنو، خواہ یہ (نگرانی)

خود تمہاری اپنی ذات یا والدین یا قریب ترین عزیزوں
کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔ اگر وہ مال دار یا فقیر ہے
تو ان دونوں کا اللہ زیادہ خیر خواہ ہے۔ لیکن تم خواہش
نفس کی پیروی نہ کرو کہ انصاف سے روگردانی کرنے لگو
اگر تم زبان کو ملوگے یا اعراض کروگے تو (جان لو کہ)
جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔

عدل و قسط کا یہی تقاضا ہے کہ ہر حال میں قانون کے
تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ انہی قوانین میں ایک قصاص کا حکم
بھی ہے۔ قرآن کریم نے اس کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ فرمایا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (۲/۱۷۹)

ترجمہ:۔ عقل و شعور رکھنے والو! قصاص (بدلہ
چکانے) ہی میں تمہاری حیات مضمر ہے اور یہ حکم اس
لئے ہے کہ تم قانون الٰہی سے ہم آہنگ رہ سکو۔

یوں تو قصاص (بدلہ چکانا) فریضۂ الٰہی ہے جو قرآن کریم
نے امت اسلامیہ پر فرض قرار دیا ہے۔ نہ صرف امت اسلامیہ
پر بلکہ امم سابقہ پر بھی یہ اسی طرح فرض تھا:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي
الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى
بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ
بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ
فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ (۲/۱۷۸)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! مقتولین کے
بارے میں تم پر قصاص (بدلہ چکانا) فرض کیا گیا ہے۔ (قتل
عمد میں) وہی آزاد آدمی اسی آزاد قاتل کے بدلے میں
قتل کیا جائے گا اور وہی غلام اسی غلام قاتل کے بدلے
میں اور وہی عورت اسی قاتل عورت کے بدلے قتل کی
جائے گی۔ (اور قتل خطاء میں) تو جو اسے اس کے بھائی
نے کچھ معاف کر دیا ہو تو دستور کے مطابق (دیت یعنی
خوں بہا وصول کرنے کے لئے) اس کا پیچھا کرنا ہوگا۔ اور
حسن سلوک کے ساتھ اسے ادائیگی کرنی ہوگی (قتل
خطاء میں) یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف
اور رحمت ہے۔ تو جو اس تخفیف کے بعد زیادتی (کرکے
قاتل کو قتل) کرے گا تو اس کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

اور

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ
بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ
وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ (۵/۴۵)

ترجمہ:۔ اور ہم نے اُن (بنی اسرائیل) پر اُس
(تورات) میں بھی فرض کیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ
کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے

کان اور دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کا قصاص (بدلہ چکانا) ضروری ہے۔

علاوہ ان عام اصولی احکام کے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ میں قرآن کریم کی مزید تصریحات بھی موجود ہیں جن سے اس قصاص کی اہمیت اور فرضیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان تصریحات کا تذکرہ ہم آگے کریں گے بہرحال قصاص صرف امت مسلمہ پر ہی نہیں بلکہ امم سابقہ پر بھی فرض تھا۔ شریعت اسلامیہ نے قتل کے سلسلہ میں یہی قانون مقرر کیا ہے کہ قاتل کو (اگر اس نے عمداً قتل کیا ہے تو اسے) قتل کیا جائے گا۔ اور اگر یہ جرم اس سے غلطی سے سرزد ہو گیا ہے۔ اس کے قصد و ارادہ کا اس میں دخل نہیں تھا تو اسے دیت یعنی خون بہا ادا کرنا ہو گا۔

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۝ (۵/۳۲)

ترجمہ:۔ جو کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، قتل کر دے تو گویا اس نے پوری نوع انسانی کو قتل کر دیا اور جو کسی کو زندہ رہنے دے تو گویا اس نے پوری انسانیت کو حیاتِ نو عطا کر دی۔

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی قوموں کے عروج و زوال کی اصل وجہ قانون ہی سے ان کے تعلق یا بے تعلقی کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

حدثنا سعید بن سلیمان قال حدثنا اللیث عن ابن شهاب عن عروة عن عائشةؓ ان قریشا اَهَمَّتْهُمُ المرأة المخزومية التی سرقت قالوا من یکلم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ومن یجترئ علیه الا اسامة ابن زیدؓ حب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فکلم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقال اتشفع فی حد من حدود اللہ ثم قام فخطب فقال یا یها الناس انما ضل من قبلکم انهم کانوا اذا سرق الشریف ترکوه واذا سرق الضعیف فیهم اقاموا علیه الحدود وایم اللہ لو ان فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد یدها۔

(بخاری کتاب الحدود ص ۱۰۰۳ ج ۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ:۔ سعید بن سلیمان نے (اپنی سند کے ساتھ) حضرت عائشہؓ سے حدیث بیان کی کہ قریش کو اس مخزومی عورت نے بڑی فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کر لی تھی۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے (اس بارے میں) کون بات کر سکتا ہے۔ سوائے اسامہ ابن زیدؓ

کے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بڑے محبوب ہیں اور کون جرأت کر سکتا ہے۔ چنانچہ (انہوں نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی) اور اسامہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بات کی تو آپ نے فرمایا۔ کیا تم اللہ کی حدود میں سے ایک حد میں سفارش کر رہے ہو؟ پھر آپ کھڑے ہوئے اور آپ نے خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! تم سے پچھلی امتوں کے لوگ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے کہ جب ان میں شریف آدمی چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو اس پر حدیں قائم کر دیتے اور اللہ کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد (اعاذہا اللہ من ذلک ورضی عنہا) چوری کرے تو محمد اس کا ہاتھ بھی کاٹ دے گا۔

اس تمام صورت حال کے پیشِ نظر قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مسئلے پر غور فرمائیے جو نہ صرف ایک انسان کا، ایک مسلمان کا، ایک صحابی کا، بلکہ صحابۂ کرام کے سربراہ اور خلیفہ کا قتل ہے، بغیر کسی وجہ کے قتل ہے۔ مرکز اسلام مدینۂ منورہ میں، روضۂ رسولؐ کے سایہ میں قتل ہے، قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے روزہ دار کا قتل ہے، انتہائی وحشیانہ درندگی کے ساتھ قتال ہے۔ ان وجوہات سے خون عثمانؓ کے قصاص کی اہمیت کس قدر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تاریخ اسلام کا یہ سب سے پہلا خون ناحق ہے جس کا قصاص لینے میں ایک طبقے کی طرف سے کمزوری کا اظہار کیا گیا۔ ورنہ اس

وقت تک کبھی اس قسم کے معاملے میں ذرا سی بھی نرمی اختیار نہیں کی گئی تھی تو اس معاملے کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور تاریخ اسلام اس کی گواہی دیتی ہے کہ یہی وہ کمزوری تھی جس کے نتیجہ میں ملّت اسلامیہ انتشار کا شکار ہوئی اور اس کمزوری نے جسد اسلام میں جو زخم ڈالے وہ آج تک مندمل نہیں ہو سکے۔ اللہ اور اس کے رسول نے قصاص نہ لینے کے جو بدنتائج بتائے تھے وہ پوری طرح سامنے آئے اور آج تک مسلمان انہیں بھگت رہے ہیں اور جب تک وہ اس کمزوری کا اعتراف نہیں کریں گے اور آئندہ کے لئے اس سے بچنے کا مصمّم ارادہ نہیں کریں گے اس وقت تک وہ ان بدنتائج کے اثرات میں مبتلا رہیں گے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے المناک ترین سانحۂ فاجعہ کو ہمارے محدثین اور مؤرخین نے جس سبائی ذہنیت (مجوسیت، عیسائیت، یہودیت) کی منظم سازش کے پروپیگنڈے سے متأثر ہو کر بیان کیا ہے اس پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے، آپ کی سیرت طیبہ کو مسخ کرنے اور آپ کے فضائل کو چھپانے میں سبائیہ فرقہ کے مؤرخین نے یہاں تک تعصب اور بغض سے کام لیا ہے کہ آپ کی ازواج مطہرات حضرت سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی چہیتی بیٹیاں ہونے تک سے انکار کرنے کی جسارت کر ڈالی۔ ان کو اس کا بھی پاس

نہیں ہوا کہ قرآن مجید کے اس صریح ارشاد کی خلاف ورزی ہے
جس میں اس نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کا
ذکر وَبَنَاتِكَ (۳۳/۵۹) یعنی آپ کی بیٹیاں (بصیغۂ جمع)
کہہ کر فرمایا ہے جو ظاہر ہے کہ جمع کا صیغہ ہے اور ایک سے
زیادہ صاحبزادیوں کے لئے بالکل واضح اور صریح ہے۔

ان کو اس کا بھی خیال نہیں ہوا کہ کل کو میدان حشر میں جب
وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے روبرو پیش ہوں گے تو
اس سفید جھوٹ کا کیا جواب دیں گے۔ ان دشمنانِ اسلام کو
حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا لقب "ذوالنورین" اتنا
کھلتا ہے کہ وہ اس لقب کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے چھین
تو نہیں سکے لیکن اپنے پروپیگنڈے سے وہ اسے مشکوک بنا دینے
کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

تمام صحابۂ کرام کے فضائل و مناقب کے تذکرے کتب
حدیث کی زینت ہیں، حدیث کی ان تمام کتابوں کو ضائع
کر کے ان کو دریا برد کر کے، انہیں جلا کر خاکستر کر کے ملیامیٹ
کیا جا سکتا ہے مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب
کے وہ آثار بھی ہیں جنہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔ مدینہ منورہ کا
بئر رومہ، مدینہ منورہ کی مسجد نبوی، مکہ مکرمہ کی مسجد حرام،
غزوۂ تبوک، بیعت رضوان اور مصاحف عثمانی۔ جب تک
اس دنیا کے صفحاتِ ارضی پر موجود ہیں۔ اور وہ انشاء اللہ تا
قیامت باقی رہیں گے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب و

فضائل کی زندہ یادگاریں ثابت ہوں گے۔

بالخصوص جب تک اس دنیا میں قرآن کریم موجود ہے۔
اور وہ انشاء اللہ ہمیشہ موجود رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت
کا ذمہ خود حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ اس میں سورۂ فتح کی وہ آیاتِ
کریمہ جو بیعتِ رضوان کے بارے میں ہیں جب تک ان کی تلاوت
ہوتی رہے گی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی گواہی
ہر فرد بشر، ہر جن و انس ہر کہ دمہ دیتا رہے گا۔

غضب تو یہ ہے کہ سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ
عنہ کے طلب قصاص کے واقعہ کو بھی خواہ مخواہ طالبانِ قصاص
(ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، حضرت زبیر بن
العوام رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے ذاتی تنازعہ کا رنگ دے کر بیعت الرضوان
کے واقعہ کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

بیعت الرضوان کے واقعہ کو علامہ شبلیؒ نعمانی نے سیرت النبی
میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

"اسلام میں فضائل چہار گانہ میں حج کعبہ ایک رکن اعظم
ہے۔ غرض مختلف اسباب سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے
مکہ معظمہ کا ارادہ کیا اور اس غرض سے کہ قریش کو کوئی اور
احتمال نہ ہو عمرہ کا احرام باندھا اور قربانی کے اونٹ ساتھ
لئے۔ یہ بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ آئے صرف
تلوار جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی پاس رکھ لی

جائے۔ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ نیام میں ہو۔

چونکہ مہاجرین عموماً اور اکثر انصار اس سعادت کے منتظر تھے۔ ۱۴۰۰ شخص اس سفر میں ہم رکاب ہوئے۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانی کی ابتدائی رسمیں ادا ہو گئیں۔ یعنی جو قربانی کے اونٹ ساتھ تھے ان کی گردنوں میں علامت کے طور پر لوہے کے نعل لگا دیئے گئے۔

احتیاط کے لئے قبیلۂ خزاعہ کا ایک شخص جس کے اسلام لانے کا حال قریش کو معلوم نہ تھا پہلے بھیجا گیا کہ قریش کے ارادے کی خبر لائے۔ جب قافلہ عسفان کے قریب پہنچا اس نے آکر خبر دی کہ قریش نے تمام قبائل (احابیش) کو یکجا کر کے کہہ دیا ہے کہ محمد مکہ میں کبھی نہیں آسکتے۔

غرض قریش نے بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاری کی قبائل متحدہ کے پاس پیغام بھیجا، وہ جمعیت عظیم لے کر آئے مکہ کے باہر بلدح کے ایک مقام پر فوجیں فراہم ہوئیں۔ خالد ابن ولید جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے دو سو سوار لے کر جن میں ابوجہل کے بیٹے عکرمہ بھی تھے مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے بڑھے اور غمیم تک پہنچ گئے جو رابغ اور جحفہ کے درمیان ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش نے خالد کو طلیعہ بنا کر بھیجا ہے اور وہ مقام غمیم تک آگئے ہیں اس لئے کترا کر داہنی طرف سے چلو۔ فوج اسلام جب غمیم تک پہنچ گئی

تو خالد کو گھوڑوں کی گرد اڑتی نظر آئی۔ وہ گھوڑا اڑاتے ہوئے گئے اور قریش کو خبر کی کہ لشکر اسلام غمیم تک آگیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم آگے بڑھے اور حدیبیہ میں پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں پانی کی قلت تھی۔ ایک کنواں تھا وہ پہلے ہی آمد میں خالی ہو گیا۔ لیکن اعجاز نبوی سے اس میں اس قدر پانی آگیا کہ سب سیراب ہو گئے۔

قبیلہ خزاعہ نے اب تک اسلام نہیں قبول کیا تھا لیکن اسلام کے حلیف اور رازدار تھے۔ قریش اور عام کفار جو منصوبے اسلام کے خلاف کیا کرتے تھے وہ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مطلع کر دیا کرتے تھے۔ اس قبیلہ کے رئیس اعظم بدیل بن ورقاء تھے (فتح مکہ میں اسلام لائے) ان کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا تشریف لانا معلوم ہوا تو چند آدمی ساتھ لے کر دربار نبوی میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ قریش کی فوجوں کا سیلاب آرہا ہے۔ وہ آپ کو کعبہ میں نہ جانے دیں گے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لڑنا مقصود نہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت زار کر دی ہے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ ان کے لئے یہ بہتر ہے کہ معین مدت کے لئے معاہدۂ صلح کر لیں اور مجھ کو عرب کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ اس پر بھی وہ اگر راضی نہیں تو اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور خدا کو جو فیصلہ کرنا ہو

کر دے۔ بدیل نے جاکر قریش سے کہا کہ میں محمد کے پاس سے پیغام لے کر آیا ہوں، اجازت ہو تو کہوں۔ چند شریر بول اٹھے کہ ہمیں محمد کا پیغام سننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سنجیدہ لوگوں نے اجازت دی۔ بدیل نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شرطیں پیش کیں۔ عروہ بن مسعود ثقفی نے اٹھ کر کہا "کیوں قریش! کیا میں تمہارا باپ اور تم میرے بچے نہیں؟" بولے "ہاں"، عروہ نے کہا "میری نسبت تمہیں کوئی بدگمانی تو نہیں؟" سب نے کہا "نہیں" عروہ نے کہا "اچھا تو مجھ کو اجازت دو۔ میں خود جاکر معاملہ طے کر لوں۔ محمد نے معقول شرطیں پیش کی ہیں"۔ غرض وہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ---------- چونکہ معاملہ ناتمام رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خراش بن امیہؓ کو قریش کے پاس بھیجا۔ لیکن قریش نے ان کی سواری کے اونٹ کو جو خاص رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سواری کا تھا مار ڈالا اور خود ان پر بھی یہی گذرنے والی تھی لیکن قبائل متحدہ کے لوگوں نے بچا لیا اور وہ کسی طرح اپنی جان بچا کر چلے آئے۔

اب قریش نے ایک دستہ بھیجا کہ مسلمانوں پر حملہ آور ہو لیکن یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ گو یہ سخت شرارت تھی لیکن رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دامن عفو اس سے زیادہ وسیع تھا۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا اور معافی دیدی۔ قرآن مجید کی اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے:

وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ (۴۸/۲۴)

ترجمہ: اور اللہ ہی نے تو مکہ معظمہ میں تمہارے ہاتھوں کو ان سے اور ان کے ہاتھوں کو تم سے تمہیں ان پر کامیابی عطا فرما دینے کے بعد روک دیا تھا۔

بالآخر آپؐ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ[1] کا انتخاب کیا۔ لیکن انہوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص نہیں کہ مجھ کو بچا سکے لہٰذا

[1] حضرت عمرؓ کے متعلق جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پہلے ان کا انتخاب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ان کے معذرت کرنے کے بعد حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آیا تیسرے درجہ کی روایت ہے جس کا ذکر صحیحین میں نہیں ہے۔ یہ روایت نہ روایتاً صحیح ہے نہ درایتاً صحیح ہے۔ حضرت عثمانؓ کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ان کا خاندان ہی حکمران تھا اور وہی معزز ترین شخصیت تھے جیسا کہ آگے حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں آرہا ہے۔ یہ کسی شیعہ راوی کی شرارت معلوم ہوتی ہے جس سے اس کا مقصد حضرت عمرؓ کی توہین ہے اور ان کی بزدلی کا اظہار ہے۔ اگر کسی اور کو منتخب کرنا ہوتا تو حضرت علیؓ کو منتخب کیا جاتا جن کے خاندان کی اکثریت مکہ معظمہ میں موجود تھی مثلاً حضرت عباسؓ وغیرہ لیکن چونکہ حضرت علیؓ کی وہ عزت و عظمت نہیں تھی جو حضرت عثمانؓ کی تھی اس لئے اُنہیں نہیں بھیجا گیا۔ بخاری کی ابن عمرؓ والی روایت اس پر بالکل واضح ہے جو آگے آرہی ہے۔ (مؤلف)

آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا[1]۔ وہ اپنے ایک عزیز (ابان بن سعید) کی حمایت میں گئے۔ اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا قریش نے ان کو نظر بند کر لیا۔ لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے۔ یہ خبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔

تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے۔

یہ کہہ کر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہؓ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ تمام صحابہ جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے۔ اس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے۔ سورۂ فتح میں اس واقعہ کا اور درخت کا ذکر موجود ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ○

(۱۸/۴۸)

---

[1] یہ حضرت عثمانؓ کی سفارتی صلاحیتوں کی واضح دلیل ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کی طرف مسلمانوں کی جو اولین سفارت روانہ فرمائی تھی اس کے قائد بھی حضرت عثمان غنیؓ ہی تھے۔ حبشہ کی طرف دوسری سفارت کے قائد حضرت جعفر طیارؓ تھے۔ (مؤلف)

ترجمہ :۔ اللہ مؤمنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے جاں نثاری کی بیعت کر رہے تھے۔ اس نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس نے مسلمانوں پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں ایک قریبی فتح عطا فرمائی۔

(سیرت النبی ص ۴۴۹-۴۵۴ ج ۱ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڈھ انڈیا)

قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا مگر حضرت عثمانؓ سے کہا کہ آپ خود طواف کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اجازت ہے مگر محمد کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا :۔

"یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو روک دیئے جائیں اور میں خود طواف کر لوں"

(حکایات صحابہ از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب ص ۳۷۶ بحوالہ تاریخ خمیس)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ :۔

لو کان احد اعز ببطن مکۃ من عثمانؓ لبعثہ مکانہ فبعثہ، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق، باب مناقب عثمان)

ترجمہ :۔ وادی مکہ میں اگر کوئی اور شخص حضرت عثمانؓ سے زیادہ معزز ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو

بھیجتے لیکن آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمانؓ ہی کو بھیجا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

کان عثمانؓ رسول رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم الی مکۃ فبایع الناس فقال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ان عثمان فی حاجۃ اللہ وحاجۃ الرسول فضرب باحدیٰ یدیہ علی الاخریٰ فکانت ید رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لعثمانؓ خیرا من ایدیھم لانفسھم۔

(ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح باب مناقب عثمانؓ)

ترجمہ: عثمانؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے رسول (سفیر) کی حیثیت سے مکہ گئے ہوئے تھے۔ صحابہؓ نے بیعت کرلی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا درحقیقت عثمانؓ اللہ اور رسول کے کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ (حضرت عثمانؓ کی طرف سے اپنے) دوسرے ہاتھ پر مارا۔ پس حضرت عثمانؓ کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک لوگوں کے اپنے ہاتھوں سے جنہوں نے خود اپنی طرف سے بیعت کی تھی (ہزار درجہ) بہتر تھا۔

شانِ یدِ الٰہی

ملاحظہ فرمائیے کہ اِدھر تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک کو حضرت عثمانؓ

کا ہاتھ قرار دے رہے ہیں اور اُدھر حق تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو خود اپنا ہاتھ قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (سورۂ فتح)

حدیبیہ میں بیعت لیتے وقت اللہ تعالیٰ کا دستِ قدرت لوگوں کے ہاتھ کے اوپر تھا۔ اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا جو دستِ رحمت اللہ کی طرف سے بیعت لے رہا تھا وہی دست رحمت عثمانؓ کی طرف سے بیعت کر رہا تھا تو ذاتِ اقدس واعظم کا جو دستِ رحمت "یَدُ اللّٰہِ" تھا، وہی "ید عثمان" بھی تھا۔ اللہ اکبر! یہ شانِ عثمان کہ پروردگارِ عالم ان کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دے رہا ہے اور "ید عثمانؓ" کو "یَدُ اللّٰہِ" قرار دے رہا ہے ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ؎

؎ ایک خاص فرقہ کو قرآن کریم اور اقوال نبوی میں چونکہ تحریف سے شغف ہے اس لئے حیرت نہ ہونی چاہیئے اگر وہ قرآن کریم کے خلاف ید اللہ کا خطاب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت عثمانؓ سے چھین کر حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا اسد اللہ کا خطاب جو جنگ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کو ان کے کارہائے نمایاں پر عطا فرمایا تھا حضرت علیؓ پر چسپاں کر دیں یا سید الشہداء کا خطاب جو جنگ احد میں شہید ہونے پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا گیا تھا شہید کربلا حضرت حسینؓ پر چسپاں کر دیں۔ اس فرقہ کی یہ عادت رہی ہے۔ (مؤلف)

پیغمبر انسانیت اور صحابہ کرام کے اس خوش آئند عمل بیعت سے مسرور ہو کر رب کائنات جل وعلا نے اپنی خوشنودی اور رضا کا اظہار سورۂ فتح میں یوں فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ○ (۴۸/۱۰)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! (قصاص عثمانؓ کے لئے) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں کے اوپر (آپ کا ہاتھ نہیں) اللہ کا ہاتھ ہے۔ تو (قصاص عثمانؓ کے معاملے میں) جو عہد شکنی کرے گا اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی پر پڑے گا اور جو اللہ سے کیے گئے عہد کو پورا کرے گا تو اللہ اسے بہت جلد بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

قصاص عثمانؓ کی پیشگوئی

اس بیعت کو حق تعالیٰ نے جو اہمیت عطا فرمائی ہے وہ قرآن کریم کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ کہ اے پیغمبر! جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے اور پھر مزید یہ بھی کہ فَمَنْ نَّکَثَ

فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا تو جو اس عہد کو توڑے گا تو اس کی عہد شکنی کا وبال خود اسی کی ذات پر پڑے گا اور جو اپنے اس عہد کو وفا کرے گا جو اس نے اللہ سے کیا ہے تو اللہ اسے بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ یہ پوری آیت نہایت ہی غور طلب ہے۔ بیعت کی غیر معمولی اہمیت جتلانے کے بعد یہ فرمانا کہ جو اس عہد کو توڑے گا اس کی عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات پر پڑے گا اور جو اپنا عہد وفا کرے گا اسے حق تعالیٰ اجرِ عظیم عطا فرمائے گا اس اعتبار سے انتہائی غور طلب ہے کہ اس واقعۂ حدیبیہ میں تو حضرت عثمانؓ کے متعلق یہ اطلاع کہ ان کو شہید کر دیا گیا ہے غلط تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خبر کا غلط ہونا معلوم ہی نہ ہو مگر اس عالم الغیب والشہادۃ کو تو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی جس نے یہ آیت نازل فرمائی تھی کہ یہ خبر غلط ہے۔ اس آیت کا تعلق صلح حدیبیہ کے موقع پر افواہ قتل سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر اس آیت کا تعلق واقعۂ حدیبیہ کے افواہ قتل سے ہوتا تو حق تعالیٰ کا یہ ارشاد کبھی بھی ان الفاظ میں نہ ہوتا بلکہ اس کے بجائے ان الفاظ میں ہوتا کہ "

"اے پیغمبر اسلام! آپ خواہ مخواہ دلگیر نہ ہوں، آپ کا فرستادہ زندہ سلامت محفوظ ہے۔ ہم اس کے محافظ ہیں۔ لوگوں نے خفیہ تدابیر کی تھیں، ہم نے بھی خفیہ تدابیر کیں اور ہم نے ان کی تدابیر کو ناکام بنا دیا۔ وہ بخیر و عافیت تھوڑے وقفہ

سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ آپ اس سلسلہ میں کوئی بیعت نہ لیں۔"

لامحالہ اس واقعہ کا تعلق آئندہ پیش آنے والے واقعات ہی سے ہے جو حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھے کہ آئندہ چل کر اس قسم کے واقعات پیش آئیں گے کہ حضرت عثمانؓ واقعی دشمنانِ اسلام منافقین کے ہاتھوں شہید کر دیئے جائیں گے اور کچھ بہترین لوگ اپنے وعدہ کو وفا کریں گے اور قصاصِ عثمان کیلئے کھڑے ہوں گے جبکہ کچھ لوگ عہد شکنی کا ارتکاب کریں گے۔ یہ بیعت اس آئندہ قصاص عثمانؓ کے لئے ضروری ہے تو جو اس وقت اپنا عہد پورا کرے گا حق تعالیٰ اس کو اجر عظیم عطا فرمائیں گے اور جو اپنے اس عہد کو توڑے گا تو اس عہد شکنی کا وبال خود اس کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

چونکہ حدیبیہ کے موجودہ واقعہ میں اس عہد کو نہ تو پورا کرنے کا سوال درپیش تھا اور نہ عہد شکنی کا۔ لہٰذا باری تعالیٰ کا یہ ارشاد جو عالم الغیب والشہادۃ ہے، بے معنیٰ، بے فائدہ اور بے مطلب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا لامحالہ ان آیات کا تعلق آئندہ کے واقعۂ شہادت حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہے جو پیش آنے والا تھا اور حق تعالیٰ کو جو عالم الغیب والشہادۃ ہے اس کا پورا پورا علم تھا اور اسی میں یہ صورتِ حال پیش آئی کہ کچھ حضرات نے اپنے اس عہد کو وفا کیا اور کچھ لوگوں نے عہد کو وفا کرنے میں کمزوری دکھائی۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے

ہاں اجر عظیم کے مستحق ہوئے اور کچھ کمزوری دکھا کر اس کے نتیجے میں مصیبتوں میں مبتلا ہوئے جس کا وبال اُمّت آج تک بھگت رہی ہے۔

بہر حال یہ آیات ایک طرح کی پیشین گوئی ہیں جو آنے والے واقعات کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہیں ورنہ بیعتِ رضوان کے موقعہ پر یہ تمام آیات بے معنیٰ، بے مصرف اور بے فائدہ قرار پاتی ہیں۔

دوسری پیشین گوئیاں

سورۂ فتح ہی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ فاجعہ اور قصاص عثمان کی پیشگوئی کے علاوہ آئندہ پیش آنے والے دیگر واقعات کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں۔ واقعہ صلح حدیبیہ کے ضمن میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا

عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ○ (۴۸/۱۸-۲۱)

ترجمہ :۔ اللہ مؤمنوں سے راضی ہو چکا ہے جب وہ (اے پیغمبر!) آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اللہ نے جان لیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ان پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور انہیں قریبی فتح عطا فرمائی اور بہت سے اموال غنیمت عطا فرمائے جنہیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ بڑے غلبہ اور حکمت والا ہے۔ اللہ نے تم سے کثیر اموال غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے جنہیں تم حاصل کرو گے۔ یہ اس نے تمہیں جلد ہی دیدیا اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مؤمنوں کے لئے ایک نشانی بن جائے اور وہ تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہنمائی فرمادے اور اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ واقعۃً اللہ ہی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہوگا اور اللہ تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

ان چار آیات میں متعدد پیشین گوئیاں فرمائی گئی ہیں:۔

(۱) پہلی آیت کریمہ (۴۸/۱۸) میں بیعت رضوان کا بیان فرمانے کے بعد یہ بتا کر کہ حق تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ مسلمانوں کے قلوب میں اس وقت کیا کچھ تھا اور یہ کہ حق تعالیٰ نے اس وقت مؤمنین کے قلوب پر اپنا سکینہ نازل فرمایا تھا پہلی پیشگوئی

تو یہ فرمائی گئی ہے کہ ہم نے مسلمانوں کو ایک قریبی فتح عطا فرمائی ہے جس سے مراد متفقہ طور پر فتح مکّہ ہے جس پر تمام علمائے مفسرین کا اتفاق ہے۔

(۲) اسی کے بعد دوسری آیت کریمہ میں وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا سے مراد فتح مکّہ کے بعد فوراً ہی جنگ حُنین میں اموال غنیمت کا بکثرت حاصل ہونا مراد ہے۔ یہ دوسری پیشگوئی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی سیرت النبی میں لکھتے ہیں کہ :۔

"طائف کا محاصرہ چھوڑ کر آپ جعرانہ تشریف لائے۔ غنیمت کا بے شمار ذخیرہ تھا، چھ ہزار اسیرانِ جنگ، چوبیس ہزار اونٹ چالیس ہزار سے زیادہ بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی تھی۔ اسیرانِ جنگ کے متعلق آپ نے انتظار کیا کہ ان کے عزیز و اقارب آئیں تو ان سے گفتگو کی جائے۔ لیکن کئی دن گذرنے پر کوئی نہ آیا۔ غنیمت کے پانچ حصے کئے گئے۔ چار حصے حسبِ قاعدہ فوج کو تقسیم کئے گئے، خمس بیت المال اور عزباء و مساکین کے لئے رکھا گیا۔

(سیرت النبی ص ۵۴۲ ج ۱ مطبوعہ معارف اعظم گڑھ)

(۳) تیسری آیت کریمہ میں پھر ارشادِ الٰہی ہے :۔ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ○ یعنی پھر اللہ نے کثیر تعداد میں اموالِ

غنیمت کا وعدہ فرمایا ہے تو اللہ نے تمہیں جلدی ہی (اسی دنیا میں) یہ اموال عطا فرما دیئے اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا تاکہ مسلمانوں کے لئے یہ ایک نشانی بن جائے اور تمہیں سیدھی راہ کی طرف رہنمائی عطا فرمائے۔ اس آیتِ کریمہ میں یقیناً ان فتوحات عظیمہ اور مغانم کثیرہ کی پیشگوئی فرمائی گئی ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دورِ خلافت میں ایران، شام، مصر، افریقہ، خراسان، کابل اور قبرص کے مقامات پر حاصل ہوئیں اور کفار کو ہر مقام پر ہزیمت اُٹھانی پڑی وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ (اور لوگوں کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔ وہ تم پر فتحیاب نہ ہو سکے اور تاکہ یہ مسلمانوں کے لئے نشانی بن جائے۔)

مزید شہادت

(۴) اس کے بعد چوتھی آیت میں ارشادِ الٰہی ہے وَأُخْرَىٰ لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا یعنی اللہ نے تم سے ایک دوسری فتح کا بھی وعدہ فرمایا ہوا ہے جس پر تم قادر نہ ہو سکو گے۔ اللہ ہی نے اس کا احاطہ کیا ہوا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ وہ دوسری فتح کون سی ہے جس کو حاصل کرنے سے مسلمان قاصر ہوں اور اُن کی قوت اُنہیں اس سے عاجز کر دے اور اللہ کا غیر مرئی ہاتھ ہی کارسازی فرمائے۔ خود مسلمانوں کو (ان کی حکومت کو) اس پر کوئی قدرت نہ رہے۔ پھر اللہ ہی اس کا احاطہ فرمائے اور

اللہ ہی اس کا فیصلہ فرمائے۔ وہ کونسی فتح و نصرت ہے جس کی پیشگوئی اس آیت کریمہ میں فرمائی گئی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ دوسری فتح جس میں یہ صورت پیش آئی کہ مسلمان اسے حاصل کرنے پر قادر نہ ہو سکے اور بے بس ہو کر رہ گئے وہ واقعۂ فاجعہ شہادت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتنۂ کبریٰ ہی تھا۔ ملّت اسلامیہ کا خلیفہ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے جسم پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی اسی ملّت اسلامیہ کا چوتھا خلیفہ یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ:

"شورش برپا کرنے والے دو ہزار آدمیوں کی جمعیت مدینے میں موجود تھی کہ حضرات طلحہ و زبیر، رضی اللہ عنہما چند دوسرے اصحاب کے ساتھ ان سے (حضرت علیؓ سے) ملے اور ان سے کہا کہ ہم نے اقامت حدود کی شرط پر آپ سے بیعت کی ہے۔ آپ ان لوگوں سے قصاص لیجئے جو حضرت عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا "بھائیو! جو کچھ آپ جانتے ہیں اس سے میں بھی ناواقف نہیں ہوں مگر ان لوگوں کو کیسے پکڑوں جو اس وقت ہم پر قابو یافتہ ہیں نہ کہ ہم ان پر۔ کیا آپ حضرات اس کام کی کوئی گنجائش دیکھ رہے ہیں جسے آپ کرنا چاہتے ہیں؟" سب نے کہا۔ "نہیں" اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "خدا کی قسم میں بھی وہی خیال رکھتا ہوں جو آپ کا ہے۔ ذرا حالات سکون پر آ جانے دیجئے تاکہ لوگوں کے حواس برجا ہو جائیں۔ خیالات کی پراگندگی دور

ہو اور حقوق حاصل کرنا ممکن ہو جائے۔

(خلافت و ملوکیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۲۷-۱۲۸ بحوالہ طبرانی ص ۴۵۸ ج ۳، ابن الاثیر ص ۱۰۰ ج ۳ البدایہ والنہایہ ص ۲۲۷-۲۲۸ ج ۷)

میں یہ سمجھتا ہوں کہ وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا سے مراد یہی فتنۂ کبریٰ یعنی شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہے اور اس آیت میں اسی کی پیشگوئی فرمائی گئی ہے۔ ورنہ مجھے بتایا جائے کہ دورِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ دوسری جنگ اور کون سی ہے جسے اس آیتِ کریمہ کا مصداق سمجھا جائے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت) یوں بے بس ہو گئی ہو اور اس کے دفعیہ پر انہیں قدرت نہ رہی ہو، وہ قاتلین و مجرمین کو کیفر کردار تک پہنچانے سے اپنے عجز و قصور کا یوں برملا اعتراف کرے اور حق تعالیٰ کے غیر مرئی ہاتھوں نے خود ہی اس کا احاطہ کر کے ایک ایک مجرم کو فی النار والسقر کیا ہو۔ مجھے دورِ صحابہ میں (بلکہ اس کے بعد بھی) دوسری کوئی فتح ایسی نظر نہیں آتی جس کے مقابلہ سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ (خلافت) نے یوں اپنی بے بسی کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہو اور صحابۂ کرام واقعی بے بس ہو گئے ہوں۔ لیکن قدرت الٰہیہ ایک ہودج نشین خاتون خانہ صنف لطیف (صدیقۂ کائنات محبوبۂ رحمت للعٰلمین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے وہ کام لے لے

جس سے بڑے بڑے سورما اور شیر بیشہ اپنے عجز و قصور کا برملا اعتراف کر رہے ہوں۔ لہٰذا میرے نزدیک یہ آیت کریمہ اسی واقعۂ فاجعہ سے متعلق ہے۔

اس سے یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کی ان آیات کا تعلق چونکہ حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی ہونے والی شہادت کے واقعۂ فاجعہ سے ہے۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون کا قصاص لینا نہ صرف قرآن کریم کی آیت کریمہ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی کی نص صریح کے مطابق فرض تھا بلکہ ان آیات کریمہ کا بھی منشأ و مدلول تھا۔ لہٰذا حضرات طلحہ و زبیر و ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے موقف کی مزید توثیق و تائید ہو جاتی ہے۔ جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عن سائر المسلمین والمسلمات۔

حضرت علیؓ کی پوزیشن

حضرت علی رضی اللہ عنہ طبعاً ایک فوجی سپاہی تھے۔ حرب و ضرب ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بنو ہاشم ویسے بھی عملی سیاست سے ہمیشہ یکسو رہے تھے۔ خانۂ کعبہ کی تولیت کی وجہ سے جس پر بنو ہاشم نے قبضہ کر لیا تھا دینی و مذہبی ارکان حج کی ادائیگی کی ذمہ داری اور حرم کی مجاوری کی وجہ سے سیاست ملکی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا اس لئے فطرۃً حضرت علیؓ ایک کامیاب حکمراں نہیں تھے۔ انہیں

اجتماعی سیاست نہیں آتی تھی۔ وہ میدانِ جنگ کے ہیرو تھے وہ میدانِ سیاست کے ہیرو نہیں تھے اور یہ ان کی کوئی منقصت نہیں تھی۔ کیونکہ کوئی شخص بھی بیک وقت تمام میدانوں کا ہیرو نہیں ہوتا اور نہیں ہو سکتا اس لئے سیاسی طور پر ان سے بہت سی فروگذاشتیں ہوئیں جو آگے چل کر ان کے خلاف پڑیں۔ بلکہ ان کے موافقین و مخالفین سب کے نزدیک یہ بھی ایک طے شدہ حقیقت سمجھی جاتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰؒ مودودی جو حضرت علیؓ کی طرف سے سب سے بڑے وکیل صفائی کی پوزیشن اختیار کر چکے ہیں، خلافت و ملوکیت میں رقم طراز ہیں کہ:۔

"سیدنا علیؓ رضی اللہ عنہ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لئے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابل[1] اعتبار

[1] مودودی صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ جن تاریخی کتابوں یعنی تاریخ طبری و طبقات ابن سعد وغیرہ کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عثمانؓ حضرت معاویہؓ، طلحہؓ و زبیرؓ و ام المومنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ اور ان کے طرفدار صحابہ کرام مثلاً حضرت مغیرہ بن شعبہؓ و عمرو بن العاصؓ وغیرہ پر الزامات لگائے ہیں، انہی کتابوں میں حضرت علیؓ کے متعلق واضح طور پر یہ بھی موجود ہے کہ حضرت علیؓ

تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذا ان کا محض اپنے کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا کہ درحقیقت چاروں خلفاء اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

(خلافت و ملوکیت ص۱۵۵ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور اشاعت اوّل اکتوبر ۱۹۶۶ء)

بخاری کی یہ مفصل روایت بھی ملاحظہ ہو:۔

حدثنا یحیی ابن بکیر قال حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شھاب عن عروۃ عن عائشۃ ان فاطمۃ بنت النبی صلے اللہ علیہ وسلم ارسلت الی ابی بکر تسألہ میراثھا من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مما افاء اللہ علیہ بالمدینۃ وفدک و ما بقی من خمس خیبر فقال ابو بکر ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ

حضرت فاطمہؓ کو گدھے پر بٹھا کر انصار کے گھروں کا چکر کاٹتے رہے ہیں اور ان سے یہ اپیلیں کرتے رہے ہیں کہ وہ ابوبکرؓ کی بیعت توڑ کر مجھے خلیفہ بنالیں۔ بلکہ خود مودودی صاحب نے رسائل و مسائل حصہ اول میں حضرت علیؓ کی امیدواریٔ خلافت کے عنوان کے تحت ان روایات کا وجود تسلیم کیا ہے۔ (مؤلف)

وسلم قال لا نورث ما تركنا صدقة انما
يا كل ال محمد فى هذا المال واني والله لا اغير
شيئا من صدقة رسول الله صلى الله عليه
وسلم عن حالها التى كان عليها فى عهد
رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا عملن فيها
بما عمل به رسول الله صلى الله عليه وسلم
فابى ابو بكر ان يدفع الى فاطمة منها
شيئا فوجدت فاطمة على ابى بكر فى ذلك
فهجرته فلم تكلمه حتى توفيت وعاشت
بعد النبى صلى الله عليه وسلم ستة اشهر
فلما توفيت دفنها زوجها علي ليلا ولم
يوذن بها ابو بكر وصلى عليها وكان لعلي
من الناس وجه حياة فاطمة فلما توفيت
استنكر علي وجوه الناس فالتمس مصالحة
ابى بكر ومبايعته ولم يكن يبايع تلك
الاشهر فارسل الى ابى بكر ان ائتنا ولا ياتنا
احد معك كراهية ان يحضر عمر فقال عمر
والله لا تدخل عليهم وحدك فقال ابو بكر
وما عسيتم ان يفعلوه بي والله لآتينهم
فدخل عليهم ابو بكر فتشهد علي فقال
انا قد عرفنا فضلك وما اعطاك الله ولم

نتنفس عليك خيرا ساقه الله اليك ولكنك
استبددت علينا بالامر وكنا نرى لقرابتنا
من رسول الله صلى الله عليه وسلم نصيبا
حتى فاضت عينا ابى بكر فلما تكلم ابو بكر
قال والذى نفسى بيده لقرابة رسول الله
صلى الله عليه وسلم احب الى ان اصل من
قرابتى واما الذى شجر بينى وبينكم من هذه
الاموال فانى لم آل فيها عن الخير ولم
اترك امرا رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم
يصنعه فيها الا صنعته فقال علي لابى بكر
موعدك العشية للبيعة فلما صلى ابو بكر
الظهر رقى على المنبر فتشهد وذكر شان
علي وتخلفه عن البيعة وعذره الذى
اعتذر اليه ثم استغفر وتشهد علي فعظم
حق ابى بكر وحدث انه لم يحمله على
الذى صنع نفاسة على ابى بكر ولا انكار
للذى فضل الله به ولكنا كنا نرى
لنا فى هذا الامر نصيبا واستبد علينا فوجدنا
فى انفسنا فسر بذلك المسلمون وقالوا
اصبت وكان المسلمون الى علي قريبا حين

راجع الامر بالمعروف۔

(صحیح بخاری ص۶۰۹ ج۲ کتاب المغازی باب غزوۃ خیبر)

ترجمہ:۔ ہم سے یحییٰ بن بکیر نے اور ان سے لیث نے حدیث بیان کی عن عقیل عن ابن شہاب عن عروہ عن عائشہ رضی اللہ عنہا کہ فاطمہؓ بنت نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ابو بکرؓ کے پاس پیغام بھیجا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا جو اللہ نے آپ کو بطور فئے کے مدینہ منورہ، فدک اور خیبر کے خمس کے بقایا سے عطا فرمایا تھا۔ تو ابو بکرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہم چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آل محمدؐ اس مال میں سے کھا سکتی ہے۔ اور میں اللہ کی قسم رسول اللہ کے صدقہ میں سے کسی چیز کو اس حالت سے جس پر وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا اور میں اسی طرح عمل کرتا رہوں گا جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عمل فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے اس میں سے کچھ بھی حضرت فاطمہؓ کو دینے سے انکار کر دیا۔ اس بارے میں حضرت فاطمہؓ حضرت ابو بکرؓ سے ناراض ہو گئیں چنانچہ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے قطع تعلق کر لیا اور بول چال بند کر دی حتی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور وہ رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ مہینے زندہ رہیں۔ تو جب ان کا انتقال ہو گیا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات ہی کو انہیں دفن کر دیا اور ابو بکرؓ کو خبر بھی نہیں دی اور خود ہی جنازہ کی نماز پڑھا دی اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی میں لوگوں کی طرف سے حضرت علیؓ کے لئے عزت و حرمت تھی۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے لوگوں کے چہروں میں کافی تبدیلی محسوس کی۔ چنانچہ انہیں حضرت ابو بکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کر لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ان تمام (چھ) مہینوں میں انہوں نے بیعت نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابو بکرؓ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے لیکن آپ کے ساتھ کوئی دوسرا نہ آئے۔ وہ حضرت عمرؓ کے آنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ تو حضرت عمرؓ نے ابو بکر صدیقؓ سے کہا کہ نہیں۔ اللہ کی قسم آپ ان کے ہاں اکیلے نہیں جائیں گے۔ تو حضرت ابو بکرؓ فرمایا۔ تمہیں کیا توقع ہے وہ میرا کیا کر لیں گے؟ اللہ کی قسم میں ان کے ہاں ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ ابو بکرؓ گئے۔ علیؓ نے خطبہ پڑھا اور کہا ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے خوب جانتے ہیں اور جو بھلائی اللہ نے آپ کو بخشی ہے اس پر ہم آپ سے حسد نہیں کرتے لیکن آپ نے ہمارے خلاف حکومت کے معاملے میں استبداد سے کام

لیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی
قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے چنانچہ ابو بکرؓ
آبدیدہ ہو گئے۔ جب ابو بکرؓ نے بات کی تو فرمایا کہ اس
ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے،
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت صلہ رحمی کے لئے
مجھے اپنی قرابت سے زیادہ محبوب ہے۔ جو کچھ میرے اور
تمہارے درمیان ان اموال کے بارے میں اختلافات
پیدا ہوئے تو یقیناً اس بارے میں میں نے نیکی کرنے میں
کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے کسی ایسی بات کو نہیں چھوڑا
جسے میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا تھا۔
چنانچہ میں نے ویسا ہی کیا تو علیؓ نے ابو بکرؓ سے کہا کہ بیعت
کے لئے آپ سے شام کا وعدہ ہے۔ چنانچہ ابو بکرؓ نے
ظہر کی نماز پڑھ لی تو وہ ممبر پر چڑھے، خطبہ پڑھا اور علیؓ
کی بات کو بیان کیا اور بیعت میں پیچھے رہ جانے کا جو عذر
انہوں نے بیان کیا تھا اس کا ذکر کیا۔ پھر علیؓ نے استغفار
کیا اور خطبہ پڑھا اور ابو بکرؓ کے حق کی عظمت بیان
کی اور کہا کہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کی وجہ نہ ابو بکرؓ
سے حسد تھا اور نہ اس برتری کا انکار تھا جو اللہ نے انہیں
عطا فرمائی ہے لیکن ہم امر حکومت میں اپنا حصہ اور حق
سمجھتے تھے اور انہوں نے ہمارے خلاف استبداد سے
کام لیا تو ہم اپنے دلوں میں ان سے ناراض ہو گئے تھے۔

مسلمان اس بات پر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم نے بہت
اچھا کیا، اس طرح جب حضرت علیؓ نے حق کے مطابق
اپنی پہلی روش سے رجوع کر لیا تو مسلمان ان سے پھر قریب
ہو گئے۔

مندرجہ بالا حدیث صحیح بخاری کی ہے۔ اس میں دو باتیں
خاص طور پر قابل غور ہیں۔ اول تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا
کا وراثت کا مطالبہ اس زمین کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور فئے کے عطا فرمائی تھی۔ مال فئے وہ
مال ہوتا ہے جو بغیر کسی جدوجہد کے مملکت کو حاصل ہو جائے
آپ کے پاس اپنی کوئی ذاتی جائیداد نہیں تھی۔ جو کچھ تھا وہ
مال فئے ہی تھا جو آپ کی تحویل میں تھا اور جس سے آپ اپنے
اہل وعیال کی خبر گیری فرماتے تھے اور عالم عرب کے مختلف
علاقوں سے جو وفود آتے تھے ان کی میزبانی فرماتے تھے۔ نیز
ضرورت مندوں کی حاجت روائی میں بھی اسی فنڈ سے خرچ
کیا کرتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ
رضی اللہ عنہا کے جواب میں ارشاد نبوی پیش کیا کہ لا
نورث ما ترکنا صدقة (ہمارے ترکہ میں وراثت جاری
نہیں ہوتی۔ ہم جو کچھ چھوڑ جائیں وہ صدقہ ہوتا ہے) لیکن
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بجائے اس ارشاد نبوی کا قائل
ہونے یا اس کا انکار کرنے کے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ
عنہ سے ناراض ہو گئیں اور ان سے قطع تعلق کر لیا اور بول چال

بند کر دی۔ اگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس کے خلاف کوئی ارشاد نبوی پیش فرماتیں یا حضرت صدیق اکبرؓ کی تکذیب ہی فرما دیتیں تو ان کا موقف قابل فہم ہوتا۔

مال فئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتی ملکیت نہیں تھا۔ وہ مملکت کی ملکیت تھا البتہ سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تحویل میں تھا۔ لہٰذا اس میں وراثت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلیفہ اور جانشین کی تحویل میں جانا چاہیئے تھا۔[1]

---

[1] برٹش قانون میں بھی جو آزادی سے پہلے ہندوستان میں رائج تھا (اور آج تک ہندو پاکستان میں رائج ہے) گورنر جنرل کو کسی جدوجہد کے بغیر تحائف کی شکل میں جو کچھ حاصل ہوتا تھا وہ حکومت ہی کی ملکیت ہوتا تھا اور خزانۂ عامرہ میں جمع کر دینا پڑتا تھا۔ چنانچہ مختلف ریاستوں کی طرف سے جو تحائف گورنر جنرل کو پیش کئے جاتے تھے ان کے سلسلہ میں نوابوں اور راجاؤں نے گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ وہ تحائف گورنر جنرل کو پیش کرنے کے بجائے ان کی بیگم کو پیش کرنے لگے تھے۔ بہرحال یہ اصول برطانوی حکومت نے اسلام ہی کے اس اصول سے اخذ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ جو بات غیر مسلم مغربی حکمرانوں کی سمجھ میں آ گئی وہ بنت رسول اکرم حضرت فاطمۃ زہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی سمجھ میں نہیں آ سکی ؎

بسوخت عقل زحیرت

دوسری بات جو انتہائی حیرتناک ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اور پھر مسجد نبوی میں مجمع عام کے اندر تمام صحابہ کے سامنے خلافت پر برملا اپنا حق جتا رہے ہیں جس کی وجہ قرابت نبوی بتا رہے ہیں لکنک استبددت علینا بالامر وکنا نری لقرابتنا من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نصیبًا (لیکن آپ نے ہمارے خلاف حکومت کے معاملہ میں استبداد سے کام لیا ہے اور ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے اس میں اپنا حصہ سمجھتے تھے) اور لکنا کنا نری فی ھذا الامر نصیبًا واستبد علینا (ہم اس امر حکومت میں اپنا حصہ سمجھتے تھے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے) یعنی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی بناء پر ہم اپنے آپ کو حکومت کا حقدار سمجھتے تھے۔ گویا رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر جو جدوجہد فرمائی تھی وہ معاذ اللہ اپنے خاندان کی حکومت قائم کرنے کے لئے فرمائی تھی۔ رسالت اور نبوت کا تو محض ایک ڈھونگ تھا ورنہ آپ بھی (خاکم بدہن) ایک دنیادار سیاست داں تھے جو اپنی اور اپنے خاندان کی سیادت قائم کرنے کے لئے اُٹھے تھے۔

حضرات انبیاء کرام جب کسی قوم کی طرف اس کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے جاتے ہیں تو وہ قوم سے کسی اجر یا صلے کے طلبگار نہیں ہوتے۔ ان کی ساری تگ و تاز بلا مزد و معاوضہ

ہوا کرتی ہے۔ ان کا اجر ان کو حق تعالیٰ کے ہاں سے ملتا ہے۔ وہ اپنے خاندان یا اپنی ذات کے لئے کسی شرف و فضیلت کے خواستگار نہیں ہوا کرتے۔ وہ حق تعالیٰ کی طرف سے رسول بن کر اس لئے نہیں آتے کہ اپنے لئے یا اپنے خاندان کیلئے بادشاہت حاصل کرلیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے حق تعالیٰ نے بار بار یہ اعلان کرایا ہے کہ میں اپنی اس خدمت (ہدایت و رہنمائی) کا کوئی معاوضہ یا صلہ تم سے نہیں مانگتا۔ میرا اجر میرا پروردگار ہی مجھے دے گا۔ چنانچہ سورۂ سبا میں ہے:۔

قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝

(۳۴/۴۷)

ترجمہ:۔ (اے پیغمبر اسلام!) کہہ دیجئے کہ اگر میں نے تم سے (اپنی اس خدمت کا) کوئی صلہ مانگا ہو تو وہ تم اپنے پاس ہی رکھو (مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں) میرا صلہ تو صرف اللہ کے ذمہ ہے (میں صرف اسی سے لونگا) اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے (چنانچہ اپنی اس بات پر بھی میں اسی کو گواہ بناتا ہوں)۔

یہی اعلان اور بھی کئی جگہ کرایا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام (۶/۹۰)۔ سورۂ یوسف (۱۲/۱۰۴)۔ سورہ فرقان (۲۵/۵۷)۔ سورۂ ص (۳۸/۸۶)۔ سورۂ طور (۵۲/۴۰)۔ سورۂ قلم (۶۸/۴۶)۔

میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے یہی اعلانات کرائے گئے ہیں۔ صرف آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں بلکہ مختلف انبیاء کرام کے انہی اعلانات کو قرآن کریم نے بار بار نقل فرمایا ہے چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کا یہی اعلان سورۂ ہود میں (۱۱/۵۱) اور سورۂ شعراء میں (۲۶/۱۲۷) موجود ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا یہی اعلان سورۂ یونس (۱۰/۷۲) اور سورۂ شعراء (۲۶/۱۰۹) میں مذکور ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام کا یہی اعلان سورۂ شعراء (۲۶/۱۴۵) میں اور حضرت لوط علیہ السلام کا یہی اعلان سورۂ شعراء (۲۶/۱۶۴) اور حضرت شعیب علیہ السلام کا یہی اعلان سورۂ شعراء (۲۶/۱۸۰) میں موجود ہے۔

ایک سنہری اصول

اللہ تعالیٰ نے جب اہل انطاکیہ کے پاس پیغام اسلام کے لئے یکے بعد دیگرے تین مستقل انبیاء کرام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام اور حضرت شمعون علیہ السلام کو بھیجا اور اہل انطاکیہ نے ان تینوں انبیاء کا انکار کر دیا تو اقصائے شہر سے ایک مرد مؤمن نے انہیں آکر نصیحت کی تو اس کے الفاظ بھی یہی تھے:۔

وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَىٰ قَالَ يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِينَ ۝ اتَّبِعُوا مَنْ لَا يَسْأَلُكُمْ أَجْرًا وَهُمْ مُهْتَدُونَ ۝ (۳۶/۲۰-۲۱)

ترجمہ:۔ اور اقصائے شہر سے ایک آدمی (مرد مؤمن)

دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے کہا۔ اے میری قوم! ان رسولوں
کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی
صلہ نہیں مانگتے اور واقعی ہدایت یافتہ ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایک سنہری اصول بیان فرمادیا گیا ہے کہ اتباع تو صرف ان کا کرنا چاہیئے جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار نہ ہوں۔ یعنی وہ پیشہ ور لیڈر یا پیشہ ور مصلح نہیں ہوں گے۔ بلکہ واقعی ہدایت یافتہ لوگ ہوں گے اگر وہ کسی صلے یا معاوضے کے طلبگار ہوتے تو اس کے یہ معنے ہوتے کہ وہ پیشہ ور لیڈر ہیں جو کسی اپنے ذاتی مفاد و منفعت کے لئے اپنی لیڈری کی دوکان چمکا رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ تو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ لوگ ہیں جو تم سے کسی صلے یا معاوضے کے طلب گار نہیں اور محض لوجہ اللہ تمہیں ہدایت دینا چاہتے ہیں۔ تم ان کا انکار کیوں کرتے ہو۔

بہرحال انبیاء کرام کبھی بھی اپنی یا اپنے خاندان کی سیادت و امارت قائم کرنے کے لئے نہیں آیا کرتے۔ صحیح بخاری کی اس روایت سے جو ثابت ہو رہا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ معاذ اللہ قرابت نبوی کی وجہ سے اپنے آپ کو خلافت کا حق دار سمجھے ہوئے تھے قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ میں بارہا (فقہ القرآن کی چاروں سابقہ جلدوں میں) متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ امام ابن شہاب زہریؒ پر شیعیت کا شبہ کیا

جاتا رہا ہے اور شیعی اسماء رجال کی کتابوں نے ان کی شیعیت کا بھانڈا اچھی طرح پھوڑ دیا ہے۔ صحیح بخاری کی اس روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) یہی بزرگ تشریف فرما ہیں۔ چونکہ شیعی نقطۂ نظر یہی ہے کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق تھا اور حضرات خلفائے ثلثہ معاذ اللہ معاذ اللہ غاصبان خلافت تھے اس لئے ہم اس روایت کو تسلیم نہیں کر سکتے لیکن اس سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ابن السوداء یعنی عبداللہ بن سبا یہودی نے جو تحریک چلائی تھی اس کے ماتحت نومسلمین عجم کے دماغوں میں یہ بات اچھی طرح پرورش پا چکی تھی کہ ابتک جو کچھ ہوتا آرہا ہے وہ غلط ہے اور جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی حضرت ہارون علیہ السلام تھے اور انہی کا خاندان یہودیوں میں شاہی خاندان تھا ایسے ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور ان کا اور ان کے خاندان ہی کا حق ہے کہ وہ حکومت کریں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر ان روایات کو تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کے لئے دوسروں کے مقابلے میں احق سمجھتے تھے کیونکہ آپ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے تو اس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ حضرت علیؓ معاذ اللہ خلافت کو محض خاندانی مسئلہ سمجھتے تھے انتخابی یا شورائی مسئلہ نہیں سمجھتے تھے۔ تو کیا یہ مان لیا جائے کہ حضرت علیؓ نے قرآن کریم کے صریحی حکم وامرھم

شوریٰ بینھم کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اگر انہوں نے اس صریح حکم کے مالہٗ و ماعلیہ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہوتا تو وہ خلافت کو خاندانی مسئلہ (جسے مولانا مودودیؒ نے ملوکیت قرار دیا ہے) کیسے قرار دے سکتے تھے تو کیا قرآن کریم کو معاذ اللہ ثم معاذ اللہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے جتنا ہمارے دَور کے ایک عالم مولانا ابو الاعلیٰ مودودیؒ سمجھ رہے ہیں۔ پھر تو (خاکم بدہن) حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عقل وفہم اور بصیرت، مولانا مودودی اور ہماری عقل وفہم اور بصیرت سے بھی گئی گذری ثابت ہوئی۔

سبائی تحریک

شہادت حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ میں جو لوگ ملوث رہے ان کا پس منظر سمجھنے کے لئے ہمیں سبائی تحریک کی تاریخ سامنے رکھنی ہوگی جس کا مرکز یمن کے یہودی تھے۔

یہودیوں کی فطرت میں خودسری، احساسِ برتری اور نسلی غرور کے جراثیم ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ قرآن مجید اور بائبل میں ان کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔ خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں مدینہ اور خیبر وغیرہ کے یہودیوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا جنگ احد اور جنگ خندق میں وہ جس طرح مشرکین عرب کو مسلمانوں کے خلاف ورغلا کر لائے وہ بھی اس کی تائید کرتا

ہے۔ یہاں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے شکست کھا کر انہوں نے دوسرا محاذ کھولا اور وہ تھا عربوں کو صوبائی بنیاد پر باہم لڑانے کا۔ تاریخ عرب سے جن حضرات کو دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ مدینہ اور خیبر کے علاوہ عرب میں یہودیوں کا دوسرا بڑا مرکز یمن تھا، جہاں کی تجارت پر یہودی چھائے ہوئے تھے۔ یمن کے عرب قحطانی کہلاتے ہیں اور حجاز (جہاں مکہ اور مدینہ واقع ہیں) کے عرب عدنانی۔ دونوں ایک دوسرے کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھنے کے عادی رہے ہیں۔ اصحابِ فیل کا واقعہ بھی اسی حریفانہ چشمک کا مظہر تھا۔ کیونکہ یمن کے حکمراں، ابرہہ نے خانۂ کعبہ کی مرکزیت اور اہمیت کو ختم کرنے اور حجازی عربوں کو زک پہنچانے کی خاطر یمن کے دارالسلطنت، صنعاء میں ایک معبد تیار کیا تھا، جس کی اپنے مذہبی جوش میں ایک حجازی عرب نے توہین کر دی۔ اس کا بدلہ لینے اور کعبہ کو ڈھانے کے عزم سے ابرہہ مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ناکام ونامراد کیا، ــــ سورۂ فیل میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

بہرحال عربوں کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر، اپنی مدینہ اور خیبر کی شکستوں کا بدلہ لینے کے لئے یمن کے یہودیوں نے دو کام شروع کئے۔ ایک تو عربوں کی اسی علاقائی عصبیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں تین جھوٹے نبیوں کو لا کھڑا کیا۔ جن میں سب سے

زیادہ شہرت مُسَیلمہ کذاب نے حاصل کی۔ اس کے متبعین کا جو فہیم طبقہ تھا وہ فی الحقیقت اُسے نبی نہیں مانتا تھا۔ مگر وہ کہتے تھے کہ اپنے علاقہ کا جھوٹا نبی ہمیں حجاز کے سچے نبی سے زیادہ محبوب ہے۔ (طبری، ذکر مسیلمہ)

یہی وہ فتنۂ ارتداد ہے جس کے خلاف کوئی عملی کارروائی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اپنے مرض الموت کی وجہ سے نہ کر سکے مگر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے سچّے جانشین حضرت صدیق اکبرؓ نے پورے عزم و جرأت سے اس فتنہ کا قلع قمع کیا۔ اور اس فتنہ کی پشت پناہ ایرانی شہنشاہیت اور رومن ایمپائر کے سامنے بھی ڈٹ گئے۔ اللہ نے ان کے عزم و حوصلے اور جرأت ایمانی کے نتیجہ میں وہ شاندار کامیابیاں عطا فرمائیں جن کی بنیاد پر حضرت عمر فاروق اعظمؓ اور ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ نے خلافت اسلامیہ کی وہ عظیم و جلیل عمارت تعمیر کی جس کی کوئی مثال تاریخ انسانیت میں نظر نہیں آتی۔

شہادت فاروق اعظمؓ

دشمنانِ اسلام کی یہ چالیں جو عہدِ نبوی کے آخر میں مدعیانِ نبوت کے پیکر میں ظاہر ہوئی تھیں اور جن کا خاتمہ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے عہد مبارک میں کیا، انہی چالوں کا ایک اور مظہر فاروق اعظمؓ کی شہادت تھی جس میں یہودیوں کا مذہبی پیشوا کعب الاحبار، ایران کی قریب المرگ شہنشاہیت کے نمائندے ہرمزان اور ابولؤلؤ فیروز اور عیسائی

رومی سلطنت کا نمائندہ جفینہ شامل تھے۔ ان کی اس چال کا مقصد واضح تھا کہ اسلام کی مرکزی شخصیت کو اچانک ختم کر کے افراتفری پیدا کر دی جائے اور جگہ جگہ بغاوتوں کی آگ بھڑک کے مشرق میں ایرانی شہنشاہیت کو نئے سرے سے ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے اور مغرب میں رومن ایمپائر کو دنیائے اسلام پر کاری ضرب لگانے اور اپنے مفتوحہ علاقے واپس لینے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ لیکن دشمنان اسلام کی بدقسمتی سے فاروق اعظم نہایت سخت جان ثابت ہوئے اور اس خطرناک حملے اور تمام خون نکل جانے کے باوجود وہ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر کئی دن زندہ رہے اور ریاست کے تمام اہم معاملات کو نمٹا کر یکم محرم الحرام کو منصب شہادت پر فائز ہوئے اور اس طرح مرتے مرتے بھی دشمنانِ اسلام کی سازشوں کو خاک میں ملا گئے۔

عہد عثمانیؓ

یہ اسلام اور مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ فاروق اعظمؓ کے بعد عثمان غنیؓ جیسے مدبر نے زمامِ حکومت سنبھالی جس نے شہادت فاروق اعظمؓ کے بعد ملّت اسلامیہ کو بھنور میں ڈوبنے سے بچایا اور قافلۂ اسلام کے شہسوار کرۂ ارض کے بحر و بر پر اسی شان و عظمت سے پھر اپنے پھریرے اڑانے لگے جس طرح وہ عہد نبوی اور عہد صدیقی و فاروقی میں پرچم اسلام کو بلند کئے ہوئے تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مؤرخ حاجی معین الدین ندوی مرحوم اپنی کتاب "خلفائے راشدین میں" "عثمانی کارنامے" کے عنوان کے تحت حضرت عثمان غنیؓ کی اس عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :-

"اس میں شک نہیں ہے کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے حسن تدبیر اور غیر معمولی سیاسی قوتِ عمل سے روم و ایران کے دفتر الٹ دیئے اور ان کی دولت و مملکت فرزندانِ توحید کا ورثہ بن گئی۔ ایران کا بیشتر حصہ مسخر ہو گیا۔ شام، مصر، الجزائر نے بھی سپر ڈال دی لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ فاتح قوم کا ایک ہی سیلاب، مفتوح اقوام کے احساس خودی کو فنا کر دے؟ اور کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے کہ ایک ہی شکست نے کسی قوم کی حریت و آزادی کے جذبہ کو معدوم کر دیا ہو؟ اور اس کے قوائے عملی بے کار ہو گئے ہوں؟ سکندر نے تمام دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اس کے جانشینوں نے کتنے دنوں تک حکومت قائم رکھی؟ چنگیز و تیمور نے بھی عالم کو تہ و بالا کر دیا۔ لیکن ان کی فتوحات کیوں نقش برآب ثابت ہوئیں؟ ——— درحقیقت یہ ایک تاریخی نکتہ ہے کہ جب اولوالعزم فاتح کا جانشین ویسا ہی اولوالعزم اور عالی حوصلہ نہیں ہوتا تو اس کی فتوحات اس تماشا گاہِ عالم میں صرف ایک وقتی نمائش ہوتی ہیں۔ اس بنا پر جانشین فاروق اعظمؓ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے

کہ اس نے ممالک مفتوحہ میں حکومت و سلطنت کی بنیاد مستحکم کی اور مفتوحہ اقوام کے جذبۂ خودسری کو رفتہ رفتہ اپنے حسنِ تدبیر اور حسنِ عمل سے اس طرح ختم کیا کہ آئندہ مسلمانوں کی باہمی کشمکش کے موقعوں میں بھی انہیں سرتابی کی ہمت نہ ہوئی"۔

تم نے فتوحات کے سلسلہ میں پڑھا ہوگا کہ حضرت عثمانؓ کو نہایت کثرت کے ساتھ بغاوتیں فرو کرنا پڑیں، مصر میں بغاوت ہوئی، اہل آرمینیہ اور آذربائیجان نے خراج دینا بند کر دیا، اہل خراسان نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تمام بغاوتیں درحقیقت اسی جذبہ کا نتیجہ تھیں جو مفتوح ہونے کے بعد بھی اقوام کے جذبۂ آزادی کو برانگیختہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے تمام بغاوتوں کو نہایت دانائی کے ساتھ فرو کیا اور آہستہ آہستہ لطف و شدت کی ملی جلی حکمت عملی سے مفتوحہ ممالک کی عام رعایا کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کر دیا (صـ۲۳۸) صرف یہ بغاوتیں ہی فرو نہیں کی گئیں بلکہ فتوحات کا دائرہ بھی مزید وسیع ہوا۔

عثمانی فتوحات کی وسعت

عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوا۔ افریقہ میں مراکش تک کا علاقہ مفتوح ہوا۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگیں ہوا۔

دوسری جانب اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا۔" (ص ۲۳۹)

ایرانی شہنشاہیت کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن رومن ایمپائر تھی جس کے تمام افریقی علاقے مسلمانوں نے اس سے آزاد کرا لئے تھے اور جس کی وجہ سے وہ ادھ مرے سانپ کی طرح نہایت پیچ و تاب کے عالم میں تھی ——— اور اپنی طاقتور بحریہ کے ذریعہ مسلمانوں کے ساحلی علاقوں پر مسلسل حملے کرتی رہتی تھی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے امیر معاویہؓ کو امیر البحر بنا کر اس کے مقابلے کیلئے روانہ کیا۔ مسلمانوں نے حضرت معاویہؓ کی غیر معمولی قیادت میں قیصر روم کے بحری بیڑے کو جو پانچ سو جنگی جہازوں پر مشتمل تھا ایسی فاش شکست دی کہ پھر رومیوں کو اس جرأت کے ساتھ حملے کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام کے سب سے پہلے امیر البحر حضرت امیر معاویہؓ نے آگے بڑھ کر جزیرۂ قبرص کو جو رومن ایمپائر کا سب سے بڑا بحری اڈہ تھا ان سے چھین کر اسلامی بحریہ کا مرکز بنا لیا۔

(طبری، عہد عثمان غنیؓ)

خلافت عثمانی میں قانون کی عظمت

عہد عثمانی میں اسلامی قانون کی عظمت و بالاتری کا یہ عالم تھا کہ حضرت عمرؓ کے قاتل

ابو لؤلؤ نے جن لوگوں (ہرمزان و جفینہ وغیرہ) کے ساتھ مل کر سازش تیار کی تھی، اس کے متعلق باوجودیکہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی شہادتیں مل گئی تھیں مگر چونکہ سرکاری طور پر ابھی اس کی تفتیش و تحقیق نہیں ہوئی تھی اور حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبیداللہ بن عمرؓ نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر حالت غضب میں ان دونوں کو ان کے گھروں پر جا کر قتل کر دیا تھا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عبیداللہ بن عمرؓ سے باز پرس کی۔ اس کی تفصیل ہرمزان کے بیٹے قماذبان کی زبانی سنیئے۔ وہ کہتا ہے:

"اہل عجم مدینہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ ابو لؤلؤ فیروز میرے والد کے پاس سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں دو دھاری خنجر تھا۔ میرے والد نے اسے پکڑا اور پوچھا: تم اس ملک میں اس کا کیا کرو گے؟ وہ بولا: میں اسے استعمال کروں گا" ایک آدمی نے اسے اس حالت میں میرے والد سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ جب حضرت عمرؓ پر حملہ ہوا تو اس شخص نے کہا: "میں نے اس قاتل کو ہرمزان کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے یہ خنجر قاتل کو دیا تھا" لہٰذا عبیداللہ بن عمرؓ نے آ کر میرے والد کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے عبیداللہ ابن عمرؓ کا

مختار بنا دیا اور فرمایا: بیٹے! یہ تمہارے باپ کا قاتل ہے اور تم ہم سے زیادہ اس کو قتل کرنے کا حق رکھتے ہو۔ جاؤ اور اسے قتل کر دو۔" اس کے بعد میں عبید اللہ ابن عمرؓ کو اپنے ساتھ قتل کرنے کے لئے لے چلا۔ اس وقت اہل مدینہ کا ہر شخص میرے ساتھ تھا۔ مگر وہ سب مجھ سے اس کے بارے میں سفارش کر رہے تھے کہ میں اسے چھوڑ دوں اور دیت (خوں بہا) قبول کر لوں۔ میں نے ان سے پوچھا: "کیا میں اسے قتل کرنے کا حق رکھتا ہوں یا نہیں؟" وہ بولے "ہاں حق رکھتے ہو" اور عبید اللہ بن عمرؓ کو برا بھلا کہا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ: "کیا تم اسے قتل کرنے سے منع کرتے ہو؟" وہ بولے "نہیں" انہوں نے پھر عبید اللہ بن عمرؓ کو برا بھلا کہا ـــــ لہٰذا میں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے واسطے اسے چھوڑ دیا اور ان لوگوں (مسلمانوں) کی خاطر میں نے اسے رہا کر دیا ـــــ اس کے بعد انہوں نے مجھے اوپر اٹھا لیا۔ بخدا میں لوگوں کے سروں اور ان کے ہاتھوں پر سوار ہو کر گھر پہنچا۔

(تاریخ طبری حصہ سوم ترجمہ اردو ص ۳۱۷ مطبوعہ نفیس اکیڈیمی کراچی)

اس کے باوجود حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے یہ حکم دیا کہ مقتول کی دیت ادا کی جائے اور پھر اپنی جیب خاص سے ان کی دیت ادا کی۔

(تاریخ طبری حصہ سوم ص ۳۱۱)

بہر حال یہ تھے ذوالنورین حضرت عثمان غنیؓ جو فاروق اعظمؓ کے ہر طرح صحیح جانشین ثابت ہوئے اور تاریخ اسلام میں جنہوں نے کتنے ہی سنہری ابواب کا اضافہ کیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف تحریک

دشمنانِ اسلام نے یہ صورت سامنے پا کر اور اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوتے دیکھ کر اپنی حکمت عملی میں پھر تبدیلی کی اور مدعیانِ نبوت کی چال کے بعد خلیفۂ اسلام کو اچانک قتل کرنے کی سازش میں بھی ناکامی کا سامنا کر کے اب تیسری پلاننگ کی۔ اور وہ یہ کہ بظاہر اسلام قبول کر کے خود حجازی مسلمانوں میں جن میں اسلام نے جنم لیا اور پھلا پھولا نسلی عصبیت کو ہوا دی جائے اور بنو ہاشم کو بھڑکایا جائے کہ تمام دنیا کے اصول اور طریقۂ کار کے مطابق بنو ہاشم شاہی خاندان ہے اور ان میں بھی خصوصاً حضرت علیؓ جو سربراہِ ریاست (حضرت محمدؐ) کے چچا زاد بھائی اور داماد ہیں۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں بچپن سے پالا ہے۔ اور اس سے بھی پہلے ان کے والد ابو طالب (جن کا اصل نام عبد مناف تھا یعنی مناف بت کے پجاری، مگر اپنے بڑے

بیٹے طالب کی وجہ سے ابو طالب کہلائے) عربوں کے مقدس مقام کعبہ کے پروہت تھے۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد آپ کی خلافت کے اصل مستحق علیؓ اور ان کی اولاد ہے۔

یہودیوں کی خفیہ تنظیم

یہودیوں کی خفیہ تنظیمیں عہد قدیم سے سرگرم عمل رہی ہیں ان کا ہمیشہ یہی کام رہا ہے کہ جن قوموں سے انہیں خطرہ ہو ان میں گھس کر ان کے عقائد و مزعومات کو تباہ کریں، انہیں آپس میں لڑائیں اور ان قوموں کو تباہ و برباد کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے زمانہ سے بلکہ اس سے بھی پہلے ان کے ہاں اس قسم کی خفیہ تنظیموں کا سراغ ملتا ہے۔ قدیم زمانہ میں اس کا نام "القوۃ الخفیہ" تھا اور آج کل اس کا نام "فری میسنری" یا "فری میسن" تحریک ہے۔ مسیح سے قبل ان کی ان خفیہ تحریکات کا حال معلوم کرنا ہو تو عہد نامۂ عتیق (بائبل) کی کتاب "سفر حزقیال" کی انیسویں[19] فصل ملاحظہ ہو حضرت مسیح کی آمد کے بعد ایک دشمن مسیح یہودی پال نے مسیحیت کو جس طرح مسخ کر کے تباہ کیا اس کی تفصیلات کے لئے ڈاکٹر احسان الحق رانا کی کتاب "یہودیت و مسیحیت" ملاحظہ ہو۔[1]

---

[1] ڈاکٹر صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی اور ایم ایس (کولمبیا) ہیں ان کی یہ کتاب مسلم اکادمی ۱۸۔ محمد نگر علامہ اقبال روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

فری میسنری تحریک اپنی نئی شکل میں عصر حاضر ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس سے قبل یہ القوۃ الخفیہ (خفیہ طاقت) کے نام سے بعثت اسلام کے وقت سے کام کر رہی ہے (اس زمانے میں اس کا مرکز یمن تھا) اور تمام خلافتوں اور اسلام سے خارج فرقوں کے نشو و نما پانے کے زمانوں میں اس کی ہم عصر رہی ہے۔

(ملاحظہ ہو کتاب الردۃ محمد کاظم حبیب دمشقی مطبوعہ مکتبۂ علمیہ لاہور)

جس طرح اس "خفیہ طاقت" نے خلافت عباسیہ کے دارالخلافہ بغداد کے سقوط پر ۶۵۶ھ میں خوشیاں منائی تھیں اسی طرح ۱۹۰۸ء میں فری میسنری نے عثمانی خلافت کے دارالخلافہ استنبول کے سقوط پر مسرت کے شادیانے بجائے تھے۔ (حوالۂ بالا)

اگر دیکھا جائے تو فری میسنری تمام خفیہ تنظیموں میں سب سے قدیم ہے۔ یہ "خفیہ قوت" کی بدلی ہوئی دوسری صورت ہے جو بیس صدیوں سے یعنی آغاز مسیحیت سے اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی ہے۔ صیہونیت فری میسنری کو فکری غذا مہیا کرتی ہے اور اس کے ارکان وہ یہود ہیں جو فری میسنری کے مدارج میں سے ۳۰ سے اوپر مدارج طے کر چکے ہیں۔

اس تنظیم نے اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لئے ہیں کہ اب اس تنظیم کے دروازے مسلمانوں، مسیحیوں، مجوس، یہود

اور مشرکین کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہیں اور اس کی شاخیں دنیا کے تمام ممالک میں قائم ہیں اور وہ سیاست کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔ جہاں بڑے اہم امور کے حتمی فیصلے کئے جاتے ہیں۔ جہاں بادشاہوں، اور ملکوں کے سربراہوں کے عزل و نصب اور زوال و بقا کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جہاں تباہ کن سازشوں اور خفیہ تحریکوں، اجتماعی اور سیاسی انقلابات اور ہنگاموں کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ تنظیم سازشیں تیار کرنے اور انقلابات کے منصوبے بنانے کا مطبخ اور اخلاق کا مقبرہ ہے۔

جو لوگ اس تحریک کے ممبر بن جاتے ہیں سب سے پہلے ان کے ذہن نشین یہ بات کرائی جاتی ہے کہ دین اللہ کے لئے ہے اور وطن سب کے لئے۔ پھر یہ کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس و مسلمان انسانیت، وطنیت اور قومیت کی رو سے بھائی بھائی ہیں۔ پھر ان پر یہ انکشاف کیا جاتا ہے کہ اگر انبیاء اور گمراہ کرنے والے رسول نہ ہوتے تو سب لوگ ایک امت ہوتے۔ ان میں دین و مذہب کی کوئی تفریق نہ ہوتی۔ نہ پیر و مرشد ہوتے نہ پادری۔ پھر وہ اپنے مقاصد کی صراحت ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ "ہماری غرض و غایت مذہب کا وجود مٹا دینا ہے (۱۹۰۰ء کی عالمی فری میسنری کانفرنس کی روداد) اور مذہب سے ان کی مراد یہودی مذہب نہیں ہے بلکہ یہودیت کے علاوہ دیگر تمام مذاہب ہیں۔ پھر یہ

سبق پڑھاتے ہیں کہ "عنقریب اللہ کے سوا مقصود و مطلوب صرف انسانیت ہی ہو جائے گا۔" (مشرقی فرانس کی عظیم کانفرنس کی روداد ۱۹۱۳ء) اور ان ارکان پر لازم ہے کہ وہ معاشرے میں فساد اور لوگوں کے اخلاق میں بگاڑ پیدا کرنے کی سعی کریں اور ان کے جماعتی نظم کا شیرازہ بکھیر دیں۔ اس ہدایت کے تحت کہ "لوگوں میں ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو اپنی پوشیدہ باتوں کے افشاء پر بھی نہ شرمائے۔

(فری میسنری کی حقیقت از ڈاکٹر زعبی)

یہ تو تھیں دین و اخلاق کے بارے میں ہدایات۔ سیاست کے میدان میں جو ہدایات ہیں ان میں سرفہرست سیاست کو دین سے علیحدہ کرنا ہے "مذاہب کی مخالفت میں کمال ہم جب ہی حاصل کر سکتے ہیں جب ہم سیاست کو مذہب سے جدا کر دیں۔" (فری میسنری کا ترجمہ مجلہ "اکاسیا" ۱۹۰۳ء) اس مقصد کے حصول کے لئے فری میسنز کے مختلف گروہ، جماعتیں اور خفیہ مجلسیں تشکیل دی گئیں جو دینی تحریکوں کے مقابلے کے لئے سازشیں اور انقلابات کے منصوبے تیار کریں۔ لہٰذا ۱۹۰۰ء میں پیرس میں منعقدہ فری میسنری کی کانفرنس میں یہ قرار پایا کہ فری میسنری کا نصب العین عالمی جمہوری لادینی حکومت کا قیام ہے (فری میسنری کے اسرار از جنرل جواد رفعت) فری میسنری کے وجود کی غرض و غایت ان دینی جمعیتوں کو تتر بتر کرنا ہے جو ماضی سے روشنی اور رہنمائی حاصل کرتی

ہیں اور اس مقصود کے حصول کے لئے فری میسنز صف اول میں قتال کرتے ہیں۔ (فری میسنری کے اسرار از جنرل جواد رفعت)۔

یہ تنظیم دنیا کی ام الانقلاب اور ام الاحزاب ہے یعنی دنیا کے انقلابات اور گروہ بندیوں کی خالق ہے اور ہلاکت خیز زیر زمین تحریکوں اور عالمی جنگوں کی محرک اور نگہبان ہے۔ اسی نے یورپ میں دو عظیم انقلاب برپا کئے ایک ۱۷۸۹ء میں اور دوسرا ۱۹۱۷ء میں اور دنیا میں دو عظیم جنگوں کی آگ بھڑکائی ایک ۱۹۱۴ء اور دوسری ۱۹۳۹ء میں اور تاریخ اسلام کے دو بڑے انقلابات بھی اسی کے مرہون منت ہیں ایک ۱۹۰۸ء کا انقلاب جس میں مسلمانوں کا آخری خلیفہ معزول کیا گیا اور دوسرا ۱۹۲۴ء کا جس میں تاریخ میں پہلی مرتبہ نظام خلافت کی بساط لپیٹی گئی۔ مسلمانوں کا اتحاد تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گیا، پارہ پارہ ہو گیا اور امت مسلمہ کئی چھوٹی چھوٹی کمزور قومیتوں اور مملکتوں میں بٹ گئی اور شریعت اسلامیہ کی جگہ خود ساختہ قوانین و دساتیر نے لے لی اور لوگ اس کفر صریح پر خاموش تماشائی بنے رہے کچھ اس فعل میں ان کے معاون و مدد گار بنے۔ نتیجۃً وہ فوج در فوج گروہ در گروہ ارتداد کے عمیق گڑھے میں گر پڑے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اب بھی مسلمان ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

مسلم اور غیر مسلم مفکرین، مؤرخین اور علم الاجناس اور ادیان کے محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہودیوں کے بڑے بڑے علماء اور راہب مختلف ممالک اور مختلف عہد میں موجود فرقوں اور معاشروں میں ایک کمزور اقلیت کی حیثیت سے گھس جاتے اور بظاہر ان کے دین و مذہب کو بھی اختیار کر لیتے تاکہ ان کے دین میں خرابی، تحریف، کجی اور تغیر و تبدل پیدا کریں جن کے ذریعے عالمی یہودیت کے مفادات و مصالح کی خدمت انجام دی جا سکے اور اپنے آپ کو ان فرقوں کی دشمنی و مخالفت سے بھی محفوظ رکھیں۔ وہ ان میں اس طرح گھل مل کر واردات کرتے اور بڑے پر امن طریقے سے وہ اندرونی مہلک عداوت کے اسباب کا بھی سد باب کر لیتے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ یہ مار آستین ہیں۔ بعثت مسیحؑ سے لے کر آج تک یہود نے جو بالفعل اس قسم کے جوہر دکھائے ہیں تو وہ مسیحیت کی آڑ میں عیسائیوں کا روپ دھار کر انجام دیئے ہیں۔ سب سے پہلے جس معاشرے میں انہوں نے اپنا یہ خبیث طریقہ نافذ کیا وہ ایرانی معاشرہ تھا کیونکہ بخت نصر کے حملے کے نتیجے میں یہ غلام بن کر ایران پہنچ چکے تھے اور عرصۂ دراز تک وہ اسی حالت میں رہے بالآخر اپنی سازشی اور تخریبی ذہنیت کے زیر اثر یہ ان میں گھل مل گئے اور ان کا مذہب مجوسیت اختیار کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے بڑے کاہن اور مذہبی پیشوا بن گئے اور مکر و فریب سے ایرانی درباروں میں اتنا اثر و رسوخ

پیدا کر لیا کہ ایرانی بادشاہوں کو تیسری صدی عیسوی کے عیسائیوں اور ان کی باغی افواج کی تباہی و ہلاکت پر اکسانے لگے۔

ان معاشروں میں سے ایک یورپ کا وہ بت پرست معاشرہ ہے جس میں بہت سے یہودی شامل ہو گئے یہاں تک کہ وہ اصل بت پرستوں سے بھی زیادہ بت پرست بن گئے۔ اور ان کی یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتوں میں اعلیٰ مراتب و مناصب تک جا پہنچے بلکہ خود بادشاہ بن بیٹھے جیسے نیرون۔ تاج و تخت پر قبضہ سے ان کے لئے یہ سہل ہو گیا کہ وہ بت پرست معاشرے کو عیسائیت سے لڑا دیں اور طرفین میں چکنا چور کرنے والی جنگوں کی ایسی آگ بھڑکا دیں جس میں عیسائیت اور بت پرست اقوام کی طاقت و قوت جل کر بھسم ہو جائے اور یہود کی جس چال نے عیسائیوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا وہ یہ تھی کہ وہ دو دشمنوں میں گھر گئے۔ مشرقی جانب سے جو لشکر ان پر حملہ آور ہوا اس کی کمان عملاً مجوسی کر رہا تھا اور مغربی جانب سے حملہ آور لشکر کی کمان عملاً بت پرست کے ہاتھ میں تھی۔

جب شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کا مذہب اختیار کر لیا تو عیسائیوں کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ مکار یہودیوں نے فوراً اپنا طریق واردات بدل ڈالا اور جلد ہی عیسائیت کے مذہب میں داخل ہو گئے اور اس کے معاشرے

میں ایسے گھل مل گئے کہ وہ مذہبی پیشوائیت کے بڑے بڑے اعلیٰ مراتب تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور اس طرح انہوں نے باہم متصادم مذاہب اور آپس میں لڑنے جھگڑنے والے فرقوں پر غلبہ پا لیا۔ اس سے پہلے انہوں نے انجیل میں تحریف و تزییف کی اور اپنی خواہشات نفس کے مطابق ایسی ایسی تعبیریں و تفسیریں کیں جن سے ان کے مذموم مصالح و مقاصد پورے ہوتے تھے۔ یعنی وہ عیسائیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا مختلف عیسائی فرقوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بے شمار عیسائی اس فرقہ وارانہ فسادات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لیکن یہودی منافقوں کا ایک فرد بھی اس فساد کی لپیٹ میں نہیں آیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا کہ عیسائیوں کو آپس میں بھڑا کر ہلاک کر دیا جیسا کہ اس سے قبل عیسائیوں کو مجوسیوں اور بت پرستوں کے ہاتھوں تباہ و برباد کیا تھا۔

اسلام کے خلاف یہودی تحریک

بعینہٖ یہی ٹیکنیک انہوں نے اسلام کے خلاف استعمال کی۔ چنانچہ علماء، مؤرخین، ادیب اور اسلامی علوم کے ماہر خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام سے خارج فرقوں کے خالق اپنے نفاق کی وجہ سے یہودی ہیں۔ ان جدید مؤرخین میں سے ایک شیخ محمد الخضری اپنی کتاب تاریخ الامم الاسلامیہ میں

رقم طراز ہیں :-

"مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ان میں ایک شیطان عبداللہ بن سبا پیدا ہوا جس نے تعظیم رسول اور اہل بیت کے سلسلے میں بہت غلو کیا اور حضرت علی ابن ابی طالب کو ان کا رئیس اعظم اور وصی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قرار دیا جیسا کہ ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اور کہا کہ یہ لازم ہے کہ حقدار کو صاحب امر بنایا جائے اور جس نے اس کا حق لیا وہ ظالم اور غاصب ہے۔ پھر اس نے حضرت علی ابن ابی طالب کی مدح سرائی میں اس قدر غلو کیا اور آپ کو اس درجہ (الوہیت) پر لے گیا جس کے حضرت علیؓ خود بھی طالب نہیں تھے۔"

(ص ۴۴/۲ طبع ہشتم)

صاحب "لوامع انوار البہیہ" علامہ ابن تیمیہ کے رسالہ "الحمویۃ الکبری" سے نقل کرتے ہیں :-

"ابن سبا رافضی فرقے کا بانی منافق زندیق تھا۔ اس نے دین اسلام میں فساد برپا کرنے کا ارادہ کیا جس طرح دین مسیح کے خلاف پولوس نے کیا تھا جو ان رسائل کا مصنف ہے جو نصاریٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ پولوس نے مسیحیت کو بگاڑنے کے لئے عیسائیوں

میں بدعتوں کو رواج دیا۔ وہ خود یہودی تھا۔ لیکن ان کی ملت میں فساد برپا کرنے کے لئے بظاہر نصرانی بن گیا۔ اسی طرح ابن سبا بھی یہودی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے قتل کی کوشش کی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کو باغیوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرنا پڑا۔ ابن سبا کی بدعتوں اور گمراہیوں کی چند جماعتوں نے پیروی کی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت علیؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ وہ بادلوں میں موجود ہیں اور کڑک ان کی آواز ہے اور بجلی کی چمک ان کا کوڑا ہے۔ وہ زمین پر نازل ہوں گے اور اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ جب بھی گرج چمک ہوتی وہ کہتے وعلیک السلام یا امیر المؤمنین (شام کے پہاڑوں میں نصیریوں کا بھی یہی عقیدہ ہے شام کا موجودہ حکمراں حافظ الاسد اسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہے) ان میں سے بعض عقیدۂ تناسخ پر یقین رکھتے ہیں اور امامت کو نور تناسخ سمجھتے ہیں (شام و لبنان کے دروزیوں کا یہی عقیدہ ہے) بعض کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت میں ہے اور اس کی روح نے حضرت علیؓ میں حلول کیا ہے۔ پھر ان کے فرزند ارجمند محمد بن الحنفیہ میں حلول کیا تھا۔ بعض یہ عقیدہ

رکھتے ہیں کہ اللہ نوری انسان ہے اور اس کا قلب
حکمت کا سرچشمہ ہے۔ نیز یہ کہ اس نے حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور
آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پہ امانت (یعنی
امامت) پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے
انکار کر دیا اور اس بار امانت سے ڈر گئے۔ لیکن
انسان نے اسے اٹھا لیا (یعنی حضرات ابوبکر و عمر
رضی اللہ عنہما) بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔
(نقل کفر کفر نہ باشد) بعض کا کہنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
کی روح انبیاء اور ائمہ میں حلول کرتی رہی حتی کہ
حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد تک پہنچی۔ وہ محرمات
کو حلال جانتے ہیں اور قیامت کے منکر ہیں بعض
نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے ائمہ انبیاء ہیں۔ جنت
دنیا کے آرام و راحت کا نام ہے اور جہنم دنیا
کے مصائب و آلام ہیں۔ انہوں نے فرائض کو ترک
کیا۔ ان کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت
محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی طرف مبعوث کیا تاکہ
لوگوں کو حضرت علیؓ کی طرف بلائیں لیکن آپ نے
لوگوں کو اپنی طرف بلا لیا۔ حضرت علیؓ، حسنؓ،
حسینؓ اور فاطمہؓ کی طرف الوہیت منسوب کی وہ
فاطمہ کے بجائے فاطم کہتے ہیں یعنی تانیث سے مبرا

کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت جبریلؑ غلطی سے
وحی حضرت علیؓ کے بجائے حضرت محمد صلے اللہ علیہ
وسلم کی طرف لے جاتے رہے (مسلسل ۲۳ برس
تک غلطی کرتے رہے) اسماعیلیہ کہتے ہیں کہ قرآن کا
ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور وہ باطن پر عمل پیرا
ہیں۔ ان کی دعوت شریعت کے ابطال پر قائم ہے
اور وہ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو جادۂ حق
سے ہٹی ہوئی ہے۔ وہ اصل میں مجوسی ہیں جو اس
وقت کی پیداوار ہیں جب اسلام میں فتنوں نے
جنم لیا اور اختلاف رونما ہوا۔ اسلام کی شان و
شوکت ماند پڑ گئی اور دین کا گریبان چاک کر دیا
گیا۔ جب وہ اس کی کوئی وضاحت نہ کر سکے تو
انہوں نے شریعت کی تاویل اس انداز سے کی جو
ان کے مجوسی اسلاف کے قواعد سے جا ملتی تھی۔
ان کا سرغنہ حمدان قرمطی تھا۔ ان کے مذہب کی
اصل صابی اور مجوسی مذہب سے ماخوذ ہے۔ ان کے
مذہب کی اکثر باتیں بعد میں صوفیوں کے کلام میں
شامل ہو گئیں۔ ان کی مثال رسائل اخوان الصفا کے
مصنفین کی ہے جن کا اصل مذہب قرامطہ کا مذہب
تھا۔ انہوں نے اپنے کلام کا اکثر حصہ امام جعفر صادقؒ
سے غلط طور پر منسوب کیا ہے تاکہ اسے اہل بیت کی

میراث ثابت کرسکیں۔ سلطنت عبیدیہ حاکمیہ جو
اہل بیت کی طرف منسوب تھی اور فاطمین کہلاتی تھی
وہ اسی قسم کی تھی۔ ان کا ظاہر مذہب رافضی تھا۔
اور باطن انکارِ محض۔ ان میں سے ایک فرقہ دروزی
ہے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ انکار کرنے
والے ہیں۔ (مختصراً) شیعہ مذہب جیسا کہ امام
ابن تیمیہؒ نے بتایا ہے۔ یہودیت، مجوسیت اور
صابیت کا ملغوبہ ہے۔ لیکن ان پر سب سے زیادہ
اثر یہودیت ہی کا ہے۔

اس میں وصایت کا عقیدہ یہودیت ہی سے لیا گیا ہے کہ
جس طرح ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے
وصی تھے ایسے ہی حضرت علیؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے
وصی ہیں۔ شیعی مذہب کا سب سے اہم مسئلہ شریعت محمدیہ
کا منسوخ ہو جانا اور شریعت آل داؤد اور آل سلیمان علیہما
السلام کا احیاء ہے جو خالص یہودی تمناؤں اور آرزوؤں
کا مظہر ہے۔

اصول کافی مؤلفہ کلینی شیعوں کے ہاں حدیث کی صحیح
ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ اس کا مرتبہ ان کے ہاں قرآن سے
بھی بڑھ کر ہے۔ کیوں کہ یہی کتاب ان کے عقائد کا سب سے
بڑا ماخذ ہے اور چوں کہ اس میں قرآن کی تحریف ثابت کرنے
اور ائمہ شیعہ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمسر ثابت کرنے

کے متعلق نہ صرف چند احادیث ہیں بلکہ باقاعدہ ابواب ہیں
اس لئے شیعہ حضرات تحریف قرآن کو مانتے اور اپنے ائمہ کو
انبیاء کی طرح معصوم سمجھتے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ہمسر
سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلمۂ طیبہ میں شیعہ حضرات نے رسالت
کی شہادت (محمد رسول اللہ) کے ساتھ اپنے پہلے امام حضرت علی
کی امامت پر ایمان رکھنے کو بھی ضروری قرار دیا ہے اور جس طرح
وہ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں
اسی طرح عَلِیٌّ وَلِیُّ اللہ کہنا بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ
ہر اذان میں بھی توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ حضرت
علی کی امامت کی شہادت بھی دیتے ہیں، اور اس طرح اپنے
امام کے ہمسر محمد ہونے کا کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ اصول کافی شیعہ حضرات کی وہ کتاب ہے
جس پر ان کے عقائد کی بنیاد ہے۔ اور جس کی روایات کو وہ قرآن
سے بڑھ کر سمجھتے ہیں، اگر ایسا نہ سمجھتے تو اس کی بنیاد پر قرآن
میں تحریف کے قائل نہ ہوتے بلکہ ان روایات ہی کو موضوع
قرار دیتے۔

بہر حال اس اصول کافی میں اسلام کی بنیاد جن پانچ ارکان
پر بتائی گئی ہے امام ابو جعفر سے مروی حدیث کے مطابق
ان پانچ چیزوں پر ہے۔ صلوٰۃ[1]، زکوٰۃ[2]، صوم[3]، حج[4] اور ولایت[5]
یعنی اس حدیث میں لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت
کو ولایت یعنی ائمہ پر ایمان سے بدل دیا گیا ہے۔

(اصول کافی مطبوعہ تہران مع ترجمہ فارسی ص ۲۹/۳)

کافی کلینی کی پہلی جلد کے چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔

باب اس بات میں کہ ائمہ مخلوق الٰہی پر اللہ کے گواہ ہیں۔

(ج ۱ ص ۲۷۰)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین پر اللہ کے خلفاء ہیں۔

(ج ۱ ص ۲۷۵)

باب اس بات میں کہ ائمہ اللہ عزوجل کا نور ہیں۔

(ج ۱ ص ۲۷۶)

باب اس بات میں کہ ائمہ زمین کے ارکان ہیں۔

(ج ۱ ص ۲۸۰)

باب اس بات میں کہ ائمہ کے پاس وہ تمام کتابیں موجود ہیں جو اللہ عزوجل کی طرف سے نازل ہوئیں چاہے وہ کسی زبان میں بھی ہوں۔ (ج ۱ ص ۳۲۹)

باب اس بات میں کہ ائمہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، تمام پچھلے انبیاء و اوصیاء کے علم کے وارث ہیں۔

(ج ۱ ص ۳۲۴)

باب صحیفہ جفر، جامعہ اور مصحف فاطمہؓ کے ذکر میں۔

(ج ۱ ص ۳۲۴)

اسی باب میں ابو بصیر سے روایت ہے کہ میں نے امام عبداللہ (جعفر صادق) سے پوچھا کہ مصحف فاطمہؓ کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایسا مصحف ہے جو تمہارے قرآن کے مقابلہ میں تین

گنا بڑا ہے اور بخدا اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے۔

اصول کافی کے مزید چند عنوان یہ ہیں۔

باب اس بارے میں کہ ائمہ ملائکہ اور انبیاء کا سارا علم جانتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۷۵)

باب اس بارے میں کہ ائمہ جانتے ہیں کہ وہ کب مریں گے۔

(ج ۱ ص ۳۸۳)

باب اس بارے میں کہ ائمہ تمام ماکان اور مایکون (ماضی و مستقبل) کا علم رکھتے ہیں۔ (ج ۱ ص ۳۸۸)

باب اس بارے میں کہ ائمہ علیہم السلام کا جب ظہور ہوگا تو وہ داؤد اور آل داؤد علیہ السلام کے حکم کے مطابق حکومت کریں گے اور کسی کو ان سے دلیل پوچھنے کا حق نہیں ہوگا۔

(جلد دوم ص ۲۴۷)

اسی خطرناک آخری باب میں امام ابو عبداللہ (جعفر صادق) سے روایت کی گئی ہے کہ جب آل محمد کا امام قائم (مہدی) ظاہر ہوگا تو وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی شریعت کے مطابق حکومت کریں گے اور ان سے اس کی دلیل یا وجہ نہیں پوچھی جاسکے گی۔ (حوالہ بالا)

اس سے واضح ہے کہ ان کا مہدی یہودی ہوگا، اور یہ بھی واضح ہے کہ ان روایات کے وضع کرنے میں کس کا ہاتھ ہے؟

اسی باب میں یہ روایت بھی ہے کہ عمار ساباطی سے مروی ہے

کہ میں نے ابو عبداللہ (امام جعفر صادق) سے پوچھا کہ جب آپ برسر اقتدار آئیں گے تو کس شریعت کے مطابق فیصلے کریں گے؟ تو انہوں نے فرمایا۔ اللہ اور داؤد کی شریعت کے مطابق۔

(کافی۔ حوالہ بالا)

یہودی عہد نبوی میں

یہودیوں نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو ختم کرنے کی کئی بار کوشش کی تھی۔ ایک دفعہ آپ ایک مکان کی دیوار کے زیر سایہ آرام فرما رہے تھے کہ انہوں نے بھاری پتھر آپ پر گرانے کا منصوبہ بنایا (لیکن آپؐ کو بروقت اللہ تعالیٰ نے باخبر کر دیا آپ وہاں سے اُٹھ گئے) ایک دوسرے موقعہ پر انہوں نے آپ کی یہودی پڑوسن کے ذریعہ آپ کو بکرے کے پکے ہوئے پائے ہدیہ کئے جن میں زہر ملایا گیا تھا۔ یہ سب باتیں کتب سیر میں موجود ہیں۔

یہودی اور خلافت صدیق اکبرؓ

آپ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو ارتداد کا فتنہ برپا کیا اور لوگوں کو زکوٰۃ نہ دینے پر اکسایا۔ یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ عام لوگوں نے سمجھ لیا کہ بس اسلام ختم ہو گیا۔ لیکن حق تعالیٰ نے حضرت صدیق اکبرؓ میں فتنوں کو فرو کرنے کی خصوصی صلاحیت اور سمجھ بوجھ رکھی تھی۔ انہوں نے ان تمام فتنوں کو مختصر عرصے میں ختم کر دیا تین جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے کر دیئے۔ حضرت صدیق اکبرؓ

مختصر ترین عرصہ میں ان تمام فتنوں سے بھی عہدہ برآ ہو گئے۔ ان تمام فتنوں میں یہودیوں، مجوسیوں اور عیسائیوں اور خصوصاً یہودی منافقوں کا ہاتھ تھا۔ لہٰذا اس کا سدباب کرنے کے لئے حضرت صدیق اکبرؓ کو کسریٰ اور قیصر روما سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ورنہ اسلام امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ وہ بلاوجہ کسی ملک پہ فوج کشی کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تمام جنگیں خواہ وہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں لڑی گئی ہوں یا خلفائے راشدین کے عہد میں جارحیت کی جنگیں نہیں تھیں۔ مسلمانوں کی تمام جنگیں مدافعت میں لڑی گئی ہیں۔ یا تو کفار نے مسلمانوں پر حملہ کیا ہے یا کوئی اور فتنہ پردازی کی ہے جس کے سدباب کے لئے مسلمانوں کو تلوار اٹھانی پڑی ہے۔

یہودی اور شہادت عمرؓ

یہود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تو بال بیکا نہ کر سکے لیکن دھوکے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے جبکہ ابھی اسلامی سلطنت کو قائم ہوئے ایک ربع صدی بھی نہیں گذری تھی۔ یہ اسلامی سلطنت کے سربراہ کا سب سے پہلا قتل تھا۔ پھر تو دینی اور سیاسی قتل ایک معمول بن گیا جو آج تک جاری ہے قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس قتل کا منصوبہ بنانے والوں کا سرغنہ مکار یہودی کعب ابن الاحبار تھا جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خلیفہ

عمرؓ کے قتل کا اشارہ تورات میں موجود ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے دعوے کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب یہ سانحہ رونما ہو چکا تو کعب آپ کے پاس بڑے حزن و ملال کے عالم میں آیا اور کہا: "کیا میں نے آپ کو بتایا نہ تھا کہ محتاط رہیں؟"

یہودی اور شہادت عثمانؓ

اس طرح اسلامی سلطنت کے سربراہ کے قتل کے جرم میں تین طاقتیں (یہودی، مسیحی اور مجوسی) شریک تھیں۔ پھر خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان کے تیر ستم کا نشانہ بنے اور اس کے بعد خلیفۂ چہارم حضرت علی ابن ابی طالب۔ اور پھر تو خلفاء کا قتل ایک معمول بن گیا جو ایک خفیہ طاقت کا کرشمہ تھا جس کا مرکز جزیرۃ العرب کے قریب یمن میں تھا۔ اور کعب کا نام مکر و فریب کی ایک ضرب المثل بن گیا اور وہ مدرسہ بھی جس میں اس کے حواری مکر و فریب کی تعلیم پاتے تھے۔ پہلے منصوبے بناتے پھر قتل کرتے پھر مقتول کے جنازہ پر روتے پیٹتے۔ [یہ باب ہم نے اخوان المسلمون کے دمشقی لیڈر جناب محمد کاظم حبیب کی معرکۃ الآراء کتاب "کتاب الروہ بین الامس والیوم" سے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ "ارتداد" کے نام سے ہو چکا ہے۔ اصل عربی کتاب مکتبۂ علمیہ لاہور سے اردو ترجمہ دار العروبہ۔ المنصورہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مترجم نے اصل کتاب کا وہ حصہ (ص ۱۳۵ تا ص ۱۳۹) حذف کر دیا

جس میں اس نے شیعہ فرقوں پر شیعہ کتب کی روشنی میں اظہار خیال کیا تھا اور شیعوں کی سب سے مستند کتاب اصول کافی کے اقتباسات اور یہودیوں کے افکار کا تقابلی مطالعہ اس نے جہاں کیا تھا (ص ۱۵۳ تا ص ۱۵۸) اسے بھی حذف کر دیا] ہم نے اصل عربی کتاب سامنے رکھی ہے۔

قاتلین عثمانؓ

سیاسی اور دینی قتل چودہ سو سال سے برابر ہوتے آرہے ہیں اور زیادہ تر مجرم اپنے کیفر کردار کو پہنچتے بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے کہ حضرت عثمان ابن عفان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دردناک قتل، قصاص سے کیوں محروم رہ گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسا خلیفۂ راشد کیوں باغیوں اور فتنہ پردازوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا اور وہ ان سے قصاص لینے میں ناکام رہا۔ وہی حضرت علی جو بارہ سال گذر جانے، مقتول کے بیٹے کے خون کو معاف کر دینے، خلیفۂ راشد کے اپنی جیب خاص سے دیت (خون بہا) ادا کر دینے کے باوجود عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ہرمزان کے قتل کا قصاص لینے میں اس قدر مستعدی دکھاتے ہیں کہ خلیفہ ہوتے ہی ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیتے ہیں وہی خلیفہ حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ کے قصاص سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جیسا کہ حضرت علیؓ نے بیان فرمایا ہے قاتلین عثمانؓ اتنے طاقتور ہوں کہ وہ ان سے قصاص لینے کی قدرت نہ رکھتے

ہوں۔ لیکن حضرت زبیر ابن العوام، حضرت طلحہ بن عبید اللہ، حضرت سعید ابن العاص اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب فوجی طاقت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لیں تو بجائے ان کی تائید و حمایت کے ان سے نبرد آزما ہونے کے لئے پہنچ جاتے ہیں اور انہیں شکست سے ہمکنار کر دیتے ہیں۔ حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما جام شہادت نوش فرماتے ہیں اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا داغِ شکست لے کر واپس آتی ہیں۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک دوسری کوشش کرتے ہیں کہ قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ سے قصاص لیں۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ پھر اس میں حارج ہوتے ہیں اور ان کی راہ میں اپنی افواج قاہرہ کی دیوار کھڑی کر دیتے ہیں۔

تاریخ نے ان حضرات میں سے کسی ایک کا بھی کوئی ایسا ایک فقرہ نقل نہیں کیا کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف اپنی خلافت کا دعویٰ کیا ہو یا اپنی طرف لوگوں کو دعوت دی ہو۔ وہ صرف قصاص عثمانؓ کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ جو لوگ ان سے مشورہ کرتے تھے کہ کس کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کریں تو سب متفقہ طور پر حضرت علیؓ ہی کا نام لیتے تھے بشرطیکہ وہ قصاص عثمانؓ لینے میں سرگرمی دکھائیں۔

خلیفہ ہونے کی حیثیت سے شہید مظلوم حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کا قصاص لینا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی

ذمہ داری تھی۔ جو حضرات صحابہ قصاص عثمانؓ کے لئے عملی جدوجہد کر رہے تھے وہ دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک فریضہ کی ادائیگی میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ان سے مقاتلہ و مجادلہ کا کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے اپنی مخالفت بلکہ بغاوت پر محمول کیا اور ان کی کوششوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کے بجائے ان سے جنگ کرنے کی صورت اختیار فرمائی۔ نہ صرف یہ ہی کیا بلکہ قاتلان عثمانؓ ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے اور ان کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا گیا۔ مالک بن الاشتر۔ اور محمد بن ابی بکر کو اہم صوبوں کا گورنر بنایا گیا۔ یہ لوگ متفقہ طور پر قاتلین عثمانؓ میں شامل تھے۔ اور وہ ہر ملکی، قومی، شرعی قانون کے مطابق گردن زدنی تھے۔ لیکن انہیں قتل کرنے کے بجائے انہیں بڑے بڑے مناصب سے نوازنا ایک ایسا معمہ ہے جو اب تک حل نہیں ہو سکا اور شاید کبھی بھی حل نہ ہو سکے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ جو حضرت علیؓ کے سب سے بڑے وکیل صفائی ہونے کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں وہ بھی اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ:

"حضرت علیؓ نے اس پورے فتنے کے زمانے میں جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھیک ایک خلیفۂ راشد کے شایانِ شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے جس کی مدافعت میں مشکل ہی سے کوئی بات کہی جا سکتی

ہے۔ وہ یہ کہ جنگ جمل کے بعد انہوں نے قاتلین عثمانؓ کے بارے میں اپنا رویہ بدل دیا۔ جنگ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے، بادلِ ناخواستہ ان کو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے گفتگو کرنے کے لئے جب انہوں نے حضرت قعقاع بن عمرو کو بھیجا تھا تو ان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت قعقاع نے کہا تھا کہ "حضرت علیؓ نے قاتلین عثمانؓ پر ہاتھ ڈالنے کو اس وقت تک مؤخر کر رکھا ہے جب تک وہ انہیں پکڑنے پر قادر نہ ہو جائیں، آپ لوگ بیعت کر لیں تو پھر خون عثمانؓ کا بدلہ لینا آسان ہو جائے گا۔ (البدایہ ص ۲۳۷ ج ۷) پھر جنگ سے عین پہلے جو گفتگو ان کے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان ہوئی اس میں حضرت طلحہؓ نے ان پر الزام لگایا کہ آپ خون عثمانؓ کے ذمہ دار ہیں اور انہوں نے جواب میں فرمایا لعن اللہ قتلۃ عثمانؓ (عثمانؓ کے قاتلوں پر اللہ کی لعنت) لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے دربار میں تقرب حاصل کرتے گئے۔ جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے مالک بن حارث

الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دے دیئے۔ درآنحالیکہ قتل عثمانؓ میں ان دونوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ حضرت علیؓ کے پورے زمانۂ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"
(خلافت و ملوکیت ص ۱۴۶ مطبوعہ اسلامک پبلیکیشنز لاہور اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ :-

"اسی طرح حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خود ان کی اپنی شہادت تک ایک ایک مرحلے پر ان کا جو رویہ رہا ہے اس کے ہر جز کا ایک صحیح محل میں نے تلاش کیا اور ان کے اپنے بیانات میں یا اس وقت کے حالات و واقعات میں وہ مجھے مل گیا مگر صرف ایک مالک الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کا عہدہ دینے کا فعل ایسا تھا جس کو کسی تاویل سے بھی حق بجانب قرار دینے کی گنجائش مجھے نہ مل سکی۔ اسی بنا پر میں نے اس کی مدافعت سے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔

(ایضاً خلافت ملوکیت ص ۳۴۸)

سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کے صریحی حکم :-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى۔ (۲/۱۷۸)

ترجمہ: مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے۔

کی کیا تاویل کی ہوگی۔ پھر بیعت الرضوان میں جب چودہ سو (۱۴۰۰) یا چوبیس سو (۲۴۰۰) صحابہ کرام نے خون عثمانؓ کے قصاص پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی تھی اور جس میں خود حضرت علیؓ بھی شریک تھے۔ اس سے جان چھڑانے کے لئے حضرت علیؓ نے کیا جواب سوچا ہوگا۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اسلام کے خلاف خود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے خفیہ یہودی طاقتیں کام کر رہی تھیں۔ ان کا لقب "القوۃ الخفیۃ" رکھا جائے یا "فری میسنری" تحریک۔ لیکن ظاہر ہے کہ پانی وہیں مرتا ہے جہاں نشیب ہوتا ہے۔ فتنوں کی تخم ریزی کرنے والا کتنا ہی عیار اور مکار کیوں نہ ہو جب تک فتنوں کے لئے زمین ہموار نہ کر دی جائے اور حالات ساز گار نہ ہوں دشمنوں کی تخم ریزی برگ و بار نہیں لا سکتی اور ان کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ بیرونی عوامل اسی وقت نتیجہ خیز ہو سکتے ہیں جب کہ اندرونی عوامل بھی ان کا ساتھ دیں۔ لہٰذا سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اندرونی عوامل کیا تھے جو بیرونی عوامل کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم

ابھی بقید حیات ہی تھے لیکن مرض الموت میں مبتلا تھے کہ بنو ہاشم کو خلافت کی فکر دامن گیر ہو گئی تھی چنانچہ صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ:

حدثنی اسحٰق قال اخبرنا بشر بن شعیب ابن ابی حمزۃ قال حدثنی ابی عن الزھری قال اخبرنی عبد اللہ بن کعب بن مالك الانصاری وکان کعب بن مالك احد الثلثۃ الذین تیب علیھم ان عبد اللہ بن عباس اخبرہ ان علی ابن ابی طالب خرج من عند رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فی وجعہ الذی توفی فیہ فقال الناس یا ابا حسن کیف اصبح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فقال اصبح بحمد اللہ بارئا فاخذہ بیدہ عباس بن عبد المطلب فقال لہ انت واللہ بعد ثلاث عبد العصا وانی واللہ لا ری رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سوف یتوفی من وجعہ ھذا انی لاعرف وجوہ بنی عبد المطلب عند الموت اذھب بنا الی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلنسئالہ فیمن ھذا الامر ان کان فینا علمنا ذلك و ان کان فی غیرنا علمناہ فاوصی بنا فقال علیؓ انا واللہ لئن سألناھا رسول اللہ صلے اللہ

علیہ وسلم فمنعناھا لا یعطینا الناس بعد وانی واللہ لا اسئلھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(صحیح بخاری۔ باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ کتاب المغازی ص ۶۳۹ ج ۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ:۔ (امام بخاری کہتے ہیں کہ) مجھ سے اسحٰق نے حدیث بیان کی کہ مجھے بشر بن شعیب ابن ابی حمزہ نے خبر دی کہ مجھ سے میرے والد نے زہری سے حدیث بیان کہ مجھے عبداللہ بن مالک انصاری نے خبر دی اور کعب بن مالک ان تین آدمیوں میں سے تھے جن کی (غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کرنے پر) توبہ قبول ہوئی تھی کہ انہیں عبداللہ بن عباسؓ نے خبر دی کہ علی بن ابی طالب مرض الوفات میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اے ابوحسن (حضرت علیؓ کی کنیت ہے) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کس حال میں صبح فرمائی؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی (اب طبیعت ٹھیک ہے) تو عباس ابن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم تین دن بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ اور اللہ کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی اس بیماری سے جلدی ہی وفات پا جائیں گے

میں عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے موت سے پہلے کیسے ہوتے ہیں خوب پہچانتا ہوں۔ ہمارے ساتھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو تو ہم آپ سے پوچھ لیں کہ یہ امر (حکومت آپ کے بعد) کن لوگوں میں ہو گا۔ اگر یہ ہم میں ہی ہوا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے علاوہ غیروں میں ہوا تب بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا تو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم انہیں ہمارے بارے میں وصیت فرما دیں گے تو حضرت علیؓ نے کہا۔ اللہ کی قسم اگر ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور آپ نے اس سے انکار کر دیا تو لوگ ہمیں (خلافت) کبھی بھی نہیں دیں گے اور اللہ کی قسم میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خلافت کا سوال نہیں کروں گا۔

صحیح بخاری کی اس حدیث سے ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بقید حیات ہی تھے کہ بنو ہاشم کو یہ فکر دامنگیر ہو گئی تھی کہ ریاست و مملکت کا سربراہ کون ہو گا۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے یہ خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا فیصلہ کرا لیا جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ حکومت کس کو ملے گی۔ اگر ہمیں ملتی ہے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمیں نہ ملنی ہے بلکہ ہمارے علاوہ کسی اور کو ملنی ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ

وسلم سے درخواست کی جائے کہ وہ ہمارے بارے میں
اسے وصیت کر جائیں کہ وہ ہمارا خیال رکھے۔ اسلامی حکومت
قرآن کریم کی رو سے ایک شورائی نظام ہے۔ جو مسئلہ مسلمانوں
کو اپنے باہمی مشورہ سے اپنے وقت پر طے کرنا تھا اس کے
متعلق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے پیش از وقت دریافت
کرنے کے کوئی معنے نہیں تھے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم
اس کے متعلق وقت سے پہلے کیا بتا سکتے تھے کہ مسلمان اپنے
باہمی مشورہ سے اپنا سربراہ کسے بنائیں گے۔ اس سے صاف
ظاہر ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ مسئلہ
صاف نہیں تھا اور وہ اسے شورائی مسئلہ نہیں سمجھ رہے
تھے۔ اس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہ نہیں
فرماتے کہ یہ مسئلہ تو شورائی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اس
کے متعلق کیا بتا سکتے ہیں۔ وقت آنے پر مسلمان معلوم نہیں
کیا طے کریں اور کسے اپنا سربراہ بنائیں بلکہ وہ ان کے جواب
میں فرماتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ میں اس کے متعلق حضور
اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے اس لئے کوئی سوال نہیں
کروں گا کہ اگر خدانخواستہ آپؐ نے بنو ہاشم کی سیادت
وامارت سے انکار فرما دیا تو مسلمان آئندہ کبھی بھی حکومت
وامارت ہمیں نہیں دیں گے۔ یہ ہمارے لئے ہمیشہ کے
واسطے محرومی کا باعث بن جائے گا۔ اس جواب سے معلوم ہوتا
ہے کہ خلافت وامارت کا مسئلہ حضرت علیؓ کے ذہن میں بھی

صاف نہیں تھا۔ وہ بھی اسے خالص شورائی مسئلہ نہیں سمجھ
رہے تھے۔

علامہ عینی نے عمدۃ القاری شرح بخاری میں اسی حدیث کے
ضمن میں شعبیؒ کی ایک مرسل روایت کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں
مذکور ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورے پر حضرت
علیؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:-

وقال علی رضی اللہ عنہ وھل یطمع فی ھذا
الامر غیرنا فقال اظن واللہ سیکون۔

(ایضاً حوالۂ مذکور)

ترجمہ:- اور حضرت علیؓ نے کہا تھا کہ کیا ہمارے
علاوہ کوئی اور بھی اس حکومت کی طمع کر سکتا ہے؟ تو
حضرت عباسؓ نے کہا۔ اللہ کی قسم میرا خیال ہے کہ ایسا
ہو گا۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک یہ سوال ہی خارج
از بحث تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خلافت وحکومت تو ہمارا حق
ہے ہی۔ اور کون اس کی طمع کر سکتا ہے؟ یعنی کوئی اور شخص
اس کی طمع ہی نہیں کر سکتا۔ حضرت عباسؓ اس کے جواب میں
فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ اللہ کی قسم ایسا ضرور ہو گا اور
لوگ اس کی طمع کریں گے۔

تاریخ طبری میں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے
پاس گفتگوئے صلح کے لئے ایک وفد بھیجا جس میں حضرت

شرجیل السمطؓ بھی تھے انہوں نے دورانِ گفتگو کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ مظلوم شہید ہوئے۔ اس کے جواب میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں :۔

فقال لهما انی لا اقول انه قتل مظلوما ولا انه قتل ظالما۔

ترجمہ :۔ تو حضرت علیؓ نے ان دونوں ارکان سے کہا کہ میں نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ مظلوم شہید ہوئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ وہ قتل ہونے کے وقت ظالم تھے۔

اسی روایت میں یہ الفاظ بھی حضرت علیؓ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں کہ :۔

"پھر لوگوں نے ابو بکرؓ کو خلیفہ بنا لیا اور انہوں نے عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ ان دونوں نے اگرچہ بہت اچھے کردار کا مظاہرہ کیا اور امت میں انصاف کیا مگر ہمیں ان پر غصہ یہ تھا کہ وہ لوگ ہمارے اوپر حاکم بن گئے۔ حالانکہ ہم آلِ رسول ہیں۔ مگر ہم نے انہیں معاف کر دیا۔ ان کے بعد عثمانؓ خلیفہ بنائے گئے۔ انہوں نے ایسی باتیں کیں جنہیں لوگوں نے معیوب جانا۔

(طبری حوادث ۳۵ھ)

ان روایات سے واضح ہے کہ شروع ہی سے بنو ہاشم کا یہ خیال تھا کہ خلافت و امارت ہمارا حق ہے۔ ہمیں ہی ملنا چاہیئے صحیح بخاری کی ایک اور روایت اس سے پہلے پیش کی جا چکی ہے

جس میں حضرت علیؓ کی طرف سے واضح طور پر یہ فرمایا گیا تھا کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی وجہ سے امر خلافت میں اپنا حصہ یا حق سمجھتے تھے۔ ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سبائی تحریک جس بنیاد پر اٹھائی گئی اس کے لئے زمین پہلے سے سازگار تھی اور کچھ لوگوں کے ذہن اس نظریہ کے لئے پہلے ہی ہموار ہو چکے تھے۔

بخاری کی اس دوسری روایت میں بھی (سند میں نے دیدی ہے) امام زہریؒ موجود ہیں جن کے متعلق میں بار بار متنبہ کرتا آرہا ہوں کہ ان حضرت پر تشیع کا داغ ہے۔ چونکہ یہ حدیث ان کے مذہبی عقیدہ کے مطابق ہے۔ لہٰذا محدثین کے اصول پر یہ حدیث قابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے اسے اپنی صحیح میں درج کر لیا ہے۔

لیکن اگر یہ روایات صحیح ہیں اور ان میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں ان کو تسلیم کر لیا جائے تو یہودیوں اور شیعوں کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا صحابہ کی اکثریت اور خلفائے ثلاثہ کے خلاف جو رویہ بتایا جاتا ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی حضرت علیؓ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے۔ لہٰذا خلفائے ثلاثہ غاصب اور ظالم تھے جنہوں نے حضرت علیؓ کا حق غصب کر لیا تھا۔ لہٰذا ان کو خلافت سے ہٹانا اور اپنا حق حاصل کرنا ان کے لئے قطعاً جائز تھا۔ وہ

راضی خوشی اپنے منصب سے نہیں ہٹے تو ان کو قتل کرا کے
اپنا حق حاصل کرنا بھی جائز تھا۔ اس لئے سبائیوں نے حضرت
عمرؓ کو شہید کیا تو درست کیا۔ عبیداللہ بن عمرؓ نے ہرمزان کو
قتل کیا تو غلط کیا۔ کیونکہ ہرمزان نے صحیح سمت قدم اٹھایا تھا۔
لہٰذا بارہ سال گذر جانے کے بعد بھی عبیداللہ بن عمرؓ سے
ہرمزان کے قصاص لینے کا جواز تھا۔ سبائیوں نے اس کے بعد
ایک تیسرے غاصب اور ظالم (حضرت عثمان ذی النورین رضی
اللہ عنہ) کو شہید کر کے ایک حقدار کے لئے خلافت کا راستہ
صاف کر دیا تو وہ بھی ایک صحیح اور جائز اقدام تھا۔ لہٰذا حضرت
عثمانؓ کے قصاص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حضرت علیؓ
نے حضرت عثمانؓ کا قصاص نہیں لیا تو انہوں نے کوئی غلط
کام نہیں کیا۔ سبائیوں نے ایک صحیح قدم اٹھایا تھا۔ انہوں
نے ایک غاصب اور ظالم کو قتل کر کے حق دار کو اس کا حق دلایا
لہٰذا وہ ہر انعام و اکرام کے مستحق تھے۔ ان لوگوں کو خلیفہ
ہونے کے بعد بڑے بڑے عہدے دیئے۔ یہ بھی ٹھیک تھا۔
وہ اسی کے مستحق تھے۔ انہوں نے مالک ابن الاشتر اور
محمد بن ابی بکر کو گورنر بنایا تو کیا غلط کیا۔ کیونکہ ان قاتلین
عثمانؓ نے صحیح اقدام کیا تھا اس لئے وہ بجا طور پر اس کے
مستحق تھے کہ انہیں بڑے بڑے منصب دے کر نوازا جائے۔
شیعی نقطۂ نظر یہی ہے۔ انہیں اسے تسلیم کرنے میں کوئی
مشکل پیش نہیں آتی۔ چاہے اس سے رسول اللہ کی تربیت پر

حرف آتا ہو اور اسلام کی ناکامی ظاہر ہوتی ہو۔

لیکن مشکل عام اہل سنت والجماعت کی ہے جو حضرات شیخین
اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی برحق خلیفہ سمجھتے ہیں
اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی امام برحق تسلیم کرتے ہیں
اور ساتھ ہی بخاری و مسلم اور مؤرخین کی متضاد و متناقض
روایات پر بھی مکمل ایمان رکھتے ہیں اسی لئے انہیں دور از کار
تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے جسے عقل سلیم تسلیم نہیں
کرتی۔ ان کے لئے میرے نزدیک صحیح راہِ عمل یہی ہے کہ وہ
اس قسم کی متضاد روایات کا سرے سے انکار کریں اور کسی
ایک روایت کو بھی تسلیم نہ کریں۔ ان روایات میں جو کچھ حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ ان کے متعلق یہ نقطۂ نظر
اختیار کریں کہ وہ ان پر بہتان ہیں۔ جھوٹی تہمتیں ہیں اور قرآن
کریم نے حضرات صحابہؓ کے باہمی تعلقات کے متعلق جو صراحتیں
فرمائی ہیں، ان کے سراسر خلاف ہیں۔ اب ہم قرآن کریم کے
بیانات کو صحیح مانیں یا ان روایات کی ہرزہ سرائیوں کو؟ ہم
قرآن کا تو انکار نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن کا انکار کفر ہے۔
البتہ ان روایات کا انکار کر سکتے ہیں۔ رہا قصاصِ عثمانؓ لینے
میں ان کا کمزور رویہ سو اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر ہم
نے اس مضمون کی ابتدا میں بعنوان "حضرت علیؓ کی پوزیشن"
کیا تھا۔ یعنی چونکہ ان میں سیاسی صلاحیتوں کی کمی تھی اس
لئے وہ صحیح فیصلے نہ کر پائے بلکہ پے در پے اس قسم کی سیاسی

غلطیاں ان سے سرزد ہوئیں جن کے نتیجے میں وہ سبائی دشمنانِ اسلام کے جال میں پھنستے چلے گئے۔ اور باوجود قصاص عثمانؓ کی آرزو کے اپنی پوری مدت خلافت میں کسی موقعہ پر بھی اس فرض کو ادا نہ کر سکے۔ اور ظاہر ہے اس عظیم فرض کی ادائیگی میں جو کمزوری ان سے ظاہر ہوئی الٰہی فرمان کے مطابق اس کے نتائج اُنہیں بھگتنے پڑے۔ اور جس جس نے بھی قصاص عثمانؓ میں کی گئی اس کمزوری پر اظہار ندامت اور اعتراف خطا کرنے کے بجائے ڈھٹائی دکھائی اور قرآنی قوانین کی بالاتری سے انکار کیا اس نے اس کی سزا پائی۔ اگر آج بھی ملت اسلامیہ اس واقعہ سے عبرت حاصل نہیں کرے گی اور قانون کی بالادستی پر اپنے ایمان میں پختگی پیدا نہیں کرے گی تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو تاریخ کی اور بہت سی اقوام، جماعتوں اور اشخاص کا ہوا۔ کیونکہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ (۳۵/۴۳)

تحریک ابن سبا اور القوۃ الخفیہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے تاریخی حقائق سے ثابت کیا ہے کہ یہودیوں کی طرف سے خفیہ تنظیم جس کا نام عہد صحابہ میں القوۃ الخفیہ تھا اور آج کل اس کا نام فری میسن (FREE MESSON) ہے۔ یہی تنظیم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سارے فتنہ کی ذمہ دار تھی۔ جس کا سرغنہ اس زمانہ میں عبداللہ بن سبا تھا جسے ابن السوداء

بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی ماں سیاہ رنگ کی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ سیاہ تحریک چلا رہا تھا۔

آجکل سبائیوں کی طرف سے کوشش کی جاتی ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی کی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا جائے۔ اس کا شوشہ سب سے پہلے مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے چھوڑا تھا جو خود بھی فری میسن کا ممبر تھا۔ یہود سے اس کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ یہودیوں کے پیشوا حاخام ناحوم آفندی کو عربی ادب کے ماہرین کا نگراں مقرر کر دیا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہی کی زیر نگرانی قاہرہ یونیورسٹی کی آرٹس فیکلٹی (کلیۃ الآداب) میں جو پہلا تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا اس کا عنوان تھا "عرب میں یہودی قبائل" پیش کرنے والا طالب علم اسرائیل ولفنسون تھا جو آجکل تل ابیب کی ہاوا سابو یونیورسٹی میں ڈین ہے۔[1]

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے پہلے ایک کتاب "الشعر الجاہلی" کے نام سے لکھی تھی جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں جن تاریخی قصص کا تذکرہ ہے وہ سب فرضی کہانیاں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، اس پر عالم عرب میں ایک زلزلہ آ گیا۔

---

[1] یہ تمام تفاصیل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے فکری متبع شیعہ ادیب مرتضیٰ عسکری نے اپنی کتاب "مع رجال الفکر فی القاہرہ" مطبوعہ قاہرہ ۱۹۶۳ء صفحہ ۱۶۶ میں دی ہیں۔ مرتضیٰ عسکری نے طٰہٰ حسین کی تائید میں ابن سبا کے انکار پر تین جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی ہے جو شیعوں میں بہت مقبول ہے۔

اور طٰہٰ حسین پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ لیکن چونکہ انہیں فری میسن اور اس کے ممبر افسران کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے کوئی بھی ان کا بال بیکا نہ کر سکا۔

اس کے بعد طٰہٰ حسین نے ایک اور کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" کے نام سے لکھی جس میں شہادت عثمانؓ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ابن سبا کے متعلق یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک فرضی کیریکٹر ہے۔ واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ سبائی اسے لے اُڑے اور اس پر مستقل تصانیف کر ڈالیں۔ غالباً طٰہٰ حسین نے یہودیوں اور سبائیوں کو خوش کرنے کے لئے ہی یہ شوشہ چھوڑا تھا۔ ورنہ تاریخ کا کوئی طالب علم بھی اس کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سنی کتابوں کو چھوڑیئے خود شیعہ کتابوں میں جگہ جگہ اس کا تذکرہ موجود ہے۔ تاریخ طبری میں جو خود زیدی شیعہ ہونے کے علاوہ سبائی راویوں کی روایات کا سب سے زیادہ مستند مجموعہ ہے اس کا تذکرہ کئی مرتبہ آیا ہے۔ مثلاً ۳۵ھ کے احوال میں اس کا اور اس کے مشن کا تذکرہ موجود ہے۔ طبری کی اس مفصل روایت سے شورش کی اصل بنیاد اور اس کے حقیقی سبب پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ طبری کا بیان ہے کہ:۔

"عبداللہ بن سبا ایک یہودی تھا جس کا وطن صنعاء (یمن کا ایک شہر) تھا۔ اس کی ماں کالی کلوٹی تھی۔ وہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں (منافقانہ) مسلمان ہو گیا

اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف اسلامی شہروں میں اس نے دورے شروع کر دیئے۔ پہلے حجاز آیا، پھر بصرہ، کوفہ اور شام گیا۔ شام میں اسے کوئی معاون نہ مل سکا اور وہاں کے لوگوں نے اسے ملک بدر کر دیا تو وہ بھاگ کر مصر پہنچا۔۔۔۔"

اس نے ناواقف مسلمانوں میں جو عقائد باطلہ پھیلائے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے طبری لکھتا ہے:۔

"ایک ہزار انبیاء گذرے ہیں۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے۔ آنحضور خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت علیؓ خاتم الاولیاء ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو گا جس نے وصی رسول کے حق پر دست درازی کی۔۔۔۔"

پھر اس نے کہا کہ:۔

"عثمانؓ نے خلافت پر بغیر استحقاق کے قبضہ کر لیا ہے اور یہ یعنی حضرت علیؓ وصیٔ رسول ہیں۔ تو اس بارے میں تم لوگ اُٹھ کھڑے ہو اور انہیں ہٹا دو۔ جسکی ابتداء اپنے امراء (عُمّال عثمانی) پر طعن و تشنیع سے کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔۔۔"

پھر اس نے اپنے داعیوں کو مختلف اسلامی ممالک میں بھیجا جو خفیہ طور پر تو اس کی (بغاوت اور مندرجہ

بالا عقیدۂ فاسدہ کی) تبلیغ کرتے تھے اور ظاہر
میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے تھے (یعنی
ظاہر میں مصلح اور مبلغ بنے ہوئے تھے)۔
اپنے مفسدانہ عزائم کی تکمیل کے لئے جو طریقہ انہوں نے
استعمال کیا وہ یہ تھا :۔

"ہر شہر میں یہ مفسد دوسرے شہر کے مفسدوں کو خطوط
لکھتے تھے جن میں اپنے امراء و حکام کی مذمت کرتے
تھے۔" (تاریخ طبری جلد پنجم مطبوعہ مصر صـ ۹۸
احوال ۳۵ھ)

نیز اسی ۳۵ھ کے احوال میں جہاں مفسد اور باغیوں کی
آمد مدینہ کا تذکرہ ہے وہاں پھر لکھتے ہیں کہ :۔

"اور ان کے ساتھ ابن السوداء بھی تھا۔"

علامہ ابن کثیرؒ کی تاریخ البدایہ والنہایہ میں جنگ جمل کے
موقعہ پر بھی اس کی موجودگی کا تذکرہ موجود ہے۔
تیسری صدی ہجری کے مشہور شیعہ عالم نوبختی اپنی کتاب
"فرق الشیعہ" مطبوعہ نجف میں رقم طراز ہے :۔

وحکی جماعۃ من اھل العلم من اصحاب علی
علیہ السلام ان عبد اللہ بن سبا کان یھودیا
فاسلم ووالی علیا علیہ السلام وکان یقول
وھو علی یھودیتہ فی یوشع بن نون وصی لعد
موسیٰ علی نبینا وآلہ وعلیھما السلام بالغلو

فقال فی اسلامہ بعد وفاۃ النبی صلے اللہ علیہ
وسلم فی علی علیہ السلام بمثل ذالک وھو
اول من شھر القول بفرض امامۃ علی علیہ
السلام واظھر البراءۃ من اعدائہ و
کاشف مخالفیہ فمن ھنا قال من خالف
الشیعۃ ان اصل الرفض ماخوذ من الیھود۔
(فرق الشیعہ صـ ۴۴)

ترجمہ :۔ حضرت علیؓ کے رفقاء میں سے اہل علم
کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ ابن سبا پہلے یہودی
تھا پھر اسلام قبول کر کے حضرت علیؓ کے جاں نثاروں
میں شامل ہوگیا، یہ اپنے دور یہودیت میں حضرت
موسیٰ کے بعد یوشع بن نون کی امامت کا شد و مد سے
قائل تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے یہی نقطۂ نظر
حضرت علیؓ کے لئے اختیار کیا۔ اسی نے سب سے پہلے
حضرت علیؓ کی امامت کی فرضیت کو شہرت دی اور
حضرت علیؓ کے مخالفین پر تبرا کہنے کی اور ان کے بول
کھولنے کی جرأت کی۔ یہی وجہ ہے کہ مخالفین شیعہ ان
افکار کی بنا پر شیعیت کو یہودیت سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔
اسی کتاب میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ :۔

کان ممن اظھر الطعن علی ابی بکر وعمر و
عثمان والصحابۃ وتبرأ منھم وقال ان

علیا علیہ السلام امرہ بذالک۔ (ص۴۴)

ترجمہ :۔ اسی نے ابو بکر و عمر و عثمان و صحابہ پر طعن و تشنیع کرنے کی ابتدا کی، وہ کہا کرتا تھا کہ اس بات کا مجھے علی علیہ السلام نے حکم دیا ہے۔

اس قدیم ترین شیعی مؤرخ کے بعد شیعہ اسماء الرجال کی سب سے قدیم اور سب سے مستند کتاب "رجال کشی" میں بھی جگہ جگہ ابن سبا اور اس کی جماعت کا تذکرہ موجود ہے اور اپنے ائمہ سے متعدد روایات بیان کر کے نو بختی کی تائید کی گئی ہے۔

(ملاحظہ ہو "رجال کشی" مطبوعہ کربلا ص۹۸ تا ص۱۰۱)

اس کے بعد آج تک کی تمام سنی تاریخوں اور شیعہ اسماء رجال کی کتابوں میں ابن سبا اور اس کی پارٹی کا تذکرہ موجود ہے۔ اس سبائی پارٹی کے بعض افراد کو حضرت علیؓ کے حکم سے آگ میں جلائے جانے کی تائید سنیوں کی سب سے مستند کتاب صحیح بخاری سے بھی ہوتی ہے اور شیعوں کی تمام کتب رجال میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

ان تصریحات کے بعد تمام مؤرخین کے بیان کردہ اس متواتر واقعے کا انکار عجیب دیدہ دلیری ہے۔ اور یہ جرأت وہی شخص اور طبقہ کر سکتا ہے جو قرآنی بیانات سے انکار کرنے میں بھی دریغ نہ کرے جیسا کہ طٰہٰ حسین نے قرآنی قصص کا انکار کر کے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا ہے اور شیعوں نے قرآنی

ارشاد وَبَنَاتِكَ (۳۳/۵۹) کے باوجود سوائے حضرت فاطمہؓ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تین صاحبزادیوں کا انکار کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ وہ روزِ روشن میں چمکتے ہوئے سورج کے انکار کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور ہیں۔

ہر صاحب علم کے نزدیک طٰہٰ حسین اور اس کے متبع شیعوں کی طرف سے ابن سبا کے انکار کی وہی حیثیت ہے جو اردو کے مشہور ادیب و مؤرخ، سوانح نگار و مترجم قرآن مرزا حیرت دہلوی کے واقعۂ کربلا کے انکار کی ہے۔ مرزا صاحب نے کتاب شہادت کے نام سے چھ جلدیں جو تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں لکھی تھیں۔ اپنے رسالے کرزن گزٹ میں وہ اس موضوع پر سالہا سال لکھتے رہے کہ تاریخی طور پر واقعۂ کربلا کا وجود ثابت نہیں کیونکہ ابتدائی دور کی حدیث و تاریخ کی کتابوں میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نہ مؤطا امام مالکؒ میں اس کا ذکر ہے نہ مؤطا امام محمدؒ میں، نہ بخاری میں، نہ مسلم میں نہ طبقات ابن سعد (اسماء الرجال اور تاریخ کی سب سے پہلی کتاب) میں نہ کسی اور قدیم کتاب میں ——— پہلی مرتبہ ابو مخنف شیعی نے اس موضوع پر مقتل حسینؓ کے نام سے کتاب لکھی جو سراسر افسانہ ہے اور اس شخص کے جھوٹے، کذاب اور افسانہ گو ہونے پر تمام محدثین کا اتفاق ہے۔ اسی ابو مخنف کے حوالہ سے طبری وغیرہ نے اپنی کتابوں اور تاریخوں میں یہ واقعہ نقل

کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا پہلا راوی ہی ناقابل اعتبار ہے تو اس قصے کی کیا تاریخی حیثیت ہے۔

لہ یہ کتاب شہادت مدت سے نایاب تھی اب حال ہی میں اس کی ایک جلد مکتبہ جاء الحق کراچی ۱۶/۴ ا۔ جے ناظم آباد کراچی نے شائع کی ہے۔ اس کی پانچ جلدوں کا فوٹو اسٹیٹ مشہور علم دوست خالد ایم اسحٰق ایڈووکیٹ کی لائبریری میں موجود ہے۔ چھٹی جلد کہیں دستیاب نہیں کیونکہ شیعہ حضرات نے مرزا حیرت کا پریس اور مکتبہ جلا دیا تھا جبکہ یہ آخری جلد زیر طبع تھی۔ پانچ مطبوعہ جلدیں ہمدرد لائبریری اور کچھ دوسری پرائیویٹ لائبریریوں میں موجود ہیں۔

(کتاب الدیات)

ہمارے فقہاء کرام نے قتل کی پانچ قسمیں فرمائی ہیں۔ قتل[1] عمد، قتل[2] شبہ عمد۔ قتل[3] خطاء فی القصد۔ قتل[4] خطاء فی الفعل قتل[5] قائم مقام خطاء۔ ان سب کی تعریف جو کچھ فقہاء کرام نے فرمائی ہے اُسے ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

(۱) **قتل عمد**:۔ کسی کو ہتھیار سے مار ڈالنا یا کسی ایسی دھاردار چیز سے جو ہتھیار کے قائم مقام ہو قتل کر دینا۔ مثلاً دھاردار لکڑی۔ بانس کا دھاردار پٹھا پتھر کا دھاردار ٹکڑا۔ نیز آگ میں جلا دینا۔

(۲) **قتل شبہ عمد**:۔ بغیر کسی ہتھیار اور دھاردار چیز کے کسی کو قتل کر دینا۔ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بڑے پتھر یا بڑی لکڑی سے جس میں دھار نہ ہو مار ڈالنا بھی قتل عمد ہے البتہ کسی ایسی چیز سے مار ڈالنا جس سے عموماً قتل نہ کیا جاتا ہو شبہ عمد کہلاتا ہے۔ مثلاً کسی چھوٹے ہتھیار سے مارنا کہ

اس سے عموماً قتل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ تادیب اور تنبیہ کا ارادہ ہوتا ہے۔

(۳) قتل خطاء فی القصد :۔ یہ ہے کہ کسی نے فاصلہ سے ایک چیز کو شکار سمجھتے ہوئے اس پر گولی چلادی لیکن وہ شکار کے بجائے آدمی تھا۔ گولی اسے لگی اور وہ مرگیا یا یہ کہ گولی چلانے والے نے اسے حربی کافر سمجھ کر اس پر گولی چلائی تھی لیکن وہ مسلمان نکلا۔

(۴) قتل خطاء فی الفعل :۔ یہ ہے کہ گولی چلانے والے نے ایک نشانہ پر گولی چلائی تھی لیکن وہ کسی آدمی کو لگ گئی۔

(۵) قتل قائم مقام خطاء :۔ یہ ہے کہ آدمی چھت پر سو رہا تھا جس پر منڈیر نہیں تھی۔ اس نے کروٹ لی اور نیچے کسی آدمی پر گر گیا اور جس پر وہ گرا وہ مرگیا۔ یا کسی نے ایسی زمین میں جو اس کی ملکیت نہیں تھی کنواں کھود لیا اور اس میں کوئی گر کر مرگیا۔

لیکن قرآن کریم نے قتل کی یہ پانچ قسمیں بیان نہیں فرمائیں۔ چونکہ ہمارے فقہاء نے ان پانچوں صورتوں کے احکام میں قیاسات یا روایات کی وجہ سے فرق فرمایا ہے اس لئے انہوں نے سہولت کی خاطر قتل کی پانچ قسمیں فرمادی ہیں۔ قرآن کریم نے قتل کی دو ہی قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ قتل عمد اور قتل خطاء۔ اور ان ہی کی سزائیں بیان فرمائی ہیں جو انتہائی اور آخری سزائیں ہیں۔ حالات و واقعات کی وجہ سے

حاکم وقت کو ان میں تخفیف و تشدید کا حق ہوتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ حالات و واقعات کے ماتحت تشدید و تخفیف کا حق حاکم وقت کو دیدینا مناسب ہے۔ بجائے اس کے کہ اسے متعین کرکے حاکم کو ان کا پابند بنادیا جائے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے حالات و واقعات کے ماتحت جو تشدید و تخفیف فرمائی تھی اس سے حاکمانِ وقت کو رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے لیکن ایسی پابندی ضروری نہیں کہ وہ اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہوسکیں۔

قتل عمد کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے بحث کرچکے اور بتاچکے ہیں کہ قتل عمد میں قَوَدْ (جان کے بدلے جان) واجب ہوتی ہے شبہ عمد میں ہمارے فقہاء کرام دیت اور کفارہ کے قائل ہیں۔ بہت سی ایسی صورتیں جنہیں ہمارے فقہاء کرام نے قتل عمد شمار نہیں کیا بلکہ شبہ عمد قرار دیا ہے ہمارے خیال میں وہ شبہ عمد نہیں بلکہ قتل عمد ہی ہیں اور ان میں بجائے دیت کے قَوَدْ ہی ہونی چاہیئے۔ قتل عمد کی جو تعریف ہمارے فقہائے کرام نے فرمائی ہے وہ خود بھی اس پر قائم نہیں رہے۔ قتل عمد ان کے نزدیک یہ ہے کہ آلۂ قتل یا کسی دھار دار چیز سے قتل کیا جائے تو وہ قتل عمد ہوتا ہے۔ لیکن اس تعریف کے باوجود اگر کوئی شخص کسی کو بڑے پتھر سے کچل کر مار ڈالے، پانی میں غرق کرکے مار ڈالے، یا آگ میں کسی کو جلادے تو ان صورتوں میں ہمارے فقہاء خود بھی

دیت کے قائل نہیں بلکہ قَوَدْ (جان کے بدلے جان) کے قائل ہیں۔ حالانکہ یہ تمام چیزیں نہ لوہے کا آلۂ قتل ہیں اور نہ دھاردار چیزیں ہیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک قتل عمد کی تعریف یہ ہونی چاہیئے کہ قاتل کسی کو قتل کردے اور وہ عمداً ایسا کرے۔ اس کا ارادہ جان سے مار ڈالنے کا ہو وہ کسی غلطی کی بناء پر اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ یعنی نہ خطاء فی القصد ہو نہ خطاء فی الفعل ہو۔ باقی تینوں قسمیں جو قتل خطاء کی بیان کی گئی ہیں۔ یعنی (۱) خطاء فی القصد (۲) خطأ فی الفعل اور (۳) قائم مقام خطاء یہ سب قتل خطاء ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جرم کی خفت اور شدت کے لحاظ سے تینوں میں یقیناً فرق ہے اور عدالت کو ان کی شدت اور خفت کو مدنظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے یقیناً جرائم کی شدت و خفت کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں بھی اس کا لحاظ رکھا ہے۔ کہیں دیت مغلظہ اور کہیں دیت غیر مغلظہ۔ ہماری عدالتوں کو بھی جرائم کی شدت و خفت کا لحاظ رکھنا چاہیئے اور سنت نبوی اور سنت خلفاء سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے۔

سب جرائم یکساں نہیں

تمام جرائم یکساں نہیں ہوتے۔ ان میں حالات وکوائف کے اعتبار سے بڑا فرق ہوتا ہے۔ شراب نوشی جرم ہے اور قابل تعزیر ہے۔ لیکن ایک شخص اپنے گھر میں بند کمرہ

میں شراب پیتا ہے۔ دوسرا آدمی کسی پبلک مقام پر کھلم کھلا سب کے سامنے شراب نوشی کا جرم کرتا ہے۔ تیسرا آدمی مسجد میں بیٹھ کر شراب نوشی کرتا ہے۔ چوتھا آدمی حرم کعبہ میں اس جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ شراب نوشی کے جرم کا ارتکاب چاروں نے کیا ہے لیکن جرم کی شناعت یکساں نہیں ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ان چاروں کو یکساں سزا نہیں دی جاسکتی۔ جرائم کی شناعت و قباحت کو مدنظر رکھتے ہوئے سزا میں بھی خفت اور شدت اختیار کی جائے گی۔

شریعت نے اجماع صحابہؓ کے مطابق اس کے لئے تعزیراً اسّی[۸۰] کوڑے مقرر کئے ہیں لیکن تمثیلاً مذکورہ چاروں صورتوں میں یکساں سزا نہیں دی جاسکتی۔ جیسے جرائم شدید اور خفیف ہیں ایسے ہی ان کی سزا بھی مختلف ہونی لازمی ہے۔

جرم زنا کی سزا قرآن کریم نے سو کوڑے مقرر فرمائی ہے لیکن ایک زنا تو یہ ہے کہ تراضیٔ طرفین سے زنا کا ارتکاب کیا جائے۔ دوسری زنا یہ ہے کہ زنا بالجبر کیا جائے۔ عورت روتی چلاتی رہی، لیکن زبردستی اس کے ساتھ زنا کیا گیا۔ تیسری زنا یہ ہے کہ ایک نابالغ معصوم بچی کو زبردستی اپنی حیوانی ہوس کا نشانہ بنا لیا گیا۔ چوتھی زنا یہ ہے کہ زبردستی کسی نابالغ بچی کو کسی مقدس اور پاکیزہ مقام پر مثلاً کسی بزرگ کے مزار پر یا کسی مسجد یا خانقاہ میں اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا اور یہ شنیع حرکت کی گئی۔ کہنے کو تو یہ سب صورتیں زنا ہی کی ہیں۔

لیکن اپنے خصوصی حالات اور کوائف کو بھی نظر میں رکھا جائے تو جرم اور جرم میں بڑا فرق ہے۔ عدالت کا فرض ہے کہ ان حالات و کوائف کو بھی نظر میں رکھے اور ان کے مطابق سزا میں تخفیف و تشدید سے کام لے تمام مجرموں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔

قتل خطاء کی ہمارے فقہاء نے تین صورتیں تجویز فرمائی ہیں۔ یقیناً ان سب میں شناعت و قباحت کے اعتبار سے فرق ہے اور اس فرق کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے مگر یہ سب قتل خطاء کی صورتیں ہیں اور ان کی سزا بھی قتل خطاء کی سزا یعنی کفارہ اور دیت ہے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک مؤمن غلام یا کنیز کو آزاد کیا جائے اور دیت یہ ہے کہ خون کی قیمت ادا کی جائے جسے خوں بہا کہتے ہیں۔ اگر غلام یا کنیز مسلمان آزاد کرنا ممکن نہ ہو جیسا کہ آج کل اس کا امکان نہیں ہے تو دو مہینے مسلسل اور متواتر روزے رکھے جائیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (۴/۹۲)

ترجمہ:۔ اور (دیکھو) کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ کسی مسلمان کو قتل کر ڈالے، مگر یہ کہ غلطی سے (اور شبہ میں) اس کے ہاتھ سے کوئی قتل ہو جائے۔ اور جس کسی نے ایک مسلمان کو غلطی سے (اور شبہ میں) قتل کر دیا ہو، تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خوں بہا ادا کرے۔ اگر مقتول کے وارث خوں بہا معاف کر دیں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ اور اگر مقتول اس قوم میں سے ہو جو تمہاری دشمن ہے (یعنی تم سے برسر جنگ ہے) مگر مؤمن ہو۔ (اور کسی نے یہ سمجھ کر کہ یہ بھی دشمنوں میں سے ہے اسے قتل کر دیا ہو) تو چاہیئے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کیا جائے (خوں بہا کا دلانا ضروری نہ ہوگا، کیونکہ اس کے وارثوں اور ساتھیوں سے مسلمانوں کی جنگ ہے)۔ اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہے جن کے ساتھ تمہارا معاہدۂ صلح ہے (یعنی معاہد ہو) تو چاہیئے کہ قاتل، مقتول کے وارثوں کو خوں بہا بھی دے اور ایک غلام بھی آزاد کرے جو مسلمان ہو۔ اور جو کوئی غلام نہ پائے (یعنی

اس کا مقدور نہ رکھتا ہو کہ غلام کو مال کے بدلے حاصل
کرے اور آزاد کرائے) تو اسے چاہیئے کہ لگاتار دو
مہینے روزے رکھے۔ اس لئے کہ اللہ کی طرف سے یہ
(اس کے گناہ کی) توبہ ہے۔ اور اللہ سب کچھ جاننے
والا اور (اپنے تمام احکام میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

عام کفاروں میں جہاں ایک غلام آزاد کرنے کا یا روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر غلام دستیاب نہ ہو اور روزے نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی سہولت بھی دی گئی ہے۔ لیکن قتل خطاء کے سلسلہ میں قرآن کریم نے یہ رعایت نہیں دی۔ کیونکہ قرآن کریم نے اسے بیان نہیں کیا۔ اور مقادیر قیاس سے متعین نہیں کی جاسکتیں اس کے لئے منصوص تصریح ضروری ہوتی ہے۔ اس کی وجہ ہمارے فقہاء یہ بیان فرماتے ہیں کہ جزاء پر جب "فاء" آتی ہے تو اس کا مقصد ہی یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ فاء کے بعد جس کا ذکر کیا جارہا ہے وہ پوری جزاء ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں ہے اصول فقہ میں اس کی تفصیلات بیان کردی گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موضع بیان میں کسی بات کو نہ بیان کرنا اس کی دلیل ہوا کرتی ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں کفارہ کا بیان ہورہا ہے۔ قرآن کریم کو یہاں کفارہ کا پورا بیان کرنا لازم تھا۔ موضع بیان میں کھانا کھلانے کا بیان نہیں ہوا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ کھانا کھلانا کفارہ ہے ہی نہیں۔ ہمیں ان دونوں

اصولوں سے پورا پورا اتفاق ہے اور قتل خطاء کے کفارہ میں صرف دو چیزیں ہی کفارہ بن سکتی ہیں۔ یا تو وہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرے یا پھر لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے۔ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے سے گناہ کا کفارہ نہیں ہوگا۔

(ملاحظہ فرمائیے ہدایہ مع حواشی صفحہ ۵۸۴/۴ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

ہمیں یہاں یہ بات دہرانے کی اجازت دیجیئے کہ یہ دونوں اصول ہمارے فقہاء کرام کی نظروں سے جرم زنا کی سزا میں بالکل ہی اوجھل ہوگئے۔ وہاں بھی۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ط (۲۴/۲)

ترجمہ: زنا کار عورت اور زنا کار مرد (زنا کے مرتکب ہوں) تو ان میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو۔

اس آیت کریمہ میں بھی جزاء پر فاء آرہی ہے جس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے بعد جو جزاء بیان کی جارہی ہے وہ پوری جزاء ہے۔ جزاء کا ایک حصہ نہیں ہے۔ نیز موضع بیان میں کسی بات کو بیان نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مقصود ہی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے فقہاء رجم کے قائل ہیں کہ اگر زنا کار شادی شدہ ہوں تو انہیں سنگسار کیا جائے۔

گا۔ خامہ انگشت بدنداں ہے ..... [1]

شبہ عمد کی دیت کیا ہے

شبہ عمد میں دیت یعنی خوں بہا امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سو اونٹ اربا عًا ہونے چاہئیں یعنی چار طرح کے اونٹ ہوں۔ پچیس ۲۵ بنت مخاض یعنی جن کی عمر ایک سال ہو چکی ہو اور دوسرے سال میں لگ رہے ہوں اور پچیس ۲۵ بنت لبون ہوں یعنی دو سال کے پورے ہو چکے ہوں اور تیسرے سال میں لگ رہے ہوں۔ اور پچیس ۲۵ حِقّے ہوں یعنی جو تین سال کے ہو چکے ہوں اور چوتھے سال میں لگ رہے ہوں۔ اور پچیس ۲۵ جذعے ہوں یعنی جو چار سال کے ہو چکے ہوں اور پانچویں سال میں لگ رہے ہوں۔

امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ سو اونٹ اَثلاثاً ہوں گے یعنی تین طرح کے ہونے چاہئیں۔ تیس ۳۰ جذعے (چار سالہ) تیس ۳۰ حقے (تین سالہ)۔ اور چالیس ۴۰ ثنیّے یعنی (پانچ سالہ) اور یہ چالیس کے چالیس حاملہ ہوں۔ ان کے پیٹ میں بچے ہوں۔

قتل خطا میں دیت

لیکن قتل خطاء میں دیت اخماسًا ہونی چاہیئے یعنی پانچ طرح کے اونٹ ہوں۔ بیس ۲۰ بنت مخاض (یک سالہ اونٹنی) بیس ۲۰

[1] اس کی تفصیل ہماری کتاب "رجم حد ہے یا تعزیر" میں گذر چکی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

بنت لبون (دو سالہ اونٹنی) بیس ۲۰ ابن مخاض (ایک سالہ نر اونٹ) بیس ۲۰ حقے (تین سالہ اونٹ) بیس ۲۰ جذعے (چار سالہ اونٹ)۔

شبہ عمد کا جرم قتل خطاء کے مقابلہ میں شدید ہے اس لئے قتل شبہ عمد میں دیت بھی زیادہ شدید رکھی گئی ہے قتل خطاء میں چونکہ جرم خفیف ہے۔ قاتل نے قصدًا کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ غلطی سے جرم سرزد ہوا ہے۔ اس میں اتنا ہی ہے کہ گولی چلانے والے نے احتیاط سے کام نہیں لیا اس لئے اس کی دیت بھی خفیف رکھی گئی ہے۔

لیکن ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ قرآن کریم نے قتل عمد ہی کو بیان کیا ہے۔ شبہ عمد کا کوئی تذکرہ نہیں فرمایا۔ لہٰذا قتل عمد اور قتل شبہ عمد ایک ہی چیز ہے۔ قرآن کریم شبہ عمد کو بھی قتل عمد ہی شمار کرتا ہے اور اس کی سزا بھی وہی ہے جو قتل عمد کی ہے یعنی سزائے موت۔ ان دونوں میں دیت نہیں ہے ان دونوں میں اولیاءِ مقتول کو نہ معاف کرنے کا حق ہے نہ کسی مال پر صلح کر لینے کا۔ قتل عمد اور قتل شبہ عمد حقِ ورثاء نہیں ہے بلکہ حق مملکت ہے۔ اس میں مدعی حکومت ہے۔ مقتول کے ورثاء نہیں ہیں۔ لہٰذا معافی یا صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیت یعنی خوں بہا صرف قتل خطاء میں عائد ہوتی ہے۔

دیت عاقلہ پر

احادیث میں دیت کے متعلق آتا ہے کہ قتل خطاء میں دیت عاقلہ پر یعنی قاتل کے خاندان پر واجب ہوگی اور کفارہ خود قاتل کو ادا کرنا ہوگا۔ لیکن ایسا کرنا عرب کے قبائلی نظام میں تو ممکن تھا۔ آج کے غیر قبائلی نظام میں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں خصوصی حالات میں اجتماعی جرمانہ عائد کیا جاتا ہے یعنی مثلاً جس محلہ یا قریہ میں کوئی جرم ہوا اس کی پوری آبادی پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں اسے امداد باہمی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ دیت کی مقدار بہت زیادہ رکھی گئی تھی اور ایسا کرنا ناگزیر تھا۔ کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم جب مبعوث ہوئے تو عرب میں قتل و غارت گری کا بازار بہت زیادہ گرم تھا اور اس سلسلہ کو بند کرنا ضروری تھا۔ بغیر سخت سزا کی صدیوں کی پڑی ہوئی عادت کو چھڑانا ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ مقدار اتنی تھی کہ کسی ایک آدمی کی استطاعت سے یقیناً باہر تھی اس لئے امداد باہمی کے ذریعہ اس کو پورا کرایا گیا۔ لیکن نہ وہ حالات ہیں نہ اس کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ طریقہ اسلام کے مسلّمہ اصول کے خلاف بھی ہے۔ لیکن خصوصی حالات میں اس کو نافذ کرنا ضروری تھا۔ اور آج بھی اگر ویسے ہی خصوصی حالات پیدا ہو جائیں تو یہی طریقہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں جرائم کے سلسلہ میں جو عام اصول دیا ہے وہ یہی ہے

کہ :-

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۔

(۶/۱۶۴ ز ۱۷/۱۵ ز ۳۵/۱۸ ز ۳۹/۷ ز ۵۳/۳۸)

ترجمہ :- کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔

یہ الفاظ سورۂ انعام، سورۂ اسراء، سورۂ فاطر، سورۂ زمر اور سورۂ النجم میں وارد ہوئے ہیں۔ یعنی پوری پانچ جگہ۔ اس کے علاوہ :-

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط (۲/۲۸۶)

ترجمہ :- ہر نفس انسانی کو اسی کا فائدہ ہوگا جو اس نے کمایا اور اسی کا نقصان پہنچے گا جو اس سے سرزد ہوا۔

اور

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(۳/۲۵)

ترجمہ :- ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ

(۳/۱۶۱)

ترجمہ :- پھر ہر نفس کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے

گا۔ جو اس نے کمایا اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اور

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ۔ (۱۴/۵۱)

ترجمہ :۔ تاکہ اللہ ہر نفس کو اس کی جزاء دے جو اس نے کمایا تھا۔

اور

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (۴۲/۳۰)

ترجمہ :۔ جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کی کمائی ہوئی ہوتی ہے۔

اور

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۸)

ترجمہ :۔ ہر نفس اسی میں ماخوذ ہے جو اس نے کمایا۔

اس مضمون کی آیات قرآن کریم میں بے شمار ہیں جن کا احصاء بہت مشکل ہے۔ ہم نے وہی آیات پیش کر دی ہیں جو اس موضوع پر نہایت واضح اور صریح ہیں۔ ان تمام آیات قرآنی کا ماحصل یہی ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہوتا بلکہ نہیں ہو سکتا۔

یہ حکم کہ قتل خطاء میں مجرم کا خاندان یا اس کا قبیلہ (عاقلہ) دیت کی سزا کو برداشت کرے۔ قرآن کریم کی ان واضح اور

صریح آیات کے خلاف ہے۔

علامہ ابن رشد قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ :۔

واما علی من تجب؟ فلا خلاف بینهم ان دیة الخطاء تجب علی العاقلة وانه حکم مخصوص من عموم قوله تعالیٰ ـــ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ـــ ومن قوله علیه الصلوٰة والسلام لابی زمنة لولده " لا یجنی علیك ولا تجنی علیه"

(بدایۃ المجتہد ص ۴۱۲ ج ۲ مطبوعہ مصر)

ترجمہ :۔ رہ گئی یہ بات کہ دیت کس پر واجب ہوگی؟ تو فقہاء میں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ وہ عاقلہ (خاندان) پر واجب ہوتی ہے اور یہ ایک ایسا حکم ہے جو حق تعالیٰ کے ارشاد لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا) اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس ارشاد سے جو آپ نے ابو زمنہ سے اس کے بیٹے کے متعلق فرمایا تھا کہ نہ وہ تیری ذمہ داری پر کوئی جرم کر سکتا ہے۔ نہ تو اس کی ذمہ داری پر کوئی جرم کر سکتا ہے، کے عام حکم سے مخصوص ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی کہ عاقلہ پر دیت کا واجب ہونا قرآنی نصوص صریحہ کے عموم اور ابو زمنہ

رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے عموم سے کیوں مخصوص ہے؟ اصول میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ عام ہر حال میں اپنے عموم پر باقی رہتا ہے۔ اخبار آحاد سے اس کے عموم کو خاص نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ کے بیان سے صراحۃً تو نہیں البتہ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ چونکہ فقہاء میں اس مسئلہ پر کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے انہوں نے ایسا سمجھا ہے کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہو گیا ہے اور اسی اجماع کی وجہ سے نصوص صریحہ کے عموم کو وہ خاص کر لینے کے حق میں ہیں۔ لیکن اجماع کی حقیقت کیا ہے اور اس کی حیثیت خود ائمہ فقہاء کے نزدیک کیا ہے اس پر ہم فقہ القرآن جلد چہارم کے حصہ "رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟" میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ اسے وہاں دیکھ لیا جائے۔ اختصار کے ساتھ ہم اس کا اعادہ کر دیتے ہیں۔ تفصیل ہماری محولہ بالا کتاب میں ملے گی۔ ہم نے وہاں بتایا تھا کہ:۔

صاحب نور الانوار نے اجماع کی بحث شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"اجماع لغت میں اتفاق کو کہتے ہیں اور امت محمدیہ کے تمام صالح مجتہدین کا جو ایک زمانہ میں ہوں امر قولی یا امر فعلی پر اتفاق کر لینا اجماع کہلاتا ہے۔ یہ بنیادی چیز ہے۔ اجماع کی دو قسمیں ہیں اول تو عزیمت (یعنی حقیقی اور اصل اجماع) یعنی اگر وہ مسئلہ قول سے متعلق ہو تو سب کسی حکم کے متعلق زبان

سے کہیں کہ ہم سب نے اس پر اتفاق کر لیا ہے اور اگر وہ مسئلہ عمل سے متعلق ہو تو ان سب نے کسی ایسے کام کو شروع کر دیا ہو اور متفقہ طور پر اس پر عمل پیرا ہوں۔ جیسا کہ تمام اہل اجتہاد نے بغیر کسی استثناء کے عملاً مضاربت یا مزارعت یا شرکت کا کاروبار شروع کر دیا تو یہ ان کے جائز اور مشروع ہونے پر ان کا اجماع کہلائے گا۔ اجماع کی دوسری قسم رخصت (یعنی مجازی اور غیر اصلی اجماع) کہلاتی ہے جس میں کچھ لوگ ایک مسئلہ کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں یا عملاً کرتے ہیں اور باقی لوگ خاموش رہتے ہیں، اس کی تردید نہیں کرتے حتیٰ کہ غور و فکر کی مدت یعنی تین دن یا مجلس علم گذر جاتی ہے اسے اجماع سکوتی کہتے ہیں۔ اور یہ اجماع ہمارے ہاں مقبول ہے۔ اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کیونکہ سکوت جیسا کہ موافقت کے لئے ہوتا ہے ایسے ہی کبھی رعب اور خوف کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ رضامندی کی دلیل نہیں"

(نور الانوار ص ۲۲۳)

نیز ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:۔

"امام مالکؒ صرف اہل مدینہ کے کسی بات پر متفق ہو جانے کو اجماع کہتے ہیں۔ باقی مدینہ والوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے اتفاق کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ جب عام اجماع حقیقی ہی کو تسلیم نہیں کرتے تو اجماع سکوتی کو تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح شیعہ حضرات صرف اپنے

اصطلاحی اہل بیت نبوی یا عترتِ نبوی کے اتفاق رائے کو اجماع کہتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک بھی عام اجماع یا اجماع سکوتی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

(نورالانوار ص۲۲۴)

علامہ شیخ ابوزہرہ مصری اپنی کتاب امام احمد ابن حنبلؒ میں رقم طراز ہیں کہ :-

حافظ ابن قیمؒ نے فقہ حنبلی کے اصولوں میں اجماع کو شمار ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ امام احمدؒ سے یہاں تک روایت کرتے ہیں کہ ——— "جو کسی مسئلہ میں اجماع کا ادعاء کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اجماع کا وجود ثابت بھی ہو جائے تو اس کا علم بڑا مشکل امر ہے۔"

(امام احمد ابن حنبل ص۳۶۵ مطبوعہ مطبعہ سلفیہ لاہور)

"امام شافعیؒ نے اپنی مشہور کتاب "جماع العلم" میں مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اپنا ایک مناظرہ نقل فرمایا ہے اور مد مقابل کو اجماع کے خلاف دلائل سے ہر طرح زچ کر دیا ہے۔ بالآخر اس کے اس سوال پر کہ ——— "پھر اجماع کوئی چیز ہے بھی ؟"

امام شافعیؒ جواب دیتے ہیں کہ :-

ہاں فرائض کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی شخص ناواقفیت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ پس یہ ایسا اجماع ہے جس کے بارے میں تم کہہ سکتے ہو کہ تمام لوگوں نے ان مسائل

پر اجماع کر لیا ہے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نہیں یہ اجماع نہیں ہے۔ پس یہ ہے وہ طریقہ جس سے اجماع کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔

(کتاب جماع العلم ص۶۳ طبع معارف مصر)

نیز امام شافعیؒ ہی اپنی کتاب "اختلاف الحدیث" میں جو کتاب الام کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے تحریر فرماتے ہیں کہ :-

اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی شخص نے فرائض کے سوا جن کی پابندی کے سب لوگ مکلف ہیں کسی اور مسئلہ پر اجماع نہیں کیا۔ اور میرے علم میں اس زمین کی پشت پر ایسا کوئی عالم بھی نہیں ہے جس نے اس مسلک سے انحراف کیا ہو۔

(اختلاف الحدیث ص۱۴۷)

اس پوری تفصیل کے بعد کہ امام احمد ابن حنبلؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اس اصطلاحی اجماع کے قائل ہی نہیں جس کی دُہائی ہمارے فقہاء ہر مسئلہ میں دیتے ہیں کیا فقہائے حنفیہؒ اس کا ثبوت پیش فرما سکتے ہیں کہ صحابہ، تابعین یا تبع تابعین نے کسی ایک مقام پر جمع ہو کر اس کا اعلان فرمایا ہو کہ ہم اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ دیت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر واجب الادا ہو گی ؟ ہمارا خیال ہے کہ اس کا ثبوت بہم پہنچانا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اجماع کا دعویٰ ساقط ہو جاتا ہے۔ رہ گیا اجماع سکوتی تو عام فقہاء نے اس کو تسلیم ہی نہیں فرمایا صرف

فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس کے قائل ہیں لیکن دلیل کے لحاظ سے ان کا موقف نہایت کمزور ہے۔

پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دلائل شرعیہ کی ترتیب یوں ہے۔ کتاب[1] اللہ، سنت[2] رسول اللہ، اجماع[3] اور قیاس[4]۔ اجماع کا درجہ دلائل میں تیسرا ہے۔ تو کیا تیسرے درجہ کی دلیل اس قابل ہے کہ وہ اول درجہ کی دلیل یعنی کتاب اللہ کو منسوخ کر دے؟ کتاب اللہ کے عموم کو خاص کر لینا نسخ ہی کی ایک قسم ہے اور ناسخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اسی درجہ کی دلیل ہو جس درجہ کی دلیل وہ ہے جسے منسوخ کیا جا رہا ہو۔ اجماع کی حیثیت یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ کتاب اللہ کو منسوخ کر دے۔ ناسخ کو منسوخ سے برتر یا اس کا ہم پلہ ہونا چاہیئے لہٰذا ہم اپنے قصور فہم کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ ہماری سمجھ میں امام ابن رشد قرطبیؒ کی یہ دلیل نہیں آتی۔ خصوصیت سے اس وجہ سے بھی کہ وہ امام مالکؒ کے مکتبۂ فکر سے منسلک ہونے کے مدعی ہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں ہم سمجھتے ہیں کہ دیت عاقلہ (قبیلہ یا خاندان) پر نہیں بلکہ خود مجرم پر عائد ہونی چاہیئے۔

دیت کی مقدار

عربوں میں دیت کی کوئی مقدار متعین نہیں تھی بلکہ ہر قبیلہ اپنی وجاہت و عزت کی بناء پر دیت مقرر کر لیتا تھا۔ جو قبیلہ زیادہ وجیہ اور زیادہ طاقتور ہوتا تھا اس کے ہاں دیت کا نرخ اس کی وجاہت

اور عزت کے پیمانے کے مطابق اتنا ہی زیادہ ہوتا تھا۔ جو قبیلہ کمزور اور ناتواں ہوتا تھا اس کے ہاں نرخ اسی اعتبار سے کم ہوا کرتا تھا۔ قریش کے خاندان میں ایک قریشی کی دیت دس اونٹ ہوا کرتی تھی۔

مولانا شبلیؒ اپنی سیرۃ النبی میں لکھتے ہیں کہ:-

"انہوں نے (یعنی عبدالمطلب نے) منت مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے (عربوں میں انسانی قربانی کا رواج عام تھا) خدا نے یہ آرزو پوری کی، دسوں بیٹوں کو لے کر کعبہ میں آئے اور پجاری سے کہا کہ ان دسوں پر قرعہ ڈالو، دیکھو کس کے نام پر نکلتا ہے؟ اتفاق سے عبداللہ کا نام نکلا یہ ان کو لے کر قربان گاہ کو چلے، عبداللہ کی بہنیں جو ساتھ تھیں رونے لگیں۔ اور کہا کہ ان کے بدلے دس اونٹ قربان کیجئے۔ ان کو چھوڑ دیجئے۔ عبدالمطلب نے پجاری سے کہا کہ عبداللہ پر اور دس اونٹوں پر قرعہ ڈالو، اتفاق یہ کہ عبداللہ ہی کے نام پر قرعہ نکلا۔ عبدالمطلب نے اب دس کے بجائے بیس اونٹ کر دیئے، یہاں تک کہ بڑھاتے بڑھاتے سو اونٹ تک نوبت پہنچی تو اونٹوں پر قرعہ آیا۔ عبدالمطلب نے سو اونٹ قربان کئے اور عبداللہ بچ گئے۔ یہ واقدی کی روایت ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اونٹوں کے معاوضہ

کی تدبیر رؤسائے قریش نے تجویز کی تھی۔

(سیرۃ النبی ص ۱۶۷-۱۶۸ مطبوعہ مطبعہ معارف اعظم گڑھ، انڈیا)

معاوضہ کی یہ تدبیر عبداللہ کی بہنوں نے پیش کی ہو یا رؤسائے قریش نے، اور پجاری نے اسے قبول کرلیا، ظاہر ہے کہ یہ اسی وجہ سے تھا کہ قبیلۂ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹ ہی ہوا کرتی تھی۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، جاہل، اجڈ قبائلی نظام میں انسانی خون کی کوئی زیادہ وقعت نہیں ہوا کرتی۔ آج بھی قبائل میں (جو عام طور پر مہذب، متمدن اور تعلیم سے آشنا نہیں ہوتے) بات بات پر گولیوں کا تبادلہ ہو جاتا ہے اور سینکڑوں آدمی مرجاتے اور زخمی ہو جاتے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے قبائل میں اس کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسلام سے پہلے عرب بھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا اور علم و ہنر سے بہرہ یاب نہیں تھے ان میں بھی بات بات پر تلواریں سونت لی جاتی تھیں۔ ان کی جہالت و بربریت کا نقشہ مولانا حالی مرحوم نے اپنی مسدس میں کچھ غلط نہیں کھینچا۔ ان کے ہاں نفس انسانی کی کیا قیمت تھی اور انسان کا خون کتنا ارزاں تھا اسی سے ظاہر ہے کہ عبدالمطلب اپنے دس بیٹوں میں سے ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لئے آگئے تھے۔ یہ تو قریش کا حال تھا جو عرب کے دیگر قبائل کے مقابلہ میں تجارت پیشہ ہونے اور دیگر متمدن و مہذب اقوام سے

تجارتی روابط کی وجہ سے بہت بہتر پوزیشن کے مالک تھے۔ دیگر قبائل کا حال تو اور بھی ابتر تھا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں خون انسانی کی ارزانی کا کیا حال ہوگا جبکہ قریشی خاندان کا ایک سردار اپنی منت پوری کرنے کے لئے دس بیٹوں میں ایک بیٹے کو قربان کرنے کے لئے بے تکلف آجاتا ہے کہ دسوں بیٹوں میں سے قرعہ اندازی کر کے متعین کر دو کہ مجھے کون سے بیٹے کو قربان کرنا ہوگا۔ یعنی ایک بیٹے کا خون بہا دینا اور اس کا خون قربان گاہ پر چڑھا دینا کوئی بڑی بات ہی نہیں تھی۔

یہ بات ضمناً آگئی، ہمیں بتانا یہ تھا کہ قریش میں ایک انسانی خون کی قیمت دس اونٹوں کے برابر تھی۔

قرآن کریم نے دیت (خون بہا) کی کوئی مقدار متعین نہیں فرمائی۔ اس نے یہی فرمایا ہے کہ:-

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاءً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَن يَصَّدَّقُوا ۚ (۴/۹۲)

ترجمہ:- جو کسی مسلمان آدمی کو غلطی یا شبہ سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان کی گردن آزاد کرنی ہوگی اور مقتول کے ورثاء کو خون بہا حوالہ کرنا ہوگا بجز اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔

خون بہا کی مقدار متعین کر کے بتا دینا حق تعالیٰ کے لئے

کوئی مشکل بات نہیں تھی جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خوں بہا کے ساتھ ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنے کا حکم بھی دیا جارہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ اگر ایک مسلمان گردن کو آزاد کرنا اگر دشوار ہو تو :-

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ط (۴/۹۲)

ترجمہ :- جو کوئی (ایک مسلمان گردن کو آزاد کرانے کی) استطاعت نہ پائے تو اسے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنے ہوں گے۔ یہ اللہ کی طرف اس جرم کی توبہ ہے۔

یہاں روزوں کو مبہم نہیں چھوڑا گیا بلکہ صراحۃً بیان کردیا کہ روزے دو ماہ کے رکھنے ہوں گے یعنی ساٹھ دن کے اور وہ بھی لگاتار۔ اتنی تصریح اور تفصیل کے ساتھ روزوں کا بیان فرمایا گیا ہے۔ تو اسی طرح صاف اور صراحت سے یہ بیان کر دینا بھی کیا مشکل تھا کہ دیت میں دس اونٹ یا بیس اونٹ یا سو اونٹ دینے ہوں گے۔

چونکہ ہر زمانہ میں ہر معاشرے کے حالات یکساں نہیں ہوسکتے۔ خون کی قیمت بھی دنیا کی تمام چیزوں کی طرح گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ پھر ہر ملک میں اونٹ میسر نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کسی طرح کا تعین امر دشوار تھا۔ اس سے قوم بڑی تنگی میں پڑ جاتی جو رحمت الٰہی کو منظور نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے خود متعین کر دینا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ پھر وہ ابدالآباد

تک کے لئے ایک متعین قیمت ہوجاتی۔ لہٰذا اس کو غیر متعین چھوڑنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ہر زمانہ کا ہر معاشرہ اپنے اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے یہ بات خود ہی طے کرے کہ ہمارے معاشرے کے اِن حالات میں خون انسانی کی قیمت کیا ہونی چاہیئے۔

چونکہ عرب معاشرے میں خونِ انسانی کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی اور قتل و غارتگری ایک بچوں کا کھیل بنا ہوا تھا جسے روکنا انتہائی ضروری تھا۔ اور عربوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت تھی کہ خون مسلم انتہائی محترم چیز ہے۔ جانِ مسلم کا احترام مقصد اسلام بھی ہے اور امن و امان قائم کرنے کے لئے ایک جزو لاینفک بھی ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے عرب معاشرے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے ہاں اونٹ بکثرت ہوتے ہیں اور یہ ان کا لازمۂ زندگی ہے۔ وہ اسی کا دودھ پیتے تھے۔ اسی کی اون سے کپڑے بن کر پہنتے تھے۔ اسی کی کھالوں سے خیمے بناتے تھے۔ اسی کی مینگنیوں سے ایندھن کا کام لیتے تھے۔ اسی کا گوشت کاٹ کر کھاتے تھے۔ اُن کے ہاں اونٹ ہی ان کی غذا۔ اونٹ ہی ان کا لباس اور اونٹ ہی ان کا مکان تھا۔ لہٰذا وہ اونٹ بکثرت پالتے تھے۔ اور ایک ایک آدمی کے پاس انگنت اونٹوں کی قطاریں ہوتی تھیں۔ حتیٰ کہ عربی زبان میں مَالٌ کا لفظ ہی اونٹ

کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ اور یہ کوئی عرب کی امتیازی خصوصیت نہیں تھی۔ ہر ریگستانی علاقہ کی یہی صورت ہوتی ہے۔ لہٰذا آپ نے اونٹ ہی کی صورت میں دیت یعنی خوں بہا کی تعیین مناسب سمجھی۔ اور چونکہ آپ یہ چاہتے تھے کہ قتل و غارتگری کی گرم بازاری ختم ہو اور لوگ امن و امان سے رہنا سہنا سیکھیں اس لئے آپ نے جو زیادہ سے زیادہ اس دَور کے لحاظ سے قیمت ہو سکتی تھی وہی متعین فرمائی۔ یعنی سَو اونٹ۔

پھر چونکہ قتل کر دینا ان کے ہاں ایک معمولی کھیل بن گیا تھا اور قبائلی عصبیت کی شدت کی وجہ سے پورا قبیلہ مجرم کا پشت پناہ ہوا کرتا تھا۔ اور اپنے قبیلہ کی شہ پر ہی لوگ دوسرے قبیلے کے لوگوں کو قتل کر ڈالتے تھے حتیٰ کہ اگر اس قتل کے نتیجہ میں کوئی جنگ چھڑ جاتی تو پورا قبیلہ ایک آواز پر جمع ہو جاتا اور دشمن سے نبرد آزما ہو جانے میں پس و پیش نہیں کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ قبیلے والے یہ پوچھنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے تھے کہ بات کیا ہے۔ دُہائی دینے والے نے کیوں دہائی دی ہے۔ قصور کس کا ہے۔ خود دہائی دینے والے کا قصور ہے یا جس کے خلاف دہائی دی جا رہی ہے اس کا قصور ہے۔ صلح جوئی کا کوئی امکان ہے یا نہیں۔ اُنہیں ان تمام امور سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ صرف یہ دیکھتے تھے کہ پکارنے والے نے یا قریش یا تمیم،

یا بنی ربیعہ اور یا بنی مخزوم کا نعرہ لگایا ہے اور اس نے اپنے خاندان کی دہائی دی ہے۔ اس لئے ہمارا فریضہ ہے کہ ہم اس کی اعانت کے لئے حاضر ہو جائیں اور دشمن کی گردنیں مارنی شروع کر دیں۔ لہٰذا آپ نے مناسب سمجھا کہ ان حالات میں اجتماعی جرمانہ کی صورت میں سزا دی جائے۔ ویسے بھی ایک آدمی کے لئے سو اونٹ مہیا کرنا آسان نہیں تھا۔ اجتماعی جرمانے کی شکل ہی میں اسے بروئے کار لایا جا سکتا تھا۔ اور قبائلی نظام میں یہ صورت اجتماعی جرمانے کے علاوہ امداد باہمی کی بھی ایک صورت تھی۔ ویسے ان حالات میں یقیناً ہر قبیلہ اپنے آدمی کے ساتھ اس اعتبار سے جرم میں شریک بھی ہوتا تھا کہ وہ کم از کم اسے معیوب نہیں سمجھتا تھا اور اس کی پشت پناہی اور نصرت کے لئے کمربستہ تھا۔ لہٰذا ان پر بوجھ ڈالنا عین مناسب تھا۔

لیکن آج ہمارے ہاں وہ قبائلی نظام ہے، نہ وہ خاندانی عصبیت ہے نہ اونٹوں کی وہ کثرت ہے۔ نہ خونِ انسانی کی وہ ارزانی ہے جو عربوں میں اس وقت موجود تھی اس لئے ہماری قطعی رائے یہی ہے کہ اپنے احوال و کوائف کو دیکھتے ہوئے ہمارے ملک کی پارلیمنٹ خود طے کرے کہ خون انسانی کی قیمت کیا ہونی چاہیئے۔ وہ مقدار نہ اتنی گراں ہو کہ اس کو مہیا کرنا ہی ناممکن ہو جائے اور نہ اتنی ارزاں ہو کہ اس سے خون انسانی کی حرمت اور اس کے تقدس کا کوئی

تصور ہی نہ اُبھر سکے۔

هذا ما رايته والله اعلم

امام ابن رشد قرطبی فرماتے ہیں کہ:۔

اما اهل الذهب والورق فانهم اختلفوا ايضا فيما يجب من ذالك عليهم فقال مالك على اهل الذهب الف دينار وعلى اهل الورق اثنا عشر الف درهم۔ وقال اهل العراق على اهل الورق عشرة آلاف درهم وقال الشافعي بمصر لا يؤخذ من اهل الذهب ولا من اهل الورق الا قيمة الابل بالغة ما بلغت وقوله بالعراق مثل قول مالك۔ وعمدة مالك تقويم عمر ابن الخطاب المائة من الابل على اهل الذهب بالف دينار وعلى اهل الورق باثنى عشر الف درهم واجماعهم على تقويم المثقال بها في الزكوٰة واما الشافعي فيقول ان الاصل في الدية انما هو مائة بعير۔ وعمر انما جعل فيها الف دينار على اهل الذهب واثنى عشر الف درهم على اهل الورق۔ لان ذالك كان قيمة الابل من الذهب والورق في زمانه۔ والحجة له ما روى عن عمرو ابن شعيب عن ابيه عن جده

انه قال: كانت الديات على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ثمانمأة دينار وثمانية آلاف درهم ودية اهل الكتاب على النصف من دية المسلمين۔ قال فكان ذلك حتى استخلف عمر، فقام خطيبا فقال ان الابل قد غلت ففرضها عمر على اهل الورق اثنى عشر الف درهم وعلى اهل الذهب الف دينار۔ وعلى اهل البقر مأتي بقرة وعلى اهل الشاة الفي شاة وعلى اهل الحلل مأتي حلة۔ وترك دية اهل الذمة لم يرفع فيها شيئا۔ (بداية المجتهد ص ۴۱۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ رہ گئے سونے چاندی والے تو فقہاء نے اس میں بھی اختلاف کیا ہے کہ ان پر اس میں کیا واجب ہوگا؟ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم واجب ہوں گے۔ اور اہل عراق نے کہا کہ چاندی والوں پر دس ہزار درہم واجب ہوں گے۔ امام شافعیؒ نے مصر میں جانے کے بعد فرمایا کہ سونے والوں سے اور ایسے ہی چاندی والوں سے وہی قیمت لی جائے گی جو سو اونٹوں کی قیمت ہوگی خواہ اس کی مقدار کتنی ہی کیوں نہ ہو اور جب تک وہ عراق میں رہے امام شافعیؒ کا قول بھی وہی تھا جو

امام مالکؒ کا قول تھا۔ اور امام مالکؒ کی بہترین دلیل
یہ ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ نے سو اونٹوں کی قیمت
سونے والوں کے لئے ایک ہزار دینار اور چاندی والوں
کے لئے بارہ ہزار درہم مقرر فرمائی تھی۔ اور زکوٰۃ کے
سلسلہ میں مثقال کی قیمت اسی حساب سے لگانے پر
تمام فقہاء نے اتفاق کیا ہے۔ اور امام شافعیؒ فرماتے
ہیں کہ دیت میں اصل سو اونٹ ہی ہیں اور حضرت
عمرؓ نے اس میں سونے والوں پر ایک ہزار دینار اور
چاندی والوں کے لئے بارہ ہزار درہم اسی لئے مقرر
کی تھی کہ ان کے زمانہ میں اونٹوں کی قیمت سونے چاندی
سے یہی ہوتی تھی اور ان کی دلیل وہ روایت ہے جو
عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی ہے کہ انہوں
نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں
دیتیں آٹھ ہزار دینار اور آٹھ ہزار درہم ہوا کرتی تھیں
اور اہل کتاب کی دیت مسلمانوں کی دیت سے آدھی ہوا
کرتی تھی، یہی مقدار اس وقت تک باقی رہی جب تک
حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے، جب وہ خلیفہ ہوئے انہوں
نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ اونٹ اب گراں ہو گئے ہیں
چنانچہ حضرت عمرؓ نے چاندی والوں پر بارہ ہزار درہم
اور سونے والوں پر ایک ہزار دینار مقرر کر دیئے۔
نیز گائے والوں پر دو سو گائیں اور بکری والوں پر دو ہزار

بکریاں اور کپڑے والوں پر دو سو حلّے (جوڑے) مقرر
فرما دیئے اور ذمیوں کی دیت اپنے حال پر باقی رکھی۔
اس میں کوئی اضافہ نہیں فرمایا۔

امام ابن رشد قرطبی کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت
عمر ابن الخطابؓ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں چونکہ اونٹوں کی
قیمت بڑھ گئی تھی اس لئے حضرت عمرؓ نے آٹھ ہزار درہم کے
بجائے بارہ ہزار درہم مقرر فرما دی تھی۔ امام شافعیؒ نے اسی
بات سے استدلال فرمایا کہ دیت میں اصل سو اونٹ ہیں۔
سونے چاندی وغیرہ سے اسی حساب سے دیت دی جائے گی
جو اونٹوں کی قیمت بنتی ہو۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے
زمانہ میں چونکہ سو اونٹ آٹھ ہزار درہم کے ہوا کرتے تھے۔
اس لئے دراہم میں دیت آٹھ ہزار تھی لیکن حضرت عمرؓ کے
زمانہ میں سو اونٹ بارہ ہزار درہم کے ہو گئے تھے اس لئے
انہوں نے دیت کی رقم بارہ ہزار درہم کر دی۔ امام شافعیؒ
کا یہ استدلال ایک غلط فہمی پر مبنی ہے واقعہ یہ ہے کہ حضور
اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمانوں کا کوئی اپنا
سکہ نہیں تھا۔ دراہم و دنانیر ایران، عراق اور شام سے
آتے تھے اور وہی عرب میں مستعمل تھے۔ ان کے اوزان مختلف
ہوا کرتے تھے۔ بعض درہم وزن کے اعتبار سے زیادہ ہوتے
تھے اور بعض کم ہوتے تھے۔ چھوٹے درہم ایک دینار کے بارہ
ہوتے تھے اور جن کا وزن زیادہ ہوتا تھا وہ ایک دینار کے

دس آتے تھے۔

چنانچہ بلاذری نے اپنی فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ :۔

"ہم سے حسین ابن الاسود نے بیان کیا، اُن سے یحییٰ ابن آدم نے ان سے حسن بن صالح نے کہ عجمیوں کے بنائے ہوئے درہم مختلف تھے، چھوٹے بھی، بڑے بھی چنانچہ وہ درہم ایک مثقال کا ڈھالتے تھے اور وہ بیس قیراط کا ہوتا ہے اور کچھ درہم بارہ قیراط کے ڈھالتے تھے اور دس قیراط کے درہم بھی ڈھالتے تھے اور یہ نصف مثقال کے ہوتے تھے جب اللہ اسلام کو لایا اور زکوٰۃ ادا کرنے میں درمیانی درہموں کی ضرورت لاحق ہوئی تو انہوں نے بیس قیراط اور بارہ قیراط اور دس قیراط کو جمع کیا تو یہ کل بیالیس[۴۲] قیراط ہوئے تو انہوں نے اس کا تہائی نکالا اور وہ چودہ قیراط کا وزن ہوا چنانچہ عربی درہم انہوں نے چودہ قیراط کا بنایا دینار عزیز کے قیراطوں سے تو ہر دس درہم کا وزن سات مثقال ہوا۔ یہ ایک سو چالیس قیراط ہوئے سبعہ (سات) کے وزن سے۔ حسن ابن صالح کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بیان ہے کہ عجمیوں کے دراہم ایسے بھی تھے جن میں سے دس کا وزن دس مثقال ہوا کرتا تھا اور ایسے بھی تھے جن میں سے دس کا وزن سات مثقال ہوا کرتا تھا اور ایسے بھی تھے کہ دس دراہم کا وزن پانچ مثقال ہوا کرتا تھا۔ ان سب کو جمع کیا گیا تو سب کا وزن اکیس مثقال ہوا تو انہوں نے اس مجموعہ کا تہائی لے لیا اور وہ سات مثقال

ہوا چنانچہ عربوں نے ایسے درہم بنائے جن کے دس کا وزن سات مثقال تھا۔ دونوں اقوال کا مآل ایک ہی ہے۔"

(فتوح البلدان ص۴۷۱)

اس موضوع پر شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب اعلاء السنن (ص۱۳۱-۱۴۰ ج ۱۸ مطبوعہ سیر آرٹ پریس فریر روڈ کراچی) میں سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ اسے دیکھ لیا جائے۔

چنانچہ حضرت علامہ تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

اور یہ کہنا کہ دیت کی مقدار کا اختلاف اس وجہ سے تھا کہ اونٹوں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ ہوتا تھا اس کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی دونوں روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ دیناروں سے انہوں نے دیت کی مقدار ایک ہزار دینار ہی بتائی ہے۔ اگر اونٹوں کی قیمت میں اختلاف کی وجہ سے دراہم کی مقدار میں کمی بیشی ہوئی تھی تو دیناروں سے فیصلہ کرنے میں بھی کمی بیشی ہونی لازمی تھی۔ ایسے ہی اس سے بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ دو سو گائے، دو ہزار بکریاں دو سو حُلّے (جوڑے) دونوں روایتوں میں مشترک ہیں۔ ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ دیناروں کی قیمت میں اختلاف کا امکان نہیں ہے۔ اس کا بطلان ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ بات متعین ہے دراہم کے وزن اور قیمت میں اختلاف ہی

کی وجہ سے تھا یہ اختلاف تھا کسی اور وجہ سے نہیں۔
(اعلاء السنن ص ۱۳۴ ج ۱۸)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں غالباً حق بجانب ہیں کہ دیت کے معاملہ میں اونٹ کوئی مرکزی حیثیت کے مالک نہیں ہیں بلکہ عرب معاشرہ میں چونکہ اونٹ ہی مرکزی اہمیت رکھتے تھے اس لئے اونٹوں سے دیت مقرر کر دی گئی تھی۔ چونکہ عربوں میں اونٹ ہی مال کہلاتے تھے اس لئے ضروری نہیں کہ دوسرے معاشروں میں بھی جہاں اونٹوں کو مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہے اونٹوں ہی کی پابندی کی جائے دوسرے معاشروں کے لئے دینار اور درہم، بکریاں اور گائیں اور حُلّے (کپڑوں کے جوڑے) بھی معیار بن سکتے ہیں۔ اور جب اونٹ گراں ہوگئے تو حضرت عمرؓ نے اونٹوں کے بجائے دینار و درہم کو دیت (خوں بہا) کا بدل بنانے میں پس و پیش نہیں فرمایا۔ آجکل سونا اور چاندی بھی گراں ہوگیا ہے اور اس کے نرخ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اس لئے اس میں پھر تبدیلی ہونی چاہیئے اور تبدیلی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا کچھ ضروری نہیں کہ آج بھی دینار و درہم کو معیار مان کر سونے اور چاندی کی قیمت لگا کر دیت کی مقدار کا تعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ آج کل سونا اور چاندی معیار نہیں رہا ہے بلکہ اس کی جگہ کرنسی نے لے لی ہے۔ لہٰذا ہماری حکومت کو از سر نو دیت کی مقدار کا تعین کرنا چاہیئے اور بتانا چاہیئے

کہ ہمارے اس دور میں انسانی خون اور انسانی جان کی قیمت کیا ہونی چاہیئے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قتل خطاء میں دیت کا بار عاقلہ (قاتل کے خاندان) پر ڈالنا نہ صرف یہ کہ قرآنی اصول مسلمہ کے خلاف ہے بلکہ موجودہ غیر قبائلی نظام میں اس پر عمل پیرا ہونا بھی ممکن نہیں رہا ہے۔ لہٰذا یہ بار خود قاتل پر ہی ڈالنا ہوگا۔ لہٰذا حکومت اس نکتہ کو بھی ذہن میں رکھے کہ دیت (خوں بہا) کی جو مقدار بھی مقرر کی جائے وہ لازماً اتنی ہو کہ ایک فرد واحد اسے ادا کر سکے۔ ہماری اسلامی نظریاتی کونسل نے اس ضمن میں جو سفارشات پیش کی ہیں، ہمیں افسوس ہے کہ وہ اس معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ دیت کی جو مقدار انہوں نے بتائی ہے وہ ایک فرد واحد کی استطاعت سے یقیناً زیادہ ہے۔ لہٰذا اس پر مزید غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کفارہ قتل خطاء میں قرآن کریم نے دو کفارے بتائے ہیں ایک تو یہ کہ کوئی غلام یا کنیز آزاد کی جائے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو دو مہینے کے متواتر روزے رکھے جائیں۔ حنفیہؒ کا مذہب یہ ہے کہ کفارے صرف یہ دو ہی ہوسکتے ہیں۔ اس میں فقہاء کا کوئی اختلاف بھی نظر سے نہیں گذرا۔ موجودہ حالات میں جبکہ ایک غلام کو آزاد کرنا ممکن نہیں رہا۔ اگر کوئی شخص اتنا ضعیف ہے کہ وہ دو مہینے کے لگاتار روزے نہیں رکھ سکتا تو اس کے لئے کفارہ کی صورت کیا ہوگی؟

یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ میرے خیال میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جنین کے بدلے میں جبکہ دو عورتوں میں لڑائی ہوئی تھی اور ایک عورت نے دوسری عورت کے پتھر مار دیا تھا جس سے اس کا حمل ساقط ہو گیا تھا حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام یا کنیز آزاد کرنے کا حکم دیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ نے پانچ سو درہم یا پچاس دینار ایک غلام کی قیمت ادا فرمانے کی اجازت دی تھی۔ اس سے غلام کی قیمت ادا کرنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے اور اس زمانہ میں جبکہ غلام دستیاب تھے ایک غلام کی قیمت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا پانچ سو درہم کے بقدر موجودہ کرنسی میں غلام کی قیمت ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ فقہاء نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ غلام کی قیمت دیت کا نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ہوتی ہے۔ لہٰذا حکومت وقت دیت کی جو مقدار طے کرے۔ اس کا بیسواں حصہ کفارہ کا بھی مقرر کر دے جو غرباء مساکین اور یتامیٰ کو دلوایا جائے کہ یہ انہیں کا حق ہے۔ دیت کی رقم مقتول کے ورثاء کو دلائی جائے اور کفارہ کی رقم یتامیٰ، مساکین اور فقراء کو دلوائی جائے۔

واللہ اعلم۔

اس سلسلہ میں روایات کی تفصیل حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اعلاء السنن ص ۱۹۸ ج ۱۸ مطبوعہ سپیرٹ پریس کراچی، میں بیان فرمادی ہے۔ وہاں دیکھنی چاہیئے۔

عورت کی دیت

ہمارے فقہاء عموماً اس کے قائل ہیں کہ اگر کسی کے ہاتھ سے غلطی یا شبہ سے کوئی عورت قتل ہو جائے تو قتل خطأ میں عورت کی دیت، مرد کی دیت (خوں بہا) سے نصف ہوگی کیونکہ عورت کا حال مرد کے حال سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد کی منفعت سے کم تر ہے۔ یہ دلیل ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد کہاں سے پیدا ہوں۔ مردوں اور عورتوں دونوں کی پیدائش ہی عورت پر منحصر ہے لہٰذا یہ کہنا کہ عورت کا حال مرد سے ناقص تر اور اس کی منفعت مرد سے کم تر ہے۔ ایسی بات ہے جسے عقل و بصیرت قبول نہیں کرتی۔ قرآن کریم نے عام حکم دیا ہے:۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ط

(۴/۹۲)

ترجمہ:۔ اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مؤمن گردن کو آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے اہل (ورثہ) کو دیت ادا کرنی ہوگی بجز اس کے کہ وہ صدقہ کر دیں یعنی دیت معاف کر دیں۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ دونوں کے لئے دیت ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اخبار آحاد سے قرآن کریم کے عام حکم کو خاص نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ:۔

ابن قدامہ نے مغنی میں کہا ہے کہ ابن المنذر اور ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد سے آدھی ہوتی ہے اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے علمائے نے بیان کیا ہے کہ ابن عُلَیَّہ اور اصم دونوں کا قول یہ ہے کہ عورت کی دیت مرد کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر مؤمن جان میں سو اونٹ دیت کے ہوتے ہیں اور یہ قول شاذ ہے جو صحابہ کے اجماع اور سنت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہے۔ کیونکہ عمرو ابن حزم کے نام خط میں یہ موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہوتی ہے الخ

(اعلاء السنن ص ۱۴۶ ج ۱۸ مطبوعہ سپر آرٹ پریس کراچی)

حضرت شیخ الاسلامؒ نے اعلاء السنن "باب دیت المرأۃ" میں تفصیل سے ان تمام روایات کو بیان کر دیا ہے جو اس باب میں پیش کی جاتی ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ان میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح نہیں ہے۔ تمام روایات مجروح ہیں۔ لے دے کر ایک وہی روایت رہ جاتی ہے جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے اس نامۂ مبارک کے نام سے پیش کی جاتی ہے جو آپ نے حضرت عمرو ابن حزم رضی اللہ عنہ کے نام لکھا تھا اور جس میں عورت کی دیت، مرد کی دیت سے نصف بتائی گئی ہے۔ لیکن خطوط سے کوئی بات ثابت نہیں ہو سکتی جبتک دو شاہد اس

بات کی شہادت نہ دیں کہ یہ خط ہمارے سامنے فلاں صاحب نے لکھا تھا اور ہمیں اس کا مضمون پڑھ سنا دیا تھا اور ہم نے اسے سمجھ لیا تھا اور کاتب نے ہمارے سامنے اس پر اپنی مہر ثبت کی تھی اور ہمارے حوالہ کر دیا تھا۔ چنانچہ ہدایہ میں "باب کتاب القاضی الی القاضی" کے تحت اس پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ مختصراً ہم اس کے چند فقرے نقل کرتے ہیں:۔

"اور کوئی خط بغیر دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ خط، خط کے مشابہ ہو سکتا ہے۔ لہٰذا حجت تامہ کے بغیر اس کا ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ خط بھی کسی بات کو لازم کرنے والا ہے تو حجت قائم ہونا ضروری ہے ------ اور واجب ہے کہ خط کو دو گواہوں کے سامنے پڑھ دیا جائے تاکہ وہ سمجھ لیں کہ خط میں کیا ہے یا وہ اُنہیں بتائے کہ میں نے خط میں یہ کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ علم کے بغیر شہادت نہیں ہو سکتی پھر وہ گواہوں کے سامنے (خط کو بند کر کے) اس پر مہر لگائے اور پھر ان کے حوالہ کرے۔

(ہدایہ ص ۱۳۹ ج ۳، مطبوعہ کلام کمپنی کراچی)

ہمیں افسوس ہے کہ عمرو ابن حزم رضی اللہ عنہ کے نام اس خط کے سلسلہ میں ایسی کوئی بات آج تک سامنے نہیں آئی کہ اس خط میں ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود تھی۔ اس لئے اس خط سے کوئی استدلال کرنا صحیح

نہیں ہے۔

کافر کی دیت

عجیب بات ہے کہ ذمی (اسلامی حکومت کے ماتحت رہنے والے کافر) کی دیت پوری ہوتی ہے اور مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ قرآن کریم نے خصوصیت کے ساتھ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ (۴/۹۲) فرمایا ہے۔ یعنی جو غلطی سے کسی مؤمن کو قتل کر دے تو ایک مؤمن گردن کو آزاد کرنا ہوگا اور مقتول کے گھر والوں (ورثاء) کو دیت حوالہ کرنا ہوگی۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ذمی کافر مؤمن ہوتا ہے اور ایک مؤمن عورت مؤمن نہیں ہوتی؟۔

ہم ذمی کافر کی دیت میں کسی کمی کے حق میں نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیئے اور ہم اس ضمن میں فقہائے حنفیہؒ کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن مؤمن عورت کے سلسلہ میں ہمیں اس سے اختلاف ہے اور ہم اس سلسلہ میں امام ابن عُلَیّہ اور امام ابو بکر الاصم کے قول کی تائید کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی قول ہمارے خیال میں قرآن کریم کے مطابق ہے۔ واللہ اعلم

اس سلسلہ میں امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم ہونی چاہیئے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہونی چاہیئے۔ امام مالکؒ کا ارشاد ہے کہ

یہودی اور نصرانی کی دیت چھ ہزار درہم ہونی چاہیئے۔ امام مالکؒ نے عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے جو روایت آتی ہے اس سے استدلال فرمایا ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عقل الکافر نصف عقل المسلم یعنی کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی ہے اور مسلم کی دیت ان کے نزدیک بارہ ہزار درہم ہوتی ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی عمرو ابن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے اس روایت سے استدلال فرمایا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان سے جس نے اہل کتاب کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا چار ہزار درہم دلوائے تھے۔ اس روایت کو عبدالرزاق نے اپنی مصنّف میں بیان کیا ہے۔ نیز امام شافعیؒ نے خود اپنی مسند میں عن فضیل ابن عیاض عن منصور عن ثابت عن سعید ابن المسیب عن عمر بن الخطابؓ کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہودی اور نصرانی کی دیت چار ہزار درہم اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم دلوائی تھی (ملا علی قاری)۔ فقہائے حنفیہؒ کی دلیل وہ روایت ہے جو امام ابو داؤد نے اپنی سنن میں سعید ابن المسیب سے روایت فرمائی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دیۃ کل ذی عھد فی عھدہ الف دینار یعنی ہر وہ شخص جس سے معاہدہ ہو چکا ہو معاہدہ کے دوران اس کی دیت ایک ہزار دینار ہوگی۔ یہ روایت باوجودیکہ مرسل ہے۔ لیکن چونکہ

قرآن سے قریب تر ہے اس لئے قابل اعتماد ہے اور ہم اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اعضاء میں دیت

غلطی سے اگر کسی نے کسی کے کسی عضو کو کاٹ دیا جس سے اس کی منفعت ختم ہوگئی تو پوری دیت واجب ہوگی۔ چنانچہ اگر کسی نے کسی کی ناک (بانسہ) کاٹ دیا، یا زبان کاٹ دی یا آلۂ تناسل کاٹ دیا یا سر پر چوٹ ماری جس سے اس کی عقل زائل ہوگئی یا ایسی چوٹ ماری کہ اس کی بصارت، سماعت سونگھنے یا چکھنے کی قوت زائل ہوگئی تو پوری دیت واجب ہوگی۔ نیز کسی نے کسی کی ڈاڑھی اس طرح مونڈ دی کہ وہ دوبارہ نہ اُگ سکے یا اس طرح سر کے بال مونڈ دیئے کہ وہ دوبارہ پیدا نہ ہوسکیں تو پوری دیت واجب ہوگی۔

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں دو معتبر آدمی جو کچھ فیصلہ کریں وہ مقدار دلوائی جائے گی۔ دیت واجب نہیں ہوگی۔

اگر کسی نے دوسرے کی مونچھیں مونڈ دیں تب بالاتفاق دو معتبر آدمیوں کے فیصلے پر عمل کیا جائے گا۔ ایسے ہی کسی نے کسی کی دونوں بھنویں مونڈ دیں تو پوری دیت دینی ہوگی۔ اگر ایک بھوں مونڈ دی ہے تو نصف دیت دینی ہوگی۔

اگر کسی نے غلطی سے کسی کی دونوں آنکھیں پھوڑ دیں یا دونوں ہاتھ کاٹ دیئے یا دونوں پاؤں کاٹ دیئے یا دونوں

ہونٹ کاٹ دیئے یا دونوں کان کاٹ دیئے یا دونوں بیضے کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہوگی۔ اگر ان میں سے کسی ایک عضو کو کاٹ دیا تو نصف دیت واجب ہوگی۔ اگر کسی نے کسی عورت کی دونوں چھاتیاں کاٹ دیں تو پوری دیت اور اگر ایک چھاتی کاٹ دی تو آدھی دیت واجب ہوگی ایسے ہی اگر کسی نے عورت کی چھاتی سے اس کے سرپستان کاٹ دیئے تو پوری دیت اور اگر ایک سرپستان کاٹ دیا تو نصف دیت واجب ہوگی۔

ایسے ہی اگر کسی نے دوسرے کی چاروں پلکیں کاٹ دیں تو پوری دیت دینی ہوگی۔ اگر صرف ایک پلک کاٹی ہے تو دیت کا چوتھائی دینا ہوگی۔ کیونکہ ہر آدمی کی چار پلکیں ہوتی ہیں۔

اگر کسی نے دوسرے کی پلکیں تو نہیں کاٹیں لیکن پلکوں کے سارے بال کاٹ دیئے تو پوری دیت واجب ہوگی۔ اگر صرف ایک پلک کے بال کاٹ دیئے ہیں تو دیت کا چوتھائی دینا ہوگا۔

اگر کسی نے ہاتھوں پیروں میں سے دوسرے کی ایک انگلی کاٹ دی تو دیت کا دسواں حصہ ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ ہاتھوں اور پیروں میں دس دس انگلیاں ہوتی ہیں۔ اگر کسی انگلی کا صرف ایک پورا کاٹ دیا ہے تو دیت کے دسویں حصہ کا ایک تہائی ادا کرنا ہوگا۔

ایسے ہی اگر کسی نے غلطی سے کسی کا ایک دانت توڑ دیا تو پانچ اونٹ یا ان کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ اس میں دانت اور ڈاڑھیں سب کا حکم ایک ہی عضو کا ہے۔

اگر کسی نے کسی عضو پر ضرب لگادی جس سے اس کی منفعت زائل ہو گئی۔ مثلاً ہاتھ پر چوٹ ماری جس سے وہ شل ہوگیا یا آنکھ پر چوٹ لگی اور اس کی بصارت زائل ہوگئی یا ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگائی کہ اس کے توالد و تناسل کی قوت زائل ہو گئی یا وہ اس ضرب سے کبڑا ہوگیا تو پوری دیت واجب ہوگی۔

زخموں کے بارے میں

اگر کسی نے دوسرے آدمی کو زخمی کر دیا ہے اور یہ جرم غلطی سے سرزد ہوا ہے تو ہمارے فقہاء نے زخموں کی دس قسمیں بیان کی ہیں جن کی تفصیلی شرح اور ان کے احکام کتب فقہ میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ ان کا تعلق قرآن کریم سے نہیں ہے بلکہ وہ ارشادات نبوی اور فقہاء کے اجتہادات پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ ان کے احکام کتب فقہ میں دیکھ لئے جائیں۔

حمل ساقط کر دینا

کسی نے حاملہ عورت کو مارا پیٹا یا دو عورتوں کی آپس میں لڑائی ہوئی اس میں ایک عورت حاملہ تھی اور اس کا حمل ساقط ہوگیا۔ تو اگر عورت نے ایسا حمل ساقط کیا ہے کہ اس میں جان پڑ چکی تھی

اور جنین زندہ ساقط ہوا تھا اور سقوط کے بعد مرگیا ہے تو پوری دیت واجب ہوگی اور اگر ابھی جان نہیں پڑی تھی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس میں ایک غلام یا باندی آزاد کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا یا دیت کا نصف عشر یعنی پانچ سو درہم ادا کرنے ہوں گے۔ یہ پانچ سو درہم غربا، و مساکین کا حق ہوگا۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے چھ سو درہم مقرر کئے ہیں۔ حنفیہؒ نے یہ پانچ سو درہم عاقلہ پر ڈالے ہیں۔ اور امام مالکؒ نے خود اس شخص پر ڈالے ہیں جس نے جرم کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم دیت کے باب میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ ہمارے خیال میں عاقلہ پر دیت کا سوال آج کل خارج از بحث ہے۔ کیونکہ قبائلی نظام اب رائج نہیں ہے۔ البتہ اگر قبائلی نظام کہیں رائج ہو مثلاً صوبہ سرحد یا آزاد قبائلی علاقوں میں تو وہاں اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

اگر حمل ساقط ہوا اور ماں بھی مرگئی

اگر ضرب شدید سے حمل بھی ساقط ہوگیا اور ماں بھی مرگئی تو اگر حمل پہلے ساقط ہوا تھا اور ماں بعد میں مری ہے تو مجرم پر دو دیتیں واجب ہوں گی۔ ایک حمل کی دیت یعنی پانچ سو درہم اور دوسری عورت کی دیت اور اگر عورت پہلے مرگئی اور حمل موت کے بعد ساقط ہوا ہے۔ تو اگر حمل زندہ ساقط ہوا تھا اور وہ بعد میں مرگیا تو مجرم پر

دو دیتیں کامل واجب ہوں گی کیونکہ وہ دو جانوں کا قاتل ہے اور اگر وہ مردہ ہی ساقط ہوا ہے تو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر ایک دیت ماں کی واجب ہوگی۔ بچہ کی کوئی دیت واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ مجرم کی ضرب ہی سے جنین کی موت واقع ہوئی ہو، ہو سکتا ہے کہ مجرم کی ضرب سے ماں کی موت واقع ہوئی ہو اور ماں کی موت کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہوگئی ہو۔ کیونکہ وہ ماں کے سانس لینے ہی سے سانس لیتا ہے۔ ماں کی موت کی وجہ سے اس کا سانس گھٹ کر اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ شک واقع ہوگیا اس لئے دیت ساقط ہو جائے گی۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جنین کی دیت بھی واجب ہوگی۔ کیونکہ ظاہر یہی ہے کہ ضرب ہی کی وجہ سے جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ ہم امام شافعیؒ کے ارشاد کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیونکہ جنین کی موت واقع ہوئی ہے۔ موت مجرم کی ضرب سے واقع ہوئی یا ماں کے مرجانے اور سانس گھٹنے سے موت واقع ہوئی اس سے نتیجہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو جانوں کی موت واقع ہوئی ہے اور مجرم دو جانوں کا قاتل ہے۔ جنین کا سانس گھٹ کر موت واقع ہوئی ہو تب بھی مجرم بے قصور نہیں ہے۔ جنین کا سانس بھی تو اسی لئے گھٹا کہ مجرم نے اس کی ماں کو مار ڈالا لہٰذا دونوں موتوں کا سبب وہی ضرب شدید ہے جس کا

ارتکاب مجرم نے کیا۔

یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مجرم کا ارادہ عورت کو جان سے مار ڈالنے کا نہیں تھا۔ بلکہ قتل غلطی سے سرزد ہوا ہے اور حاکم وقت قتل خطاء کا فیصلہ کرے۔ اگر ارادۃً اس نے ایسا کیا ہے تو دیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ہم نے شروع میں قتل عمد اور قتل خطاء پر جو بحث کی ہے اسے دوبارہ دیکھ لیں۔

(باب البغاۃ)

بُغَاۃٌ ، بَاغِیٌ کی جمع ہے جو بَغَاوَۃٌ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ بَغْیٌ ہے جس کے معنے درمیانہ روی کی حد سے بڑھ جانے کی خواہش (خواہ حد سے تجاوز کر سکے یا نہ کر سکے) کو کہتے ہیں۔ نیز بہت زیادہ بارش کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھ جائے بَغَتِ السَّمَاءُ بادل اپنی حد سے بڑھ گیا۔ بہت زیادہ برسا۔ یہ اس لفظ کے بنیادی معنے ہیں۔

مسلم عوام کی دو جماعتیں آپس میں کسی بات پر جھگڑا کریں اور حکومت اس میں فریق نہ ہو تو اس کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا یہ دونوں مسلم جماعتوں کا باہمی جھگڑا ہے۔ اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (۴/۵۹)

ترجمہ:- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور اپنے میں سے اہل حکومت کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں تم میں آپس میں جھگڑا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اگر حکام وقت سے کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تب بھی حکم یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حاکم اعلیٰ FINAL AUTHORITY ہیں اس لئے ان سے رجوع کر کے فیصلہ کرا لو۔ اور اپنا نزاع اس فیصلہ کے مطابق ختم کر دو۔ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجود نہیں ہیں تو جو مسلمانوں کی مرکزی قوت آنحضرت کی نائب ہو مثلاً خلیفۂ وقت۔ امیر ملّت اس سے رجوع کیا جائے مثلاً آج کل کی اصطلاح میں ہائی کورٹ، سپریم کورٹ وغیرہ موجود ہیں وہاں اپیل کی جائے اور متنازعہ مسئلہ کا فیصلہ کرا لیا جائے۔

مسلمانوں کا آپس کا باہمی اختلاف بغاوت نہیں ہے یہ ایک معمولی نزاع ہے۔ بغاوت وہ ہے جس میں ایک فریق حکومت ہو اور دوسرا فریق رعایا کی کوئی جماعت ہو اور یہ جماعت حکومت کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکاری ہو۔

فقہ کی اصطلاح میں "بَغَاوَتْ" کسی تاویل کی بنا پر ایک طاقتور جماعت کا خلیفہ (یا حکومتِ اسلامیہ) کے خلاف خروج (یعنی ایسی مسلح اور جارحانہ مخالفت) کا نام ہے جس کا مقصد خلیفہ (یا حکومت اسلامیہ کے سربراہ) کو اس کے منصب سے

معزول کرنا یا اس کی رعیت بننے سے انکار کر دینا یا حکومت کے کسی ایسے حق کی ادائیگی سے انکار کر دینا جس کا ادا کرنا شرعاً اس پر واجب ہو۔

البتہ اگر سربراہِ مملکت مرتد ہو جائے تو اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کو معزول کر دینا واجب ہے۔ اس کے خلاف خروج اور مسلح جدوجہد کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔

مملکت کا کوئی حصہ جو اس میں شامل ہے اور اب تک مرکز کی اطاعت کرتا رہا ہے اس سے علیحدہ ہونا چاہے اور مرکز کی اطاعت سے انکار کر دے۔ اگر وہ خود اپنی مستقل آزاد حکومت قائم کرنا چاہتا ہو جو مرکز کی ماتحتی میں نہ ہو تو یہ بغاوت ہے اور اگر وہ اپنا الحاق کسی دوسری اسلامی مملکت سے کرنا چاہتا ہو تب بھی یہ بغاوت ہے۔ کیونکہ وہ اب تک اول مملکت کی ماتحتی میں رہتا آیا ہے۔ اور اب اس سے آزادی حاصل کر کے دوسری کسی اسلامی مملکت سے الحاق چاہتا ہے۔ اس طرح وہ عہد شکنی کا مرتکب ہو رہا ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ○

(۱۷/۲۴)

ترجمہ:۔ اور عہد کو پورا کرو۔ یقیناً عہد کے متعلق باز پرس ہونی ہے۔

مملکت اسلامیہ کے باشندوں کا ایک گروہ خلیفہ (سربراہِ مملکت) کی مخالفت اس بنا پر کرے کہ اس منصب پر اس کا تقرر یا

اس کی بقاء احکام شرعیہ کے خلاف اور از روئے شریعت ناجائز ہے اور یہ مخالفت اس حد تک بڑھے کہ وہ گروہ حکومت مذکورہ کو معزول کر کے ایک دوسری حکومت قائم کرنے کے لئے تلوار اٹھا لے جبکہ خلیفۂ وقت اپنے تقرر یا بقاء کو احکام شرعیہ کے عین مطابق اور از روئے شریعت جائز سمجھتا ہو تو عامۂ مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرا دیں اور جس فریق کی غلطی دیکھیں اس کے شبہات و شکوک کو دور کر دیں۔ اگر انہیں کوئی بجا شکایت ہو تو اس کا ازالہ کر دیں۔ اور ان دونوں جماعتوں کا فریضہ ہے کہ وہ عامۂ مسلمین کی ان کوششوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں۔

لیکن اگر ایک فریق اپنے موقف سے ٹس سے مس نہ ہو اور وہ اپنے موقف پر جما رہے اور کسی مصالحت کو قبول نہ کرے تو جس فریق کی غلطی ثابت ہو جائے۔ وہی فریق اب یعنی مصالحت کی کوشش ناکام ہو جانے کے بعد باغی ہے اور عام مسلمانوں کو اس سے جنگ کرنا واجب ہے۔ تا آنکہ وہ اپنی سرکشی سے باز آ جائے اور مصالحت کو قبول کر لے۔

سورۂ حجرات میں ہے:۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ

اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ (۴۹/۹)

ترجمہ :۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں (ایک دوسرے سے) لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔ پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ تو اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں گروہوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور (بہرحال) انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

اس آیت کریمہ پر غور کرتے ہوئے مندرجہ ذیل نکات ذہن میں رکھئے کہ :۔

① اول تو دونوں فریق، یعنی حکومت اور اس کی مخالفت کرنے والے افراد نہیں ہیں بلکہ ایک طائفہ یعنی ایک جماعت ہیں۔

② اور دوسرے یہ کہ دونوں مؤمن ہیں۔ یعنی ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں جو بغیر کسی دلیلِ شرعی کے کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتے۔

③ اور تیسرے یہ کہ اِقْتَتَلُوْا یعنی وہ دونوں جماعتیں مسلح تصادم یعنی قتال بھی کرتی ہیں۔ لہٰذا ان میں قتال اور جنگ کی صلاحیت بھی ہے اور وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کر رہی ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے فقہائے کرام نے ذُوْ مَنْعَۃٍ اور ذُوْ شَوْکَۃٍ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے یعنی دونوں فریق قوت و شوکت کے مالک

ہیں۔ اور چونکہ دونوں ایمان کے تقاضوں پر پورے اترنے والے ہیں۔ لہٰذا دونوں کے پاس شرعی دلائل موجود ہیں۔ یعنی وہ شرعاً اپنے آپ کو حق بجانب بھی سمجھتے ہیں۔

ایسے دونوں فریقوں میں آیت کا حکم یہ ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کو صلح کی کوشش کرنی چاہیئے اور فریقین کے شبہات کا ازالہ کرنا چاہیئے لیکن اگر مصالحت کی کوشش اور شبہات کے ازالہ کے بعد بھی کوئی سا ایک فریق اپنی بات پر بضد رہے تو قرآن کریم اب اسے باغی کہتا ہے :۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى ط

ترجمہ :۔ تو اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے۔

تو اب اس باغی (زیادتی کرنے والے گروہ) سے جنگ کرنی ضروری ہے۔

نیز اگر حکومت اور اس کا مخالف گروہ، دونوں ہی اپنے اپنے موقف پر جمے ہوئے ہوں اور وہ صلح قبول نہیں کرتے اور جنگ بند نہیں کرتے تو دونوں گروہوں (حکومت اور حکومت کا مخالف گروہ) کو باغی کہا جائے گا اور دونوں سے جنگ کی جائے گی تاآنکہ وہ مصالحت پر آمادہ ہو جائیں۔ آیت مندرجہ بالا کے مخاطب عامۂ مسلمین ہیں۔ حکومت یا اس کا مخالف گروہ نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اس آیت کریمہ میں عامۂ مسلمین کو خطاب کر کے انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا (یعنی تم ان دونوں

کے درمیان صلح کرادو) یہاں یہ حکم نہیں دیا جارہا ہے کہ تم ان دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کردو۔ بلکہ صلح کرانے کا حکم دیا جارہا ہے اور ظاہر ہے کہ صلح اس کے بغیر تو نہیں ہوسکتی کہ فریقین کی بات سُنی جائے۔ معلوم کیا جائے کہ ہر فریق کو دوسرے کے خلاف کیا شکایات اور شبہات ہیں۔ ہر فریق کے شبہات و شکایات کا ازالہ کیا جائے دونوں کے مطالبات پورے کرکے دونوں کو مطمئن کیا جائے۔ لہٰذا شبہات و شکایات کا ازالہ کرنا ضروری ٹھہرا۔

دونوں فریقوں کا فرض ہوا کہ وہ مصالحت کنندہ جماعت سے پورا پورا تعاون کریں اور فریق مخالف کے شبہات و شکایات کو دور کریں تاکہ تصادم و تزاحم کی یہ فضا ختم ہو اور دونوں بھائی بھائی بن کر رہ سکیں۔

البتہ اگر بالفرض :-

① مملکت اسلامیہ کا کوئی حصہ خلیفۃ المسلمین کے انتخاب کو از روئے آئین اسلام صحیح ہی نہ سمجھتا ہو اور اس بناء پر اس کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ یا

② اسے خلیفہ تو تسلیم کرتا ہو مگر ہنگامی خلیفہ سمجھتا ہو جو کسی ہنگامی حالت (EMERGNCY) کی وجہ سے فوری طور پر بطور عبوری حکومت (ENTERIM-GOVERNAMENT) منتخب کرلیا گیا ہو۔ اس وجہ سے وہ دوبارہ انتخاب کا طالب ہو اور اس کی خلافت کے استمرار کو ناجائز سمجھتا ہو۔ یا

③ خلیفہ کے بعض احکام کی تعمیل سے اس بنا پر انکار کردے کہ

اس کے نزدیک اسے از روئے آئین اسلامی ان احکام کے صادر کرنے کا اختیار ہی اور حق ہی نہیں۔

④ کسی خاص حکم کی تعمیل اور اس کے بارے میں خلیفہ کی اطاعت مصالح دینیہ کے خلاف سمجھ کر اس کی اطاعت سے انکار کردے۔

⑤ خلیفہ کو معزول نہ کرنا چاہتا ہو لیکن اس کے اور اپنے درمیان اختلافات طے کرنے کے لئے ثالثی، ارباب حل و عقد کے اجتماعی فیصلے یا استصواب رائے عامہ کا مطالبہ پورا ہونے کے بعد تک استمرار حال (STATUS-QUO) کا طالب ہو۔

ان سب صورتوں میں اگر اس گروہ نے خروج بالسیف نہیں کیا اور نہ اس کے عزم خروج کا کوئی واضح ثبوت ملا تو شرعاً اس گروہ کو باغی نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ باغی کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔

ان سب صورتوں میں یہ گروہ، پرامن، آئینی ذرائع اور شرعی طریقہ سے انقلاب چاہتا ہے۔ اور اس طرح کے مطالبہ کا حق، مملکت کے ہر مسلمان باشندے کو حاصل ہے۔ جس طرح انتخاب کے وقت ہر مسلمان نصب خلیفہ کے بارے میں اپنی رائے پیش کرسکتا ہے۔ اسی طرح اسے معزول کرنے کی تجویز بھی ارباب حل و عقد یا جمہور مسلمین کے سامنے رکھ سکتا ہے۔ اس بارے میں آزادانہ رائے دہی کا جو حق نصب خلیفہ کے بارے میں اسے حاصل تھا اس کے عزل کے بارے میں بھی حاصل ہے۔ دونوں صورتوں میں فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ مذکورہ بالا تمام صورتوں میں اس نے اپنے

اسی حق سے کام لیا ہے۔ اسے بغاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لیکن اگر خلیفہ یا سربراہ مملکت فریق مخالف کے شبہ اور استدلال کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ فریق کو اس کے شبہات دور کر کے مطمئن کرنے کے بجائے اس کے خروج بالسیف یا عزم خروج کا انتظار کئے بغیر ہی اس کے خلاف پولیس ایکشن کرتا ہے تو فریق مخالف کے لئے اپنی مدافعت کرنا جائز ہے یا نہیں۔ یہ مسلح دفاعی جنگ حدود بغاوت میں داخل ہے یا نہیں؟

اس کا جواب ظاہر ہے کہ خلیفہ یا سربراہ مملکت کا فرض تھا کہ جب فریق مخالف کے پاس شرعی دلیل موجود ہے اور کسی شبہ اور شکایت کی بنا پر وہ خروج کر رہا ہے تو اولاً اس کے شبہات وشکایات کا ازالہ کرے اس سے پہلے اس کو پولیس ایکشن کرنے کا حق نہیں تھا۔ لہٰذا اس نے فریق مخالف کے خلاف شرعی اجازت کے بغیر فوج کشی کر دی ہے۔ لہٰذا فریق مخالف کو مدافعت کا حق یقیناً حاصل ہو گا۔

ایک ضروری توضیح

شبہ یا شکایت و تاویل کے الفاظ کو اس قدر عام نہیں سمجھنا چاہیئے جس قدر وہ اپنے لغوی مفہوم کے لحاظ سے نظر آتے ہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے خروج کرنے والوں کا ہر شبہ معتبر نہیں ہے نہ ان کی ہر تاویل قابلِ اعتبار ہے۔ اصولی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ صرف اس شبہ کا ازالہ اور اس تاویل کا ابطال خلیفہ اور جمہور مسلمین کے ذمہ ہے جو اجتہاد کی گنجائش رکھنے والے کسی مسئلہ میں پیدا ہوا ہو۔ مگر کسی ایسے

مسئلے میں کسی شبہ یا تاویل کو قابل سماعت نہیں سمجھا جائے گا۔ جس میں اجتہاد و تاویل کی گنجائش نہ ہو اور وہ مسلمانوں کے مسلمات میں داخل ہو۔

اس کی روشن دلیل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں عرب کے بعض قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تھا اور اس کے لئے وہ یہ تاویل کرتے تھے زکوٰۃ مرکز کو ادا کرنا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں ضروری تھا۔ اب جبکہ آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا سے تشریف لے گئے بیت المال میں زکوٰۃ کا مال جمع کرنا ضروری نہیں رہا۔ کیونکہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کو زکوٰۃ اس لئے ادا کرتے تھے کہ آپ نبی تھے۔ ابوبکر صدیقؓ نبی نہیں ہیں۔ اب ہم کیوں زکوٰۃ ادا کریں۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کی اس تاویل کو قابلِ اعتناء اور ان کے شبہ کو قابلِ ازالہ خیال نہیں فرمایا بلکہ ان سے جہاد کا فیصلہ فرمایا۔ اگرچہ پہلے عام طور پر صحابۂ کرام نے حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ اکابر صحابہ نے بھی اختلاف کیا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ مانعین زکوٰۃ سے قتال جائز نہیں۔ لیکن خلیفۃ المسلمین حضرت صدیق اکبرؓ اپنی رائے پر قائم رہے اور ان کی مدلل تقریر کے بعد سب صحابہ ان سے متفق ہو گئے۔ بخاری و مسلم اور دیگر کتب صحاح میں یہ واقعہ تفصیل سے مذکور اور اہل علم میں مشہور ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جیش اسامہؓ

کو روانہ کرنے میں بھی یہی صورت پیش آئی کہ اکابر صحابہ نے مخالفت کی تھی مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے ان کی رائے نہیں مانی اور جیش اسامہؓ کو روانہ کرنے کا فیصلہ تنہا صدیق اکبرؓ نے اپنی رائے سے کیا تھا جس کو بعد میں تمام صحابہ نے صحیح تسلیم کیا۔

اس کے معنے یہ ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں جن میں اجتہاد کی گنجائش نہ ہو اور جو امت مسلمہ کے مسلمات میں داخل ہوں کسی تاویل اور شبہ کو باجماع صحابہ قابل اعتناء نہیں سمجھا جائے گا اور ایسے گروہ کے شبہات و شکایات کو دور کرنا تو کجا انہیں سننے کی بھی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کو باغی سمجھ کر زور و قوت کے ذریعہ سے خلیفہ کی اطاعت پر مجبور کیا جائے گا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کے خلاف فوج کشی کر کے ان کو قتل کر دیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ان کے شبہات کو دور کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان پر فوج کشی کی جائے ــــ انہیں خلیفہ کی اطاعت کی دعوت دی جائے گی۔ انہیں غور و فکر کرنے اور باہمی مشورہ کی مہلت دی جائے گی اگر وہ پھر بھی اطاعت سے انکار کریں اور مقابلہ کے لئے تیار ہو جائیں تو ان سے قتال کرنا جائز ہو گا۔

خلیفہ کی ممانعت کے باوجود مفسدین سے قتال

بغاوت کی تعریف اور اطاعت خلیفہ کی شرعی حدود پر غور کرنے سے اس سوال کا جواب معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن پہلے اس مجمل سوال

کی تفصیل سمجھ لینا چاہیئے۔ مسئلہ کی مندرجہ ذیل صورتیں نکلتی ہیں۔

(اوّل) مملکت اسلامیہ کے شہریوں کا ایک گروہ خلیفہ سے بغاوت کرے اور خلیفہ کسی معذوری یا مصلحت کی وجہ سے اس کی سرکوبی کرنے پر تیار نہ ہو اور اس سے استمالت کا برتاؤ کرے۔ لیکن مملکت کے مسلم شہریوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو دینی نقطۂ نظر سے ملت یا مملکت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہو اس وجہ سے وہ باوجود ممانعت خلیفہ اس سے جنگ کرے اور اس باغی گروہ کے مفسد اور واجب التعزیر ہونے پر حکومت اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت دونوں کا اتفاق ہو۔

(دوم) گمراہ اور مبتدع افراد پر مشتمل ایک پارٹی قوت حاصل کر کے مسلح انقلاب کی کوشش کرے۔ امام وقت کو قتل کر کے کسی دوسرے شخص کو امام بنالے جو صحیح المذہب متقی اور امامت کا اہل ہو اور جس کی خلافت و امامت پر اہل حق ارباب حل و عقد کی ایک معتدبہ جماعت کا بھی اتفاق ہو جائے مگر

(الف) اس نظام خلافت میں یہ فرقہ ضالہ باطلہ شریک ہو جائے۔

(ب) اس حکومت کے نظم و نسق اور اس کی پالیسی پر یہ گمراہ گروہ حاوی ہو جائے۔

(ج) یا اس پر حاوی تو نہ ہو مگر اسے حکومت کے نظام اور پالیسی پر مؤثر حیثیت حاصل ہو جائے اور اس کا یہ اثر معتدبہ ہو۔

اگرچہ اس فرقہ باطلہ ضالہ کے زیغ وضلال، بطلان افکار و اعمال اور اس کے واجب التعزیر ہونے پر خلیفہ اور مسلمانوں کا یہ گروہ مخالف متفق ہوں، لیکن خلیفہ اور اس کے معاونین کسی مصلحت یا شرعی عذر کی وجہ سے ان سے استمالت کا برتاؤ کرتے ہوں اور ان کے خلاف ہتھیار اُٹھانے یا انہیں حکومت سے بے دخل کرنے کے لئے کسی قسم کے تشدد کے مخالف ہوں۔

اس صورت میں مسلمانوں کی ایک جماعت خلیفہ کی رائے اور اس کی پالیسی کو ملت اسلامیہ یا مملکت اسلامیہ کے لئے دینی نقطۂ نظر سے سخت نقصان دِہ سمجھتی ہو اور اپنی اس رائے کی بنا پر ان اہل باطل پارٹی سے خلیفہ کی مرضی کے خلاف جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور وہ اپنی اس رائے کو عملی شکل دیدے۔

(سوم) (الف) مملکت اسلامیہ پر باہر سے کفار حملہ کردیں۔ یا

(ب) مملکت میں رہنے والے ذمی اور معاہد غیر مسلم مسلح بغاوت کردیں۔ یا

(ج) مسلمانوں کا ایک گروہ العیاذ باللہ مرتد ہوکر حکومت کی اطاعت سے انکار کردے۔

اور ان سب صورتوں میں حکومت باغیوں یا بیرونی حملہ آوروں سے جنگ نہ کرنا چاہتی ہو۔ مگر مسلمانوں کا ایک گروہ حکومت کی اس پالیسی کو غلط اور دین و ملّت کے لئے سخت مضر سمجھتا ہو اور خلیفہ کی رائے کے خلاف ان سے جنگ کرنا ضروری سمجھتا ہو اور وہ اس مفسد گروہ کے خلاف جنگ کرے۔

(چہارم) مملکت اسلامیہ کا کوئی گروہ کسی ایسے واجب شرعی کے متعلق اختلاف کی وجہ سے خلیفہ اور اس کی حکومت کا مخالف ہوجائے اور اس کی اطاعت سے انکار کردے جس میں کسی اجتہادی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ گویا وہ صاف صاف حکم شرعی کو ماننے سے انکار کردے اس موقعہ پر خلیفہ اور اس کی حکومت کا رویّہ یہ ہو کہ اس کی استمالت کی جائے بخلاف اس کے مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لئے جنگ کرنا ضروری سمجھتی ہو اور اس ضروری سمجھنے کا سبب یہ ہو کہ:-

(الف) اس کی رائے میں اس واجب شرعی اور حکم اسلامی پر عمل کرنے سے انکار کرنے والے کو اطاعت پر مجبور کرنا اور اگر ضرورت ہو تو اس سے قتال کرنا شرعًا جمہور مسلمین پر واجب علی الکفایہ ہو جو پہلے حکومت پر عائد ہوتا ہے اور اگر حکومت اسے ادا نہ کرے تو اس کے نزدیک یہ فریضہ جمہور مسلمین کا ہے۔ اس کے ساتھ قتال مذکور کے واجب علی الکفایہ ہونے پر خلیفہ اور زیر بحث جماعت کا اتفاق ہو۔

(ب) اس کی رائے میں زیرِ بحث منکر اطاعت کو مہلت دینا اور اس کی سرکشی پر اس کی سرکوبی سے گریز کرنا موجب فتنہ و مفسدہ اور دینی و ملی مصلحت کے خلاف ہو اور اس جماعت منکرہ کی گمراہی اور فتنہ پردازی کے بارے میں خلیفہ اور اس کی پالیسی سے اختلاف کرنے والے متفق الرائے ہوں۔

مندرجہ بالا صورتوں میں سے ہر صورت کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں عامۃ المسلمین کا ایک گروہ اگر ان لوگوں سے جنگ کرے جنہوں نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کیا یا جنہوں نے غیر آئینی اور غیر شرعی طریقہ سے ایک منتخب خلیفہ کو معزول یا قتل کر کے دوسرا سربراہِ مملکت مقرر کر دیا جبکہ موجودہ خلیفہ اسے باز رہنے کا حکم دے رہا ہو تو اس گروہ کے اس فعل کو جو خروج عن الطاعۃ ہے شرعاً بغاوت اور اس کے مرتکبین کو از روئے قوانین اسلام باغی کہہ سکتے ہیں یا نہیں ؟

جواب یہ ہے کہ ان میں سے کسی صورت کو بھی شرعاً بغاوت نہیں کہا جا سکتا اور اس قسم کا اقدام کرنے والے از روئے آئین اسلام باغی نہیں ہیں۔

بغاوت کا شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ اس جماعت نے خلیفہ کی اطاعت سے انکار کر دیا اور اس کے حکم کے خلاف ایک ایسے گروہ سے جنگ شروع کر دی جس سے جنگ کرنے کی وہ مخالفت کر رہا ہے اور جسے حکومت اسلامیہ نے قانونی تحفظ عطا کیا ہے۔ گویا یہ جنگ خود خلیفہ اور حکومت کے خلاف ہے۔ یہ شبہ سطحی انداز فکر سے پیدا ہوتا ہے۔ نظر غائر اسے غلط اور بے بنیاد قرار دیتی ہے۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا زیر بحث گروہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے ؟ یا اس کی یہ جنگ خلیفہ کو معزول کرنے کیلئے ہے ؟ دونوں سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ وہ قولاً یا عملاً

ان دونوں باتوں میں سے کسی کا اظہار نہیں کرتا۔ رہا اطاعت سے انکار کا مسئلہ تو اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے کہ مطلق اطاعت سے انکار اور خروج کو بغاوت نہیں کہتے بلکہ اطاعت واجبہ سے خروج کو بغاوت کہتے ہیں جبکہ دوسری شرائط بھی موجود ہوں۔ اس لئے زیر بحث مسئلہ میں جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور کو بغاوت ثابت کرنے کیلئے یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس پر امام کے حکم مذکور کی اطاعت واجب تھی اور اس نے اطاعت واجبہ سے خروج کیا اور زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی یہ بات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہوتی بخلاف اس کے صورت حال پر غور کرنے سے یہ بات عقل و فہم کو زیادہ متاثر کرتی ہے کہ اس جماعت کا یہ اقدام بالکل جائز بلکہ ادائے واجب علی الکفایہ کا ایک مصداق ہے۔ کیونکہ یہ واجب علی الکفایہ نہی عن المنکر کی ایک شکل اور دین و ملت کو ایک ضرر سے محفوظ رکھنے کی کوشش ہے۔ اس لئے اسے عملی صورت دینا چاہیئے اور خلیفہ کی مخالفت کی پروا نہ کرنا چاہیئے۔ گویا اس معاملے میں خلیفہ کی اطاعت جائز بھی نہیں چہ جائیکہ واجب ہو۔

زیر بحث جماعت جب ایک گروہ کی سرگرمی اور سرکشی کو ملت اسلامیہ کے لئے سخت مضر سمجھتی ہے تو اس کی سرکوبی سے احتراز اور اس کی استمالت کے بارے میں خلیفہ کا حکم کیسے مان سکتی ہے ؟ شرعاً اس کے لئے جائز ہے کہ اس معاملے میں خلیفہ کی

اطاعت سے انکار اور باغیوں سے جنگ کا آغاز کر دے خصوصیت کے ساتھ جبکہ زیر بحث مفسد گروہ کی فساد انگیزی پر فریقین یعنی حکومت اور اس سے اختلاف رکھنے والی جماعت متفق ہوں۔

مندرجہ بالا مسائل میں حکومت سے اختلاف کرنے والی جماعت مذکورہ کے اقدام مذکور پر بغاوت کی تعریف صادق نہیں آتی۔ کیونکہ زیر بحث صورتوں میں سے کسی میں بھی فریق مذکور کا مقصد حکومت کا تختہ الٹنا نہیں ہوتا اس لئے بغاوت کی حقیقت کا ان میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس جماعت نے حکومت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے بلکہ ایک دوسری جماعت کے خلاف اٹھائے ہیں جو خود حکومت کی مخالف ہے۔ درحقیقت ان کی جنگ بالواسطہ مملکت کی مصلحت اور خلیفہ کی موافقت اور تقویت کے لئے ہے۔ اسے بغاوت کہنا روشنی کو ظلمت کہنا ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝

(۲۲/۳۹-۴۰)

ترجمہ:۔ جن سے جنگ کی جاتی ہے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے محض اس جرم میں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے، گرجے، عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے منہدم کر ڈالے گئے ہوتے۔ اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اللہ (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔ اور اللہ بڑی قوت اور غلبہ والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کی جماعت کو اگر ان پر ناجائز طور پر ناحق حملہ کیا جائے تو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ آیت کریمہ اگرچہ کفار کے متعلق ہے مگر اذنِ جنگ کی علت کفر نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ظلم اور زیادتی (بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا) بتائی گئی ہے جس کا مآل یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاں بھی اور جو بھی ظلماً زیادتی کرے وہاں مسلمانوں کو مدافعت میں جنگ کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ مسلمانوں کی اس جماعت میں مدافعت کی قوت ہو اور کسی بڑے فتنہ اور فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ چونکہ اذنِ جنگ کو کفر پر مبنی نہیں کیا گیا ہے بلکہ ظلم پر مبنی کیا گیا ہے اس لئے اگر مبتدع اور فتنہ پرور جماعت کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم اور زیادتی ہو تو یہی حکم اس وقت

بھی ہوگا۔

ظلم انفرادی بھی ہوتا ہے اور اجتماعی بھی، حسّی بھی ہوتا ہے اور معنوی بھی۔ آیت میں لفظ ظلم عام ہے اور یہ سب اقسام اس کے تحت داخل ہیں۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اگر کسی گروہ کی طرف سے کفر و ضلال کی ترویج کرکے دین اسلام کو نقصان پہنچانے یا اجتماع امت میں انتشار پیدا کرنے یا مملکت اسلامیہ کی قوت کمزور کرنے یا اسی طرح کا کوئی ایسا اجتماعی نقصان یا ایسی اجتماعی تکلیف و اذیت پہنچانے کی کوشش کی جائے جو شرعاً معتدبہ نقصان یا اذیت سمجھا جاتا ہو تو مسلمانوں کی ہر ایسی جماعت کو جس کی تعداد معتدبہ ہو اور جو قتال کی استطاعت رکھتی ہو اس گروہ سے جو کافروں یا اہل بدعت و ضلال کا گروہ ہو قتال کرنا جائز ہے اور آیت اسے اذن قتال دے رہی ہے۔

یہ اذن قتال عام مسلمانوں کو بشرائط مذکورہ دیا گیا ہے جس میں حکومت بھی شامل ہے۔ لیکن یہ اذن خلیفہ یا حکومت کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اصل مخاطب جمہور مسلمین ہیں۔

بغاوت کی مذکورہ بالا تفصیل کے بعد غالباً سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نہ مملکت کے خلاف ہر خروج بغاوت ہے اور نہ ہر خروج میں عامۃ المسلمین کو خروج کرنے والوں سے قتال جائز ہے۔ بلکہ اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے باوجود خلیفۂ وقت کے خلاف خروج کریں (مذکورہ بالا شرائط ذہن میں رہیں)

اور کسی شہر پر قبضہ جمالیں اور امام کی اطاعت سے روگردانی کریں تو حکومت کو چاہیئے کہ ان کو جماعت کا ساتھ دینے کی دعوت دے اور ان کے شبہات کے ازالہ کی کوشش کرے۔ بغاوت فی نفسہٖ کفر کی موجب نہیں ہے۔ وہ مسلمان ہیں اور کسی مسلمان کو بلاوجہ شرعی قتل کر دینا جائز نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ جنگ پہ آمادہ ہوں جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہوں یا جنگ شروع کر دیں اور صلح و صفائی کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں تو ان سے جنگ کی جائے گی اور ان کی جمعیت کو پراگندہ کر دیا جائے گا۔ اگر ان کی باقاعدہ جمعیت ہو تو زخمیوں کو قتل کر دیا جائے گا اور جو شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوں ان کا تعاقب کیا جائے گا تاکہ وہ اپنی جمعیت کے ساتھ مل کر دوبارہ فتنہ و فساد کا باعث نہ بن سکیں۔ لیکن ان کے بچوں اور عورتوں کو گرفتار کرنے اور ان کے ساز و سامان کو مال غنیمت سمجھ کر مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

سورۂ مائدہ میں ہے:-

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

(۵/۳۳)

ترجمہ :۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ انہیں خوب قتل کیا جائے۔ یا سولی پر لٹکا یا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں یا سرزمین اسلام سے ملک بدر کر دیا جائے۔ اس جرم کی وجہ سے ان کیلئے دنیا میں رسوائی اور ذلت ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کرنے کی یہ سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کا رسول باطل پر نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا جس حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ سزا ہے اس کا برحق اور مبنی بر عدل و انصاف ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کسی مسلمان مگر جابر و ظالم حکومت کے خلاف بغاوت کا عَلَم بلند کریں جو حدود اللہ کو قائم نہ کرتی ہو اور انتظام حکومت شرعی احکام کے خلاف چلا رہی ہو، مظلوم کی دادرسی اور ظالم کی سرکوبی کرنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، شعائر اسلامی کی توہین کی مرتکب ہو رہی ہو، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی کھلم کھلا مخالفت کا ارتکاب کر رہی ہو تو ایسی حکومت کے خلاف خروج کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی حکومت کے خلاف خروج کرنے والوں کی یہ سزا نہیں ہے۔

اللہ اور اس کے رسول سے (یعنی مبنی برحق حکومت سے) جنگ اور قانون شکنی، سرزمین اسلام میں فتنہ و فساد پھیلانے

کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ڈاکے ڈالے جائیں، تخریب کاری کی جائے، لوگوں کو قتل کیا جائے۔ اس کی سزا بھی قتل ہے۔ تفصیل باب قطع الطریق میں گذر چکی ہے۔

باغیوں کی تحصیل و وصول

اگر کسی علاقے پر باغی قبضہ کر لیں اور وہاں کے لوگوں سے خراج، عشر، زکوٰۃ وصول کر لیں اور ان سے جنگ کرنے کے بعد اسلامی حکومت باغیوں کا استیصال کر کے پھر اس علاقے پر اقتدار حاصل کرے تو اس علاقے کے لوگوں سے عشر، خراج اور زکوٰۃ دوبارہ وصول نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ اسلامی حکومت کا یہ فریضہ تھا کہ وہاں کے باشندوں کی حمایت و حفاظت کرتی اور باغیوں کی زور زبردستی سے بچاتی۔ اسلامی حکومت اپنا واجب فریضہ ادا نہیں کر سکی یہ اس کا قصور ہے۔ وہاں کے باشندے اس کی سزا کیوں بھگتیں۔ اگر باغیوں نے جو کچھ وصول کیا تھا اسے اس کے جائز مصارف میں صرف کیا ہے تو ظاہر ہے کہ لوگوں کا فریضہ صحیح طور پر ادا ہو گیا اور اگر انہوں نے صحیح مصارف میں صرف نہیں کیا تو حکومت کو تو ان سے دوبارہ وصول کرنے کا حق نہیں، البتہ یہ اللہ اور ان کے درمیان ایک معاملہ ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اپنا خراج، عشر اور زکوٰۃ کی رقوم صحیح مصارف میں دوبارہ خرچ کر دیں۔

(باب الخوارج)

عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے باغیوں کی تفصیل

الخوارج ، خارجۃ کی جمع ہے جو خَرَجَ سے اسم فاعل مؤنث کا صیغہ ہے۔ خَرَجَ کے معنے نکلنے کے ہوتے ہیں۔ خَرَجَ عَلَیْہِ اس نے اس کے خلاف خروج کیا یعنی بغاوت کی۔ خَارِجَۃٌ کے معنے بغاوت کرنے والی جماعت کے ہیں۔ جس کی جمع خَوَارِجُ آتی ہے۔ اَلْخَارِجِیُّ اس آدمی کو کہتے ہیں جو شاہی خاندان سے نہ ہو اور بادشاہ بن جائے نیز اس گھوڑے کو کہتے ہیں جس کے ماں باپ تیز دوڑنے والے نہ ہوں مگر وہ ماں باپ کے خلاف تیز دوڑے ایسے ہی اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو سلطان یا جماعت کی مخالفت پر اتر آئے۔ نیز اس شخص کو بھی جو خارجی فرقوں کے عقائد کو اختیار کرے۔ چنانچہ اسلامی بڑے فرقوں میں سے سات فرقے خوارج کہلاتے ہیں۔ جن کی تفصیل عقائد کی کتابوں میں موجود ہے۔ (المنجد ص ۱۶۹ و تاج العروس و محیط المحیط)

تاریخ اسلام میں خوارج دراصل وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت کے خلاف خروج اور بغاوت کی ہو اور وہ جماعت

سے الگ ہو گئے ہوں۔ اسلام آیا تو تین قسم کی جماعتیں سامنے آئیں۔ ان تینوں کا تذکرہ قرآن کریم نے پہلے ہی پارے (پارہ الٓمٓ) میں کر دیا ہے۔ ایک وہ جنہوں نے اسلام کی دعوت کو شرح صدر کے ساتھ قبول کر لیا۔ یہ مؤمنین ہیں۔ دوسرے وہ جنہوں نے شرح صدر کے ساتھ اسلامی دعوت کا انکار کر دیا۔ قرآن کریم نے انہیں کافر اور کفار کہا ہے۔ تیسرے وہ جو بظاہر حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے لیکن وہ دل سے اسلام نہیں لائے۔ انہیں منافقین کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ ان منافقین ہی میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو وہ جنہوں نے اسلام کو ظاہر میں قبول کر لیا۔ اور انہیں کھلم کھلا اسلام کی مخالفت کی جرأت نہیں ہوئی لیکن وہ درپردہ مخالفین اسلام سے ساز باز کرتے رہے اور اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں کرتے رہے۔ یہ تو منافقین ہی کہلائے انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے کہ انہوں نے کبھی کچھ طاقت حاصل کر لی اور وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہوئے بھی اسلامی حکومت اور اسلامی جمعیت کے خلاف مسلح مزاحمت اور مسلح بغاوت پر اتر آئے۔ یہ لوگ تھے تو منافقین ہی لیکن ان کو تاریخ اسلام نے خوارج کے لقب سے یاد کیا۔ بہرحال یہ منافقین جو اسلام کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے پر اتر آئے خوارج کے لقب سے یاد کئے گئے۔ آگے چل کر انہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اور عام مسلمانوں کے عقائد کے برخلاف انہوں نے چند عقائد میں ان سے اختلاف کیا اور اپنے

لئے کچھ نئے عقائد کا پرچار کیا۔ اور شدہ شدہ مسلمانوں سے ان مختلف مخصوص عقائد رکھنے والوں ہی کو خوارج کہا جانے لگا لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے وہ ان منافقین ہی کا حصہ تھے جنہوں نے اسلامی حکومت اور اسلامی جماعت کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا تھا۔ یہ اس معنے میں بھی خارجی تھے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے بہتر مسلمان ہونے کے مدعی تھے بلکہ وہ اپنے آپ ہی کو مسلمان سمجھتے تھے اور باقی مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے جیساکہ عربوں میں خارجی اس گھوڑے کو کہتے تھے جو اپنے آپ کو اپنے ماں باپ سے بہتر ثابت کرتا تھا کہ جس تیز رفتاری اور عمدگی کا ثبوت اس کے ماں باپ نہیں دے سکے تھے وہ اس کا ثبوت مہیّا کرے اور ان سے بازی لے جائے

خوارج رسول اکرمؐ

ان خوارج کا وجود ہر زمانہ میں رہا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں بھی ان کا وجود ملتا ہے۔ چنانچہ بخاریؒ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:۔

حدثنا عبد اللہ بن محمد قال حدثنا ھشام قال اخبرنا معمر عن الزھری عن ابی سلمۃ عن ابی سعید قال بینا النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقسم جاء عبد اللہ ذو الخویصرۃ التمیمی فقال اعدل یا رسول اللہ قال ویلک من یعدل اذا لم اعدل قال عمر ابن الخطاب ائذن لی

فاضرب عنقہ قال دعہ فان لہ اصحابا یحقر احدکم صلاتہ مع صلاتہ وصیامہ مع صیامہ یمرقون من الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ ینظر فی قذذہ فلا یوجد فیہ شیئ ثم ینظر فی نصلہ فلا یوجد فیہ شیئ ثم ینظر فی رصافہ فلا یوجد فیہ شیئ ثم ینظر فی نضیہ فلا یوجد فیہ شیئ۔ قد سبق الفرث والدم۔ آیتھم رجل احدی یدیہ او قال ثدییہ مثل ثدی المرأۃ او قال مثل البضعۃ تدردر یخرجون علی حین فرقۃ من الناس۔ قال ابو سعید اشھد انی سمعت من النبی صلے اللہ علیہ وسلم واشھد ان علیا قتلھم وانا معہ جیئ بالرجل علی النعت الذی نعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال فنزلت فیہ۔ ومنھم من یلمزک فی الصدقات۔

(صحیح بخاری باب من ترک قتال الخوارج للتألف وألاّ ینفر الناس عنہ ص ۱۰۲۴ ج ۲ مطبوعہ مطبعہ مجتبائی دہلی)

ترجمہ:۔ عبد اللہ بن محمد نے (اپنی سند کے ساتھ) ہم سے ابو سعید خدریؓ سے حدیث بیان کی ---------

اس دوران میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (غنیمت

کا مال) تقسیم فرما رہے تھے عبداللہ ذوالخویصرہ تمیمی آیا اور اس نے کہا: اے رسول اللہ! انصاف کیجئے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا ناس ہو، اگر میں بھی انصاف نہیں کروں گا تو کون انصاف کرے گا؟ حضرت عمر بن الخطابؓ نے آنحضور سے عرض کیا: مجھے اجازت دیجئے میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا اسے چھوڑو۔ اس کے ساتھی ایسے ہیں کہ تم ان کی نماز کے سامنے اپنی نماز کو، ان کے روزوں کے سامنے اپنے روزے کو حقیر سمجھو گے۔ لیکن وہ دین سے اس طرح نکل چکے ہوں گے جیسے کمان سے تیر نکل جاتا ہے کہ اس کے ریش کو دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے، اس کے بھالے میں دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ ملے اس کے بھالے کے نیچے عصب میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے۔ پھر اس کی لکڑی میں دیکھا جائے تو کچھ نہ ملے۔ وہ گوبر اور خون سے صاف نکل جائے۔ ان کی نشانی ایک ایسا آدمی ہوگا کہ اس کا ایک ہاتھ عورت کے ہاتھ کی طرح ہوگا یا یوں فرمایا کہ اس کے سینہ کا ایک ابھار عورت کے پستان کی طرح ہوگا یا یوں فرمایا کہ گوشت کے ایک لوتھڑے کی طرح ہوگا جس میں ایک طرح کی لرزش اور کپکپی ہوگی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے باہم اختلاف کے وقت نکلیں گے۔ ابوسعیدؓ نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں

نے یہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو قتل کیا تھا۔ اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ اس وصف کے مطابق جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا تھا ایک شخص کی نعش حضرت علیؓ کے سامنے لائی گئی تھی۔ اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ "ان منافقوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو آپ کو صدقات کے بارے میں مطعون کرتے ہیں"۔

اس حدیث پر امام بخاری نے "من ترك قتال الخوارج للتألف" کا باب باندھا ہے یعنی "تالیف قلب کی خاطر خوارج سے قتال کرنے کو ترک کر دینا"۔

امام بخاریؒ ہی نے اس سے پہلے "باب قتال الخوارج والملحدین" کے تحت "یعنی خوارج اور ملحدین سے جنگ کرنا" یہ حدیث نقل فرمائی ہے:۔

حدثنا عمر بن حفص بن غیاث قال حدثنا ابی قال حدثنا الاعمش قال حدثنا خیثمة قال حدثنا سوید بن غفلة قال علی اذا حدثتکم عن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فواللہ لان اخر من السماء احب الی من ان اکذب علیہ واذا فیما بینی و بینکم فان الحرب خدعة وانی سمعت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقول

سیخرج قوم فی اٰخر الزمان حداث الاسنان
سفہاء الاحلام یقولون من خیر قول البریۃ
لایجاوز ایمانھم حناجرھم یمرقون من
الدین کما یمرق السھم من الرمیۃ۔ فاینما
لقیتموھم فاقتلوھم فان فی قتلھم اجرًا
لمن قتلھم یوم القیٰمۃ۔

(صحیح بخاری ص ۱۰۲۴ ج ۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ:۔ عمر بن حفص بن غیاث نے (اپنی سند سے)
------ حدیث بیان کی کہ حضرت علیؓ نے فرمایا
جب میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی
حدیث بیان کروں تو اللہ کی قسم مجھے آسمان سے گر پڑنا
اس سے زیادہ پسند ہوگا کہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
پر جھوٹ بولوں۔ اور جب میرے اور تمہارے درمیان
کوئی بات ہو تو (یعنی آپس میں ہمارا کوئی جھگڑا ہو تو
اس میں الزام تراشی یا غلط بیانی ہو سکتی ہے) کیونکہ جنگ
تو یقیناً الزام تراشی اور فریب کا ہی دوسرا نام ہے۔ بہرحال
میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آخری
زمانہ میں ایک قوم ایسی نکلے گی جو نوعمر ہوں گے۔ دانش
میں پرلے درجے کے بیوقوف ہوں گے۔ منہ سے دنیا کی
بہترین باتیں نکالیں گے۔ لیکن ان کا ایمان ان کے حلق سے
نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے ایسے باہر نکل جائیں گے

جیسے تیر کمان سے باہر نکل جاتا ہے۔ تم جہاں کہیں بھی ان
سے ملو، ان کو قتل کرو۔ کیونکہ انہیں قتل کرنے میں قیامت
کے دن بڑا اجر ملے گا۔

ان دونوں حدیثوں پر امام بخاریؒ نے جو باب باندھے ہیں
وہ خوارج ہی سے متعلق ہیں جس سے ہمارے اس موقف کی تائید
ہوتی ہے کہ خوارج کا وجود حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک
عہد سے شروع ہو چکا تھا۔

یہ وہی منافقین اور خوارج تھے جنہوں نے قبا میں کفر
پھیلانے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے اور مخالفین اسلام
کی سازشوں کے لئے ایک پناہ گاہ اور مرکز کے طور پر استعمال
کرنے کے لئے مسجد ضرار بنائی تھی جس کا حق تعالیٰ نے سورۂ توبہ
میں ان الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ
تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ
اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا
اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝
لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى
مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ
رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ
الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
التَّقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ

بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ
نَارِ جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الظّٰلِمِيْنَ ○ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً
فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ (۹/۱۰۷-۱۱۰)

ترجمہ:- اور جن لوگوں نے اس مقصد سے ایک مسجد بنا کر کھڑی کردی کہ وہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں، کفر کریں، مسلمانوں میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکے ہیں۔ وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ (اسلام کی) بھلائی ہو۔ لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں بالکل جھوٹے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا۔ اس بات کی کہ تم اس میں کھڑے ہو (اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں) وہی مسجد حق دار ہے جس کی بنیاد اگلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اُس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں۔ اور اللہ بھی پاک صاف رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے خوف اور اس کی خوشنودی پر رکھی (جو

کبھی ہلنے والی نہیں) یا وہ جس نے ایک کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر اپنی عمارت کی بنیاد رکھی اور وہ مع اپنے مکین کے آتش دوزخ (کے گڑھے) میں جا گری۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ انہیں (کامیابی و سعادت کی) راہ نہیں دکھاتا جو ظلم کا شیوہ اختیار کرتے ہیں۔

یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے (یعنی مسجد ضرار) ہمیشہ ان کے دلوں کو شک و شبہ سے مضطرب رکھے گی (یہ کانٹا نکلنے والا نہیں) مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ ان کے نفاق کی بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں (اس لئے ہمیشہ اس کی وجہ سے خوف و ہراس کی حالت میں رہیں گے) اور اللہ سب کا حال جاننے والا، اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

پیغمبر اسلام جب مدینہ منورہ میں آئے، تو پہلے قبا نامی مقام میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے حکم سے ایک مسجد تعمیر ہوئی تھی جو عہد اسلام کی پہلی مسجد ہے۔ بعض منافقوں نے جن کی تعداد بعض روایات سے بارہ[12] ثابت ہوتی ہے، اسی مسجد کے پاس ایک نئی مسجد تعمیر کی، اور جب پیغمبر اسلام تبوک کے لئے نکل رہے تھے تو آپ کی خدمت میں آکر عرض کیا۔ ایک دن وہاں آکر نماز پڑھا دیجئے۔ آپ نے فرمایا ابھی تو سفر درپیش ہے۔ واپسی پر دیکھا جائے گا۔ پھر جب آپ تبوک سے واپس ہوئے اور

مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو آیت نازل ہوئی اور اللہ نے بانیان مسجد کے منافقانہ مقاصد سے آپ کو مطلع کر دیا۔ آپ نے فوراً حکم دیا کہ یہ مسجد گرا دی جائے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ مدینہ پہنچیں مسجد منہدم کر دی گئی۔

اس آیت میں منافقوں کی مسجد کے چار مقصد بیان گئے گئے ہیں:۔

(ا) "ضِرَارًا" یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر مخلص مؤمنوں کو نقصان پہنچائیں۔

(ب) "وَكُفْرًا" کفر کے مقاصد پورے ہوں۔ معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد اور نیت پر موقوف ہے۔ ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر کے لئے ہو جاتا ہے۔

(ج) "وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ" مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی۔ اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بنے گی، تو جماعت بٹ جائے گی، کچھ لوگ پچھلی مسجد میں جائیں گے، کچھ نئی مسجد میں اور جب ایک جماعت نہ رہی، تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے۔

(د) "وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ" اللہ اور اس کے رسول سے جن لوگوں نے جنگ کی، ان کے لئے ایک کمین گاہ پیدا کر دی جائے۔ یا اس کے انتظار و توقع میں

پہلے سے ایک محفوظ جگہ بنا دی جائے۔ یعنی دشمنانِ اسلام کے لئے جن سے یہ لوگ ساز باز رکھتے تھے، ٹکنے کی ایک جگہ پیدا ہو جائے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک آدمی ابو عامر راہب تھا جو ظہور اسلام سے پہلے عیسائی ہو گیا تھا۔ جب پیغمبر اسلام مدینہ تشریف لائے تو کلمۂ اسلام کا عروج اس پر شاق گذرا اور وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے قریشِ مکہ کا ساتھ دیا، پھر شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی۔ قبا کے بعض منافقین میں اور اس میں قدیم سے رسم و راہ تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا۔ یہاں "لِمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ" سے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۴۱-۱۴۲)

حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ:۔

"بدر کی لڑائی میں بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب رکھا تو ابو عامر پر یہ بات بہت شاق گذری اور کھلم کھلا عداوت ظاہر کرنے لگا اور مدینہ سے بھاگ کر کفار مکہ اور مشرکین قریش سے جا ملا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کرنے پر مائل کرتا تھا۔ اب عرب کے سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے اور جنگ احد کے لئے پیش قدمی کی۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو ضرر پہنچا۔۔۔ اس فاسق نے دونوں طرف کی صفوں کے درمیان کئی گڑھے کھود

رکھے تھے۔ ان میں سے ایک میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم گر پڑے آپ کو مضرت پہنچی۔ آپ کا چہرہ زخمی ہوگیا۔ نیچے کی طرف سے سامنے کے چار دانت آپ کے ٹوٹ گئے، سر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زخمی ہوگیا۔۔۔۔۔۔ اسلام بڑھتا چلا جارہا تھا تو وہ ملک روم ہرقل کے پاس گیا۔ اس سے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے برخلاف مدد مانگی۔ اس نے وعدہ کرلیا۔ اس نے اپنی امیدیں کامیاب ہوتی دیکھیں تو ہرقل کے پاس ٹھہر گیا اور اپنی قوم انصار میں سے ان لوگوں کو مدینہ بھیجا جو اہل نفاق تھے کہ لشکر لے کر آرہا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خوب جنگ ہوگی۔ ان پر غالب آجاؤں گا اور انہیں اپنی اسلام سے پہلے کی سابقہ حالت پر آنا پڑے گا اور ان اہل نفاق کو حکم بھیجا کہ اس کے لئے پناہ کی جگہ بنائے رکھو اور میرے احکام اور مراسلے جو لے کر آیا کریں ان کے لئے قیام گاہ اور مامن بنائے رکھو تاکہ اس کے بعد جب وہ خود آئے تو اس کے لئے کمین گاہ کا کام دے۔ چنانچہ ان منافقین نے مسجد قبا کے قریب ہی ایک اور مسجد بنا ڈالی۔ اس کی تعمیر کردی اور اس کو پختہ کردیا۔۔۔۔۔۔ ابو عامر نے ان سے کہا کہ تم ایک مسجد بناؤ اور جس قدر بھی تم سے ممکن ہو اس میں ہتھیار اور سامانِ جنگ چھپائے رکھو۔ کیونکہ میں قیصر ملک روم کی طرف جارہا ہوں، اُدھر سے لشکر لے کر آؤں گا۔ اور محمد اور ان کے اصحاب کو مدینے سے نکال دوں گا۔" اھ

(تفسیر ابن کثیر پارہ ۱۱ ص ۱۳ مطبوعہ نور محمد کراچی)

تصریحات بالا سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ "مسجد ضرار" بنانے والے دراصل وہی منافقین تھے جو مسلح بغاوت کرنا چاہتے تھے اور مملکت اسلامیہ کے خلاف خروج کی سوچ رہے تھے۔ انہوں نے بظاہر ایک مسجد بنائی تھی، لیکن ان کا اصل مقصد اسلام کے خلاف اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے لئے ایک مرکز، ایک کمین گاہ اور ایک پناہ گاہ بنانا تھا جہاں ان کے اجتماعات ہوسکیں اور ابو عامر راہب کے گماشتے اور قاصد جو اس کے احکام اور پیغامات لے کر آتے تھے وہاں قیام کرسکیں اور جہاں مسلح جدوجہد کے لئے اسلحہ اور سامانِ جنگ کا ذخیرہ کرسکیں۔ لہٰذا یہ مسجد دراصل خوارج (باغیوں) کا مرکز تھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہدم کرا کے اس میں آگ لگوادی۔

خوارج صدیق اکبرؓ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتخاب بحیثیت خلیفۂ رسول اللہ عمل میں آگیا تو انہی خوارج (باغیوں) کے ٹولے نے حکومت اسلامیہ کے خلاف فتنۂ ارتداد کی صورت میں خروج کیا۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اعلاء السنن میں فرماتے ہیں:-

قال القاضی عیاض وغیرہ کان اھل الردۃ ثلثۃ اصناف۔ صنف عادوا الی عبادۃ الاوثان

وصنف تبعوا مسيلمة والاسود العنسي فقاتلهم
عمال النبي صلى الله عليه وسلم في خلافة ابي بكر
واما مسيلمة فجهز اليه ابوبكر الجيش وعليهم
خالد ابن وليد فقتلوه - وصنف ثالث استمروا
على الاسلام لكنهم جحدوا الزكوة وتأولوا
بانها خاصة بزمن النبي صلى الله عليه وسلم
لقوله تعالى "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ
وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ
سَكَنٌ لَّهُمْ" فزعموا ان دفع الزكوة خاص
بالنبي صلى الله عليه وسلم لان غيره لا
يطهرهم ولا يصلي عليهم فكيف تكون صلوته
سكنا لهم - قلت وصنف رابع اقروا بوجوب
الزكوة ولم يتأولوا كتاويل الصنف الثالث
ولكنهم منعوا شحابا موالهم وكثروا سواد
الجاهدين ونصبوا القتال المسلمين كما نصبوا
وهم الذين ناظر عمر ابا بكر في قتالهم كما
وقع في حديث الباب الخ

(اعلاء السنن ص ۴۵۸/۱۲ مطبوعہ سیر آرٹ پریس کراچی)

ترجمہ :- قاضی عیاضؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ مرتدین کی تین اصناف (انواع) تھیں - ایک صنف تو وہ تھی جو (اسلام سے مرتد ہو کر) بت پرستی کی طرف لوٹ گئی تھی - اور ایک

قسم وہ تھی جنہوں نے مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کا اتباع کر لیا تھا - ان سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے گورنروں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں جنگ کی - اور مسیلمہ کذاب کی طرف تو حضرت صدیق اکبرؓ نے باقاعدہ فوج کشی کی تھی جن کے سردار حضرت خالد بن ولیدؓ تھے - چنانچہ انہوں نے اسے قتل کر دیا - اور تیسری نوع وہ تھی جو بظاہر اسلام پر تو مستقیم رہی لیکن انہوں نے زکوٰۃ کا انکار کر دیا اور اس کی تاویل یہ کی کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا - کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے پیغمبر! ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو - اس طرح انہیں پاک کرو اور ان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاؤ اور ان کے لئے دعا کرو - یقیناً آپ کی دعا ان کے لئے باعث سکون ہے" انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ دینا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص تھا - کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کوئی نہ تو انہیں پاک کر سکتا تھا اور نہ ان کے لئے ویسی دعا کر سکتا تھا تو ان کی دعا ان کے لئے کیسے باعث سکون ہو سکتی تھی - میں کہتا ہوں ایک چوتھی قسم بھی تھی جو وجوب زکوٰۃ کا اقرار کرتے تھے اور تیسری قسم کی طرح کوئی تاویل بھی نہیں کرتے تھے لیکن انہوں نے اپنے اموال

پر حرص کی وجہ سے زکوٰۃ روک لی تھی اور منکرین کی
جماعت کی کثرت کا باعث بنے تھے۔ اور مسلمانوں سے
جنگ کے لئے اسی طرح آمادہ ہو گئے تھے جیسے دوسرے
منکرین۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے
حضرت ابو بکرؓ سے ان سے جنگ کرنے کے بارے میں
بحث کی تھی۔ جیسا کہ اس باب کی حدیث میں آیا ہے۔

یہ چاروں گروہ مسلح بغاوت پر آمادہ تھے۔ آمادہ ہی نہیں
تھے بلکہ عملی اقدام کر چکے تھے۔ جیسا کہ ہم نے "احکام مرتد" کے
باب میں تاریخ طبری سے نقل کیا ہے:۔

ان الارض کافرۃ وقد رأیٰ وفدھم منکم
قلۃ۔ وانکم لا تدرون ایلاً تؤتون ام
نھاراً۔ وادناھم منکم علی برید وکان
القوم یأملون ان نقبل منھم ونواعدھم
وقد ابینا علیھم ونبذنا الیھم عھدھم
فاستعدوا واعدوا فما لبثوا الا ثلاثا حتی
طرقوا المدینۃ غارۃ مع اللیل وخلفوا بعضھم
بذی حسیً لیکونوا لھم ردأً۔

(تاریخ طبری ص ۱۸۷۴/۲ مطبوعہ یورپ)

ترجمہ:۔ ساری سرزمین (عرب) کفر کے آغوش میں
چلی گئی ہے اور ان کے وفد نے تمہاری قلت تعداد دیکھ
لی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں

یا دن کو۔ اور ان کا قریب ترین لشکر تم سے ایک برید
(منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلہ پر ہے۔ اور ان لوگوں
کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات مان لیں گے۔
اور ان سے معاہدہ کر لیں گے مگر ہم نے انکار کر دیا
اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا۔ وہ جنگ کے لئے
تیار ہو گئے۔ لہٰذا تم بھی تیاری کرو۔ پھر تین دن
ہی گذرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر رات کے
وقت ہلّہ بول دیا اور اپنی ایک جمعیت کو ذی حسیٰ کے
مقام پر اپنی پشت پر چھوڑ دیا تاکہ وہ ان کے پشت پناہ
ثابت ہوں۔

چنانچہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ابتداء عہد خلافت
میں ایسا نہیں ہے کہ ان خارجیوں کا گروہ نا پید ہو گیا ہو۔ بلکہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات حسرت آیات کے بعد ان کی
سرگرمیاں تیز سے تیز تر ہو گئی تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھا تھا اور
کچھ غلط نہیں سمجھا تھا کہ جن تحریکوں کا مدار شخصیتوں پر ہوتا ہے
وہ تحریک کے سربراہ کے بعد ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ اسلامی تحریک
کا مدار بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی شخصیت پر ہی تھا۔
اور دینی تحریکات کا مدار تو نبی اور رسول کی شخصیت پر ہی ہوتا
ہے۔ لہٰذا نبی اور رسول کی شخصیت اوجھل ہو جانے کے بعد اسے
ختم کر دینا آسان ہو گا۔ عرب جو صدیوں سے قبائلی نظام کے خوگر
چلے آرہے تھے ان کے قدیم نظریات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی

آنکھیں بند ہوتے ہی انگڑائیاں لینی شروع کر دیں۔ اور قبائلی تصورات پھر جاگ اٹھے۔ انہیں یہ چیز انتہائی ناگوار تھی کہ کوئی قبیلہ دوسرے قبیلہ کا محکوم اور تابع فرمان ہو۔ وہ فطری اور جبلی طور پر آزاد چلے آرہے تھے اور ایک واحد نظامِ مملکت کے ماتحت زندگی گذارنا انہیں گوارہ نہیں تھا۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اتنی بلند و بالا تھی کہ ان کے طبعی اور جبلّی تصورات کو پرپرزے نکالنے کا آپ کی حیات طیبہ میں موقعہ نہیں مل سکتا تھا اور نہیں ملا۔ اُنہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اسلام کا مدار کسی ایک شخصیت پر نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عظیم تربیت سے ایک ایسی ملّت کی تشکیل فرمادی ہے جو آپ کے بعد بھی اس تحریک کو ارتقا سے ہمکنار کر سکتی ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خطبہ سے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد اتنا ہمہ گیر تھا کہ اکثر سرزمین عرب کفر کے آغوش میں جا چکی تھی۔ ان میں سے کچھ لوگ تو ایسے تھے جو اپنے آبائی دین، یعنی کفر و شرک اور اصنام پرستی کی طرف لوٹ گئے تھے۔ عرب جاہلیت کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کے ہر قبیلہ کا ایک بت ہوتا تھا اور کوئی قبیلہ اپنے بت کو چھوڑ کر کسی دوسرے قبیلے کے بت کے سامنے سرنگوں ہونا اپنے قبیلہ کی توہین سمجھتا تھا۔ اسلام لانے کے بعد ان کی یہ قبائلی عصبیت چند روز میں

ختم نہیں ہو سکتی تھی اور نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق قریش کے خاندان سے تھا۔ قریش کے ایک فرد نے "اَللّٰہُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ" کی آواز بلند کی تھی۔ لہٰذا ان کی نگاہوں میں یہ ایک قریشی پیغمبر کا دین تھا غیر قریش اس کی پیروی کیوں کریں۔ لہٰذا ہر قبیلہ کو اپنے اپنے قبیلہ کا بت یاد آنے لگا۔ اور انہوں نے اپنی قبائلی عصبیت کی تسکین اسی میں پائی کہ وہ اپنے قبائلی بت کی پرستش شروع کر دیں۔

اُدھر کچھ طالع آزماؤں نے دیکھا کہ محمد قریشی نے ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارے عرب سے اپنے اس دین کو منوالیا اور سب اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ کل جدید لذیذ (ہر نئی چیز مزیدار ہوتی ہے) کے مطابق عوام ہمیشہ ہر نئی چیز کی طرف لپکتے ہیں۔ محمد عربی ایک انسان ہی تو تھے اگر وہ اپنے مشن میں اس قدر کامیاب ہو سکتے ہیں تو ہم کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے چنانچہ متعدد مدعیانِ نبوت نے مذہب سازی کا کاروبار شروع کر دیا۔ ان میں سے مسیلمہ کذاب، اسود عنسی، سجاح وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان کے قبیلوں نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور ان کی متابعت شروع کر دی۔ قبیلہ پرستی کی انتہا، یہ تھی کہ مسیلمہ کذاب کو اس کے ماننے والے خود بھی جھوٹا نبی سمجھتے تھے لیکن بغیر کسی جھجھک کے وہ علانیہ کہتے تھے:۔

کذاب ربیعة احب الینا من صادق مضر۔

(صدیق اکبر صـ۱۶۲)

ترجمہ :۔ (ہمارے قبیلے) ربیعہ کا کاذب ترین (نبی) ہمیں قبیلۂ مضر کے صادق (نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ پسند ہے۔

مسیلمہ کذاب محض دنیوی اقتدار و حکومت کا بھوکا تھا امام بخاریؒ نے ایک مفصل روایت میں مسیلمہ کذاب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں :۔

فجعل یقول : ان جعل لی محمد من بعدہ تبعتہ۔

ترجمہ :۔ مسیلمہ کہنے لگا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے بعد حکومت میرے لئے کردیں تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرلوں گا۔

لیکن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ خواہش پوری نہیں کی۔ چنانچہ اس کے بعد ہے :۔

وقدمھا فی بشر کثیر من قومہ فاقبل الیہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ومعہ ثابت بن قیس بن شماس وفی ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قطعة جرید حتی وقف علی مسیلمة فی اصحابہ فقال لو سألتنی ھذہ القطعة ما اعطیتکھا۔

(صحیح بخاری صـ۶۲۸ ج۲ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی)

ترجمہ :۔ وہ اپنی قوم کے بہت سے آدمیوں کے ساتھ مدینہ میں آیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور آپ کے ساتھ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ (خطیب انصار) بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں کھجور کی ٹہنی کا ایک ٹکڑا تھا۔ آپ مسیلمہ کے پاس کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے ساتھیوں میں بیٹھا تھا۔ تو آپ نے اس سے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے یہ ٹہنی کا ٹکڑا بھی مانگے تو میں اسے تجھے نہیں دوں گا۔

چنانچہ مسیلمہ ناکام و نامراد واپس ہوا اور اپنے قبیلہ میں جاکر اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی ایک حکومت قائم کرلی۔ وہ خود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ کہتا تھا، اور خلیفۂ رسول کے لئے پیغمبرانہ خصوصیات کا حامل امام ہونا ضروری سمجھتا تھا یہی وجہ ہے کہ اپنے نبی ہونے کے ساتھ وہ اپنے لئے خلافت کا لقب بھی استعمال کرتا تھا اور اپنے آپ کو امیر المؤمنین کہلواتا تھا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت ابن عمرؓ کا یہ قول مسیلمہ کذاب کے قتل کے سلسلہ میں نقل کیا ہے :۔

فاخبرنی سلیمان بن یسار انہ سمع عبد اللہ بن عمرؓ یقول فقالت جاریة علی ظھر بیت امیر المؤمنین قتلہ العبد الاسود۔

(بخاری کتاب المغازی باب قتل حمزہؓ ج۲ صـ۵۸۳)

ترجمہ :۔ تو مجھے سلیمان بن یسار نے بتایا کہ انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو فرماتے ہوئے سنا : تو مکان کی چھت پر چڑھ کر ایک کنیز نے یہ اعلان کیا کہ "امیرالمومنین کو ایک حبشی غلام (وحشی) نے قتل کر دیا ہے"۔

مسیلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا منکر نہیں تھا۔ اسی لئے اپنی اذان میں اشھد ان محمداً رسول اللہ کہلواتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے لئے نبی کی برابری کا مدعی تھا۔ اس لئے اس کے بعد اشھد ان مسیلمۃ رسول اللہ بھی کہلواتا تھا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ طبری)

مسیلمہ کذاب کا قبیلہ نہایت شجاع، زور آور اور جنگجو واقع ہوا تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک جرار لشکر سے اس سے یمامہ کے مقام پر جنگ کی اور بڑے گھمسان کی جنگ ہوئی کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ اگرچہ اسلامی لشکر کامران و کامیاب ہوا لیکن بے شمار آدمیوں سے اسے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ یہ جنگ یمامہ ہی تھی جس میں قرآن کریم کے حفاظ اور قراء کی بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی اور حضرت عمرؓ کو یہ فکر دامن گیر ہوگئی کہ قرآن کریم کے حفاظ و قراء یونہی شہید ہوتے رہے تو قرآن پڑھانے والے ختم ہو جائیں گے اور انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے اصرار کیا کہ قرآن کریم کے تحریر کردہ نسخے زیادہ سے زیادہ تیار کئے جائیں۔

تیسرا گروہ منکرین زکوٰۃ کا تھا۔ جو کہتے تھے کہ زکوٰۃ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص تھی۔ زکوٰۃ کے علاوہ وہ دوسرے احکام اسلامی کے منکر نہیں تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ کے منکر نہیں تھے۔ حج بھی کرتے تھے اور باقی تمام احکام پر عمل پیرا تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ حق تعالےٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے :۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (۹/۱۰۳)

ترجمہ :۔ اے پیغمبر! ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو۔ انہیں پاک کرو، اور اس کے ذریعہ سے ان کی نشوونما کا سامان کرو اور ان کے لئے دعا کرو یقیناً ان کے لئے آپ کا دعا فرمانا سکون کا باعث ہے۔

اس آیت کریمہ میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ کسی اور کو نہیں ہے۔ آپ اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ آپ اس کے ذریعہ سے ہمیں پاک کرتے تھے۔ ہماری نشوونما اور بالیدگی کا سامان کرتے تھے۔ ہمارے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ آپ کی دعائیں ہمارے لئے باعث سکون تھیں۔ نبی کے علاوہ دوسرے لوگ نہ تو ہمیں پاک کر سکتے ہیں نہ ہماری روحانی بالیدگی کا کوئی سامان کر سکتے ہیں۔ نہ ان کی دعاؤں میں وہ

تاثیر ہے جو آپ کی دعاؤں میں ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمارے لئے باعث سکون ہوا کرتی تھیں۔ یہ تمام خصوصیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں تھیں۔ اب جو لوگ بھی سربراہِ مملکت چنے جائیں وہ نبی اور رسول نہیں ہیں نہ خصائص نبوی کے حامل ہیں۔ لہٰذا وہ زکوٰۃ کا انسٹی ٹیوشن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قائم تھا، خود بخود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔

چوتھا گروہ ان لوگوں کا تھا جو زکوٰۃ کی فرضیت کا منکر نہیں تھا۔ لیکن جاہلیت کے تصور کے مطابق ایک قبیلہ اگر کسی دوسرے قبیلے کو کچھ مقررہ رقم ادا کرتا تھا تو دراصل یہ جنگ کے بعد اپنی ہزیمت اور مغلوبیت کا ایک تاوان ہوتا تھا چنانچہ یہ محکومیت اور تابع فرمان ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ جس قبیلہ کو یہ رقم ادا کی جاتی تھی وہ قبیلہ غالب اور حاکم ہوتا تھا جسے یہ تاوان ادا کیا جاتا تھا۔ عرب قبائلی عصبیت کے ماتحت ہر قبیلہ اس میں اپنی ذلت سمجھتا تھا کہ وہ کسی دوسرے قبیلے کو کسی قسم کا تاوان ادا کرے۔ زکوٰۃ جو الٰہی فریضہ تھا اور جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ جس قبیلے سے صدقات و زکوٰۃ کی کچھ رقم وصول کی جائے وہ اسی قبیلے کے نادار اور غریب طبقے کی امداد پر خرچ کی جائے۔ یہ بات ان سرمایہ داروں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ اس طرح تو پسماندہ طبقات ہمارے برابر ہو جائیں گے۔ پھر ہم ان سے اپنی مرضی کے مطابق

کس طرح خدمت لے سکیں گے۔ حق تعالیٰ نے غریب اور نادار طبقہ کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ مالدار اور سرمایہ دار طبقہ کی خدمت کریں۔ اور سرمایہ دار طبقہ ان سے خدمت لے سکے۔ معیشت کا کاروبار ہی اس طرح چلتا ہے کہ کچھ لوگ خدمت کریں اور کچھ لوگ مخدوم ہوں۔ اگر سب کے سب برابر ہو گئے تو سرمایہ داری کا سارا نظام ہی چوپٹ ہو جائے گا۔ ان کا قول ہی یہ تھا جو حق تعالیٰ نے سورۂ یٰسٓ میں نقل فرمایا ہے۔

اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (۳۶/۴۷)

ترجمہ:۔ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جنہیں (اللہ ہی نے نہیں کھلایا۔ جنہیں) اللہ اگر چاہتا تو خود کھلا سکتا تھا (کہ ان کو بھی ہماری طرح دولت مند بنا دیتا) تم لوگ تو کھلی گمراہی میں مبتلا ہو۔

ایک طرف مال کی محبت اور دوسری طرف اسلامی حکومت کے سربراہ کو جو ان کے قبیلے کے بجائے کسی دوسرے قبیلے کا آدمی تھا زکوٰۃ کی رقوم ادا کرنا ان کے خیال میں تاوان تھا جو وہ حاکم قبیلے کو ادا کریں۔ یہ ان کے قبائلی شعور کی توہین تھی۔ اس لئے وہ مملکت کو زکوٰۃ یا صدقات کی صورت میں کچھ بھی ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس چوتھے گروہ کے خلاف فوجی کارروائی سے حضرت عمرؓ کو اختلاف تھا۔

مملکت اسلامیہ کے خلاف علَم بغاوت بلند کرنے والے

عرب کے یہ چار گروہ تھے جن کے نظریات اور مطمح نظر ایک دوسرے سے اگرچہ مختلف تھے۔ لیکن چونکہ چاروں گروہوں کو اسلامی مملکت کے خلاف جدوجہد کرنی تھی اور اس مقصد میں سب متحد و متفق تھے اس لئے چاروں گروہوں نے اس مقصد کے لئے ایک متحدہ محاذ بنالیا تھا اور سب ایک دوسرے کے ممد و معاون بن گئے تھے اور مسلح تصادم کے لئے آمادۂ پیکار تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خیال تھا کہ فی الحال تیسرے اور چوتھے گروہ کے خلاف فوجی کارروائی نہ کی جائے۔ وہ توحید و رسالت کی شہادت دے رہے ہیں۔ کسی اسلامی فریضے کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرؓ کی تجویز رد فرمادی اور ان کو بطور سرزنش کے فرمایا:

اجبار فی الجاھلیۃ وخوار فی الاسلام۔

ترجمہ: جاہلیت کے زمانہ میں تو بڑے سورما بنتے تھے۔ اسلام میں بزدل بنے جارہے ہو۔

وہ عربوں کے اس اقدام اور اس سے پیدا ہونے والے دور رس نتائج سے بخوبی آگاہ تھے اس لئے آپ نے فرمایا کہ جو بھی صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا آپ کی اس بصیرت قلبی پر صحابۂ کرامؓ کا اجماع ہوگیا اور سب نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کرلیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ طائف اور مزید ایک آدھ جگہ کے علاوہ سارا

عرب اس فتنہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ یہ اسلام کے لئے نازک ترین لمحہ تھا جس میں اسلام اپنی موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ اسلام کی نیا بیچ منجھدار میں ڈول رہی تھی کہ اب غرقاب ہوئی کہ تب غرقاب ہوئی۔ یہ مسلمانوں کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ایسے وقت میں ایک ایسا قائد میسر آگیا تھا۔ جس کے عزم و استقلال اور ثبات قدمی کے آگے حضرت عمرؓ جیسا کوہ آسا ہمت و حوصلہ کا مالک بھی پانی بھرتا نظر آتا ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ بقول تاریخ نگاروں کے اسلام کی حالت اس بکری کی سی ہوگئی تھی جو موسم سرما کی بارش میں کھڑی بھیگ رہی ہو اور جسے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ ملے۔ [1]

(تاریخ طبری ص ۴۶۱ ج ۳)

---

[1] ماتم کیجئے ان بے بصیرت راویوں کی دین و دانش کا جو اس قسم کی روایات نقل کرتے ہیں کہ اسلام کے ایسے نازک وقت میں جبکہ اسے اپنی بقا اور فنا کا سوال درپیش تھا بنو ہاشم کے سربرآوردہ حضرات اسلامی مملکت کے متزلزل گھنڈرات کی بنیاد پر اپنی خلافت کا محل تعمیر کرنے کے درپئے تھے۔ اور حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنے وفات یافتہ خسر، بھتیجے اور باپ کی وراثت کے دعوے لے کر کھڑے ہوگئے تھے۔ تاکہ مسلمانوں کو بیرونی خطرات کے ساتھ ساتھ اندرونی خلفشار میں بھی مبتلا کردیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے خیال میں یہ ساری روایتیں جعلی اور بناوٹی ہیں جو ان صحابۂ کرام پر بہت بڑا بہتان ہیں۔ اس وقت یہ

بہر حال یہ زبردست خارجی (باغیانہ) تحریک تھی جس کا مقصد اسلامی مملکت کا تختہ الٹنا ہی نہیں تھا بلکہ خود اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا وہی منافقین تھے جو خود عہد رسالت مآب میں بھی پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقین سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ سورۂ توبہ میں ارشادِ الٰہی ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (۹/۷۳)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان کے خلاف سختی کیجئے۔

چنانچہ منافقین کے خلاف جنگ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد ہی میں شروع ہو چکی تھی جس کی تکمیل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوئی اور مسلمانوں نے متحد و متفق ہو کر ان کا زور بڑی حد تک توڑ دیا اور اسلامی مملکت کو ثبات و استحکام عطا کر دیا جس کی بنیاد پر آگے چل کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شاندار حکومت کی تعمیر فرمائی۔ یہ منافقین جنہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے

تمام حضرات تو اسلام کی نیّا کو چاروں طرف سے ہجوم کر کے آنے والے متلاطم طوفانوں سے بچا کر کنارے پر لگانے میں مصروف تھے۔ اس وقت انہیں ان پیش پا افتادہ ذاتی مفادات سے نہ کوئی سروکار ہو سکتا تھا، نہ تھا۔

عہد میں زبردست بغاوت کا علَم بلند کیا تھا خوارج ہی تھے۔ خوارج ایک مخصوص عقائد کے پیرو ہونے کی حیثیت سے تو بعد میں چل کر روشناس ہوئے۔ لیکن شروع میں وہ منافقین جو حکومت کے خلاف مسلح خروج کرتے تھے وہی خوارج کہلاتے تھے۔ چنانچہ یہ سب خوارج ہی تھے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت کچھ طویل عرصہ پر محیط نہیں ہے وہ صرف اڑھائی سال کا مختصر ترین عرصہ ہے لیکن اس مختصر ترین عرصہ میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کے تصور سے بھی حیرت ہوتی ہے۔ سارا عرب فتنۂ ارتداد کی گرفت میں آچکا تھا۔ ان سے نمٹنا آسان کام نہیں تھا۔ ان کے چار بڑے بڑے گروہ تھے۔ کچھ تو اپنے آبائی دین کی طرف لوٹ گئے تھے۔ کچھ جھوٹے مدعیانِ نبوت کے پھندے میں پھنس چکے تھے۔ کچھ زکوٰۃ سے انکار کر رہے تھے کچھ زکوٰۃ کی فرضیت کے تو منکر نہیں تھے مگر مرکز حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور ہر ایک گروہ کے متبعین کثیر تعداد پر مشتمل تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ چند مقامات کو چھوڑ کر اکثر جزیرۃ العرب اس کی گرفت میں آچکا تھا۔ خوارج (باغیوں کے) اس زبردست فتنہ کو فرو کرنا اور اس کے ساتھ ہی ان فتنوں کو بھڑکانے والی ایران اور روم کی صدیوں پرانی مستحکم حکومتوں سے بھی نبرد آزمائی کی ابتداء کر دینا بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔ (واضح رہے

کہ اسلام خواہ مخواہ دوسرے غیر مسلم ممالک پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ خوارج کی اس شورہ پستی کی امداد و اعانت ایران و روم کی حکومتوں کی طرف سے مسلسل ہو رہی تھی اور اس قسم کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں کہ ایرانی اور بازنطینی حکومتیں اسلام کے خلاف حملے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور ان کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ ہوا چاہتا ہے جس کی روک تھام کے لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو عملی اقدام کرنا پڑا تھا) اور ان تمام محاذوں پر پیہم کامیابیاں حاصل کرتے چلا جانا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے مثال شجاعت، بصیرت، دور اندیشی اور فراست ایمانی کی دلیل ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا ہی احسان تھا کہ ایسے وقت میں حق تعالیٰ نے ملّت اسلامیہ کو ایسا سربراہ عطا کر دیا۔ ورنہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اگر اس جلیل القدر منصب پر کوئی اور شخص فائز ہوتا تو وہ ان تمام مشکلات سے اس قلیل ترین عرصے میں عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بے پناہ صلاحیت کا ثبوت ہے۔

خوارج فاروق اعظمؓ

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوئے۔ ان کا دورِ خلافت بظاہر نہایت کامیاب رہا اور روز افزوں فتوحات و غنائم سے مسلمان ایک عظیم طاقت بنتے چلے گئے ہر طرف

خوش حالی اور فارغ البالی کا دور دورہ ہو گیا۔ بظاہر خوارج (باغیوں) کے فتنہ نے ان کے عہد میں سر نہیں اُبھارا لیکن زیر زمین سازشیں اور ریشہ دوانیاں ان کے دور میں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن خوارج (باغیوں) کو کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ مؤطا امام محمدؒ میں حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت موجود ہے:۔

عن سالم بن عبد الله قال قال عمر رضی الله عنه لو علمت ان احدا اقوی علیٰ هٰذا الامر منی لکان ان اقدم فیضرب عنقی اهون علی۔ فمن ولی الامر بعدی فیعلم ان سیرده عنه القریب والبعید وایم الله ان کنت لاقاتل الناس عن نفسی۔

(مؤطا امام محمدؒ باب النوادر ص۴۰۰)

ترجمہ:۔ حضرت سالم بن عبداللہ (حضرت عمرؓ کے پوتے) فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے سے زیادہ کسی شخص میں اس امر (خلافت) کی زیادہ قوت و صلاحیت دیکھتا تو میرے لئے اپنی گردن کٹوا دینا اس منصب کو قبول کرنے سے زیادہ آسان ہوتا۔ لہٰذا جو شخص میرے بعد اس منصب پر فائز ہو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے نزدیک اور دور کے سب لوگ ہی اس منصب سے ہٹانے کی کوشش

کریں گے اور مجھے بھی اپنے نفس کی طرف سے لوگوں سے
نبرد آزما رہنا پڑا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے دو باتیں واضح ہیں۔
اول تو یہ کہ حضرت عمرؓ منصب خلافت کے ہرگز خواہشمند نہیں تھے
بلکہ انہوں نے اس منصب کو اس مجبوری سے قبول کیا تھا کہ
ملّتِ اسلامیہ میں اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر کوئی زیادہ
باصلاحیت اور قوی تر شخص موجود نہیں تھا۔ اگر حضرت عمرؓ اس
منصب کو قبول نہ فرماتے تو مسلمانوں کو نہ معلوم کس قدر مشکلات
سے گذرنا پڑتا۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ یہ صرف حضرت عمرؓ کا ارشاد
ہی نہیں ہے بلکہ تمام اہل الرائے حضرات، (دورِ اول سے آج
تک) اس کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ وہ اسلام کے دوست ہوں
یا دشمن سب اس پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ کا ثانی آج تک پیدا
نہیں ہوا، اور ان کا انتخاب بالکل صائب اور صحیح تھا۔

دوسری بات جو حضرت عمرؓ نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اس
کے باوجود انہیں بھی مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا رہا ہے اور
انہیں بھی اپنے نفس کی طرف سے شورش پسندوں سے نبرد آزما
رہنا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ انتباہ
فرما رہے ہیں کہ دور اور نزدیک کے سب لوگ اس کو رد کرنے
کی کوشش کریں گے لہٰذا اسے برابر چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔

بہر حال مؤطا امام محمدؒ کی اس روایت سے یہ تو معلوم ہوگیا
کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دَور میں بھی ان کے خلاف مسلسل

سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن ہمارے مؤرخین نے ان سازشوں
کی کوئی تفصیل نہیں دی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت عمرؓ
کا دورِ خلافت انتہائی کامیاب رہا تھا۔ ان کی کامرانیوں اور
کامیابیوں کے سامنے ان سازشوں اور در پردہ ریشہ دوانیوں
کی کوئی بڑی اہمیت نہیں تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ جب
تدوین و تصنیف کا دور آیا تو قلم اُن ہی مصنفین یعنی عجمیوں
کے ہاتھ میں تھا جو خود ان سازشوں کے بانی مبانی تھے تو وہ
اپنی پردہ دری کیوں کرتے لیکن پھر بھی ہمیں ان کی تصانیف
میں اس کے کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ مثلاً صحیح بخاری میں
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک طویل خطبہ ملتا ہے۔ جس میں وہ
فرماتے ہیں کہ:-

ثم انه بلغني ان قائلا منكم يقول والله
لو مات عمرؓ بايعت فلانا فلا يغترن امرؤ ان
يقول انما كانت بيعة ابي بكر فلتة وتمت
الا وانها قد كانت كذلك ولكن الله وقى
شرها وليس منكم تقطع الاعناق اليه مثل
ابي بكر - من بايع رجلا من غير مشورة من
المسلمين فلا يتابع هو ولا الذي تابعه تغرة
ان يقتلا وانه كان من خبرنا حين توفى الله
نبيه صلى الله عليه وسلم -

(صحیح بخاری ص ۱۰۰۹ ج ۲ مطبوعہ مطبعہ مجتبائی دہلی)

ترجمہ :۔ پھر مجھے یہ خبر ملی ہے کہ تم میں سے کوئی آدمی یہ کہتا ہے کہ اگر عمرؓ مر گئے تو میں فلاں شخص کی بیعت کر لوں گا۔ اور خبردار کوئی شخص اس فریب میں نہ رہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت بھی یوں ہی (بغیر مشورہ کے) یکبارگی ہو گئی تھی اور اس کا انجام بخیر ہوا (لہٰذا بغیر مشورہ کے ہماری اس بیعت کا انجام بھی بخیر ہو جائے گا) بیشک ابوبکرؓ کی بیعت یکایک ہو گئی تھی۔ لیکن اللہ نے اس کے شر سے (سب کو) بچا لیا۔ لیکن تم میں کوئی اور ایسا نہیں ہے جس میں ابوبکرؓ جیسی فضیلت ہو۔ اب جس کسی شخص نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی شخص کی بیعت کر لی تو اس کی اور اس کے متبع کی بیعت نہ کی جا سکے گی بلکہ اندیشہ ہے کہ دونوں ہی قتل کر دیئے جائیں۔ اور یقیناً ابوبکرؓ تو ہم سب سے بہتر تھے جب اللہ تعالےٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا۔

یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو ان کے آخری حج کے موقعہ پر منیٰ میں دی گئی تھی۔ پلان یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو جائے تو یکبارگی اپنی مرضی کے آدمی کی بیعت کر لی جائے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی بیعت بھی یوں ہی یکبارگی ہو گئی تھی اور پھر امت نے اسے قبول کر ہی لیا تھا۔ ایسے ہی ہم اگر یکبارگی اپنی مرضی کے شخص سے بیعت کر لیں گے تو امت اسے بھی تسلیم کر لے گی۔ یہ سب خوارج تھے یعنی حکومتِ وقت کے مخالفین ہی تھے جو اس قسم کی پلاننگ

کر رہے تھے اور ان کی یہ پلاننگ مدینہ منورہ میں خوب مشتہر تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ خدانخواستہ اگر ایسا ہو گیا تو ایک نیا فتنہ کھڑا ہو جائے گا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی حیات ہی میں اس کا فیصلہ کر دیں کہ ان کے بعد خلیفہ کون ہو گا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں وہ خطبہ نقل کیا گیا ہے جو حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنی وفات سے چند روز پہلے دیا تھا۔ حضرت معدانؒ فرماتے ہیں :۔

" وفات سے چند دن پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن خطبہ دیا۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا : " میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ نے میرے تین ٹھونگیں ماریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری موت قریب آ گئی ہے۔ بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اپنا خلیفہ نامزد کر دیجئے۔ (میں کہتا ہوں کہ) اللہ تعالےٰ اپنے دین اور خلافت اور اس چیز کو جس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا تھا (یعنی قرآن) ضائع نہیں کرے گا۔ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک راضی رہے (یعنی حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ) اور میں سمجھتا ہوں کہ

بعض لوگ جن کو میں نے اپنے ہاتھ سے مارا ہے (یعنی ایرانی، رومی اور خوارج) اس کام میں اسلام پر طعن کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے پھر ایسا کیا تو وہ اللہ کے دشمن اور گمراہ کافر ہیں۔"

(صحیح مسلم کتاب المساجد باب نہی من اکل ثوما عن معدان رض)

اپنی اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لئے یہ خوارج (باغی) زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکے چنانچہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طبعی وفات کا انتظار بھی نہیں کر سکے۔ انہوں نے سازش تیار کی کہ حضرت عمر رض کو قتل ہی کر دیا جائے۔ چنانچہ ابو لؤلؤ فیروز، ہرمزان جفینہ اور کعب الاحبار وغیرہ نے مل کر حضرت عمر رض کو راستہ سے ہٹانے کی اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم میں جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایرانی، رومی، یمنی یہودی اور منافقین شریک تھے اور ایک دن نماز فجر میں حضرت عمر رض پر ابو لؤلؤ فیروز نے خنجر سے حملہ کر دیا۔ اسکیم تو یہی تھی کہ حضرت عمر رض کو شہید کر کے یکبارگی طور پر اپنی مرضی کے آدمی سے بیعت کر لی جائے۔ پھر سب لوگ اس بیعت کو تسلیم کر ہی لیں گے۔ لیکن حضرت عمر رض بہت سخت جان ثابت ہوئے اور وہ حملے کے بعد تین دن تک زندہ رہ گئے اور تمام معاملات حسن و خوبی کے ساتھ طے کر کے یکم محرم کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ (ایک اور روایت کے مطابق ان کا یوم شہادت سات یا دس محرم ہے۔ ملاحظہ ہو ہیکل کی "سوانح عمر رض")۔

جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے چند روز پیشتر اعلان فرما دیا تھا کہ اگر میری موت جلد واقع ہو جائے تو مشورہ کرنے کے بعد خلافت ان چھ آدمیوں میں رہے گی۔ جن سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اپنی وفات تک خوش رہے (مسلم کی حدیث جو اوپر درج ہو چکی ہے) چنانچہ آپ نے اسی کے مطابق خلافت کے فیصلے کے لئے انہی چھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنا دی جو تین دن تک باہم فیصلہ کر لیں کہ ان میں سے کون خلیفہ ہوگا اور جس پر اتفاق ہو جائے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے۔ چنانچہ ان چھ حضرات کی کمیٹی نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں فیصلہ کیا اور ان کے دست مبارک پر خلافت کی بیعت کر لی گئی۔ اور خوارج نے جو اسکیم بنائی تھی وہ کامیاب نہ ہو سکی۔

خوارج عثمان ذوالنورین رض

لیکن خوارج (باغیوں) کا یہ ٹولہ اپنی سازشوں میں برابر مصروف رہا اور وہی ٹیکنیک انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پھر استعمال کی جو وہ حضرت عمر رض کے خلاف استعمال کر کے ناکام رہے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انہیں اپنی اسکیم کو بروئے کار لانے میں بارہ سال کا عرصہ لگ گیا۔ اور اس مرتبہ وہ کامیاب ہو گئے۔ یعنی حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے یکبارگی طور پر اپنی مرضی کے آدمی یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن

ان کی یہ کامیابی دیر پا ثابت نہ ہو سکی اور اکابر صحابہ نے اس کے خلاف شدید ردّ عمل کا اظہار فرمایا جس کے نتیجہ میں جنگ جمل اور جنگ صفین کے حوادث فاجعہ پیش آئے۔ اس طرح خوارج (باغیوں) کی وہ سازش طشت از بام ہو گئی جو وہ عرصہ دراز سے زیر زمین تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی کا خلیفہ تو منتخب کر لیا۔ لیکن جب یہ خود پسند کردہ خلیفہ بھی ان کے اشارہ ابرو پر نہ چلا تو بالآخر اسے بھی شہید کر دیا۔

خوارج کون تھے؟

جیسا کہ آپ صفحات گذشتہ میں ملاحظہ فرماتے آرہے ہیں یہ خوارج دراصل وہ منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن درپردہ وہ اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں سرفہرست یہودی تھے، کچھ ایرانی اور رومی تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ہی کچھ عرب بھی تھے اور عربوں میں اکثریت قبیلہ بنو تمیم کے افراد کی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے عہد رسالت مآب میں خوارج کی ابتداء بتاتے ہوئے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی تھی جس میں عبداللہ ذوالخویصرہ تمیمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اموال غنیمت کی تقسیم میں انصاف نہ فرمانے کا الزام لگایا تھا۔ یہ عبداللہ ذوالخویصرہ بھی قبیلہ بنو تمیم ہی سے تعلق رکھتا تھا۔

خوارج حضرت علیؓ

اس کے بعد بھی قبیلہ بنو تمیم ہی کے لوگ ہی خوارج میں کثرت سے

شامل تھے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں جنگ صفین کے بعد جو خوارج سامنے آئے ان میں بھی اسی قبیلے کی اکثریت ملتی ہے۔

پروفیسر احمد امین مصری خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وبعد جدال وتردد قبل علی التحکیم، واختار معاویة عمرو بن العاص یمثله، واختار اصحاب علی ابا موسیٰ الاشعری، اذ ذاك ظهر قوم من جند علی اکثرهم من قبیلة تمیم نفروا من ان یحکم احد فی کتاب الله، ورأوا ان التحکیم خطأ لان حکم الله فی الامر واضح جلی۔ (فجر الاسلام ص۲۵۶ مطبوعہ مصر)

ترجمہ:- باہمی بحث و تردد کے بعد حضرت علیؓ نے تحکیم کو قبول کر لیا اور حضرت معاویہؓ نے اپنی نمائندگی کے لئے حضرت عمرو بن العاصؓ کو منتخب کیا اور اصحاب علیؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو منتخب کیا، اس وقت حضرت علیؓ کے لشکر میں سے ایک جماعت ظاہر ہوئی جن کی اکثریت قبیلہ بنو تمیم سے تھی۔ وہ اس بات سے بدکے کہ کوئی شخص کتاب اللہ میں حَکَم بنایا جائے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ تحکیم غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اس معاملہ میں بالکل واضح اور ظاہر ہے۔

نیز پروفیسر احمد امین مصری دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

ولقد کان اکثر من اعتنق المذھب الخارجی فی اول الامر عربا سکنوا البصرۃ والکوفۃ بعد فتوح عمر، وکان تغلب علی اکثرھم البداوۃ، وکان کثیر منھم من بنی تمیم ثم رأینا ان بعض الموالی دخل فی عقیدتھم ولعل السبب فی دخولھم انھم اشترکوا مع الخوارج فی بغض الامویین واعتقادھم بعدم صلاحیتھم، ووجوب الخروج علیھم حتی تزول دولتھم۔

(ضحی الاسلام ص ۳۳۲ ج ۳ مطبوعہ مصر)

ترجمہ:۔ شروع میں حضرت عمرؓ کی فتوحات کے بعد جن لوگوں نے خارجی مذہب کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا وہ بصرہ اور کوفہ کے رہنے والے تھے اور ان میں سے اکثر پر بدوی پن غالب تھا اور ان میں سے زیادہ تر بنو تمیم کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض موالی (ایرانی اور رومی آزاد کردہ غلام) بھی ان کے عقیدے میں داخل ہوگئے۔ اور غالباً ان کے داخلے کا سبب خوارج کے ساتھ بنو امیہ سے بغض میں اشتراک تھا اور بنو امیہ کے خلافت کے حق دار نہ ہونے کا اعتقاد تھا۔ اور یہ عقیدہ بھی کہ جبتک ان

کی حکومت بالکلیہ ختم نہ ہو جائے ان کے خلاف خروج واجب ہے۔

پروفیسر احمد امین مصری نے بتایا ہے کہ خارجی فرقے میں ایرانی اور رومی موالی کے علاوہ بصرہ اور کوفہ کے دیہاتی لوگ بھی شامل تھے جن کا تعلق قبیلۂ بنو تمیم سے تھا۔ عرب قبائل کے دوسرے لوگ بھی ان کے ساتھ شامل تھے۔ لیکن اکثریت بنو تمیم ہی کی تھی۔

جنگ جمل میں بھی جن لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف بھرپور جنگ میں حصہ لیا تھا ان میں بھی ہمیں قبیلہ بنو تمیم کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں اس قبیلے کے لوگ اس کثرت سے شامل تھے کہ صرف ایک قبیلہ کے مقتولین کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ تھی۔

(الاغانی ص ۴ ج ۱۶)

یعنی ایک طرف صدیق اکبرؓ کے عہد میں فتنۂ ارتداد میں بنو تمیم پیش پیش تھے۔ پھر قاتلین عثمانؓ میں بنو تمیم کی اکثریت تھی اسی لئے قصاص عثمانؓ کا عَلَم بلند کرنے والوں (یعنی حضرت طلحہؓ حضرت زبیرؓ اور ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے مقابلے کے لئے جنگ جمل کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لشکر میں اسی بنو تمیم کے قبیلے کی اکثریت تھی کہ صرف ان کے پانچ سو آدمی جنگ جمل میں کام آئے اور دوسری طرف تحکیم کے

بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف احتجاج کر کے ان سے الگ ہو جانے والوں میں بھی اکثریت انہی بنو تمیم کی تھی۔

پھر کربلا کے مقام پر حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کرنے والوں میں بھی یہی بنو تمیم کے لوگ پیش پیش تھے چنانچہ جناب عمر کھالہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

وتعدّ تمیم من القبائل التی قاتلت الحسین وشیعته فجاءت بسبعة عشر رأسًا منهم۔

(معجم قبائل العرب مطبوعہ دار العلم للملائین بیروت ص۱۳۱)

ترجمہ:۔ اور بنو تمیم کا شمار ان قبائل میں کیا جاتا ہے جنہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے شیعوں سے جنگ کی۔ چنانچہ جنگ کے بعد بنو تمیم قبیلے کے افراد حسینی قافلے کے سترہ سر لائے گئے۔

قبائل کے علاوہ نمایاں شخصیتوں کو دیکھا جائے تو وہاں بھی یہی صورت نظر آتی ہے کہ جو ارتداد میں پیش پیش تھے وہی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بھی آگے نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاتلین حضرت حسین رضی اللہ عنہ میں ایک شخصیت شبث بن ربعی بہت مشہور ہے اس کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ادرك النبی صلے اللہ علیه وسلم ولم یصحبه کان مؤذن سجاح ثم تاب واسلم وکان

یبغض عثمانؓ ویوالی علیاؓ۔ ثم صار خارجیا وقاتل الحسینؓ بکربلا۔

(الاصابہ فی اسماء الصحابہ لابن حجر عسقلانی ص۱۶۲ ج۲ طبع مصر)

ترجمہ:۔ شبث بن ربعی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا مگر شرفِ صحبت حاصل نہیں کر سکا۔ وہ سجاح (مدعیۂ نبوت) کا مؤذن تھا۔ پھر اس نے توبہ کی اور مسلمان ہو گیا۔ وہ حضرت عثمانؓ سے بغض رکھتا تھا اور حضرت علیؓ سے موالات رکھتا تھا۔ پھر حضرت علیؓ کا بھی مخالف ہو کر خارجی بن گیا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کربلا میں نبرد آزما رہا۔

ایسے ہی بے شمار لوگ ہیں جن میں سے بعض کا تذکرہ ہمارے مؤرخین نے کر دیا ہے اور بہت سوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

بہر حال یہ سب خوارج یعنی حکومت وقت کے خلاف مسلح بغاوت اور خروج کرنے والے ہیں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے عہد کی حکومتوں کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا۔ سربراہان مملکت کو قتل اور شہید کیا اور ان کی حکومتوں کا تختہ الٹا۔

یہ سب منافقین تھے جو بظاہر مسلمان ہو گئے تھے لیکن بہ باطن کافر تھے۔ ان میں سے جو لوگ اپنے ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لئے بظاہر اسلام لے آئے تھے یا اسلامی حکومت میں کفر کی وجہ سے انہیں جو نقصانات پہنچ سکتے تھے ان سے اپنے

آپ کو محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تھا وہ مسلمانوں کی تاریخ میں منافقین کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے کچھ طاقت حاصل کرنے کے بعد مسلمان حکومتوں کے خلاف علَم بغاوت بلند کیا اور اسلامی مملکت کے خلاف خروج کیا وہ خوارج کے لقب سے یاد کئے گئے۔ لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ سب منافق ہیں جن کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا تھا کہ :-

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط (۹/۷۳ ، ۶۶/۹)

ترجمہ :- اے پیغمبر اسلام ! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے۔

آج بھی ایسے خفیہ منافقوں اور کھل کر سامنے آجانے والے باغیوں سے جہاد فرض ہے اور انہیں کیفر کردار کو پہنچانا اُمّتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔

(کتاب التعزیر)

تعزیر فقہاء کی اصطلاح میں وہ سزائیں کہلاتی ہیں جو قرآن کریم سے ثابت نہیں ہیں بلکہ امام یا قاضی اپنی صوابدید سے مختلف جرائم میں جاری کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے چند انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں مقرر کردی ہیں۔ اور باقی جرائم کو مسلمانوں کی اجتماعی رائے پر چھوڑ دیا ہے جرائم چار طرح کے ہیں۔ دوسرے کی عزت سے کھیلنا۔ دوسرے کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا۔ کسی کے مال پر حملہ کرنا۔ کسی کی جان لینے کی کوشش کرنا۔ ان میں انتہائی جرائم کی انتہائی سزائیں۔ قتل کرنے کی سزا، خون کے بدلے خون۔ یعنی قصاص۔ اعضاء کو ناکارہ کردینا یا کاٹ ڈالنا تو وہاں بھی قصاص لازم ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، کان کے بدلے کان، ہاتھ کے بدلے ہاتھ علیٰ ہذا القیاس۔

(۲) کسی کی عزت سے کھیلنا، کسی سے زنا کرنا اس کی سزا سو کوڑے مارنا۔

(۳) کسی کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا یعنی زنا کی تہمت لگانا، اس کی

سزا اسّی کوڑے مارنا۔

(۴) کسی کا مال چرانا اس کی سزا ہاتھ کاٹ دینا۔ لیکن ایسے جرائم بے شمار ہیں جو انہی کے ذیل میں آتے ہیں لیکن ان انتہاؤں کو نہیں پہنچتے مثلاً کسی کو مارنا اور ضرب پہنچانا جس میں کوئی انسانی عضو بیکار نہیں ہوتا، ضائع نہیں ہوتا یا کسی سے زنا تو نہیں کیا مگر کسی کا بوسہ لے لیا ہے۔ کسی سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اس پر آوازے کسے ہیں۔ کسی پر زنا کی تہمت تو نہیں لگائی لیکن کوئی دوسری تہمت لگائی ہے۔ کسی کا مال تو نہیں چرایا مگر کوئی ایسی تدبیر کی ہے کہ اس کے مال پر ناجائز قبضہ ہو جائے۔ تو ایسی صورتوں میں نیز ایسی صورتوں میں بھی جو ان جرائم کے ذیل میں نہیں آتے لیکن وہ جرم ہیں مثلاً بھنگ، افیون، چرس وغیرہ فروخت کرنا تو اس صورت میں ایسے مجرموں کو سزا دینا ضروری ہے تاکہ ان جرائم کا سدباب ہو سکے۔ لیکن ان جرائم کی قرآن کریم نے کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی ہے تو امام یا قاضی ایسے مجرموں کو اپنے اجتہاد سے کوئی سزا دے گا۔ ایسی سزاؤں کو تعزیر کہتے ہیں۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے:۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ○ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ○ (۴/۱۵-۱۶)

ترجمہ:۔ اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں بے حیائی

کی مرتکب ہوں تو ان پر تم اپنے میں سے چار گواہ بنا لو۔ پس اگر چار گواہ گواہی دیدیں تو انہیں گھروں میں روکے رکھو حتیٰ کہ انہیں موت ہی آجائے یا خدا ان کے لئے کوئی سبیل نکال دے۔ اور جو مرد اور عورت تم میں سے اس بے حیائی کے مرتکب ہوں تو ان کو ستاؤ۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگذر کرو۔ یقیناً اللہ بھی توبہ قبول کرنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ان آیات میں الفاحشۃ (بے حیائی) سے مراد ایسے ہی جرائم ہیں جو زنا کی حد تک تو نہیں پہنچتے البتہ زنا کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ یعنی کسی عورت کا بوسہ لے لینا، اس کی چھاتیوں کو چھونا اور ملس کرنا اس سے گندی باتیں کرنا۔ اسے چھیڑنا۔ اس پر آوازے کسنا تو ایسے جرائم کے لئے قرآن کریم نے ایذا رسانی کا حکم دیا ہے۔ اس ایذا رسانی کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی۔ یہی حال دوسرے اُن تمام جرائم کا بھی ہے جو قرآن کی رو سے جرم ہیں۔ لیکن قرآن نے ان کی کوئی سزا مقرر نہیں کی تو حکومتِ وقت ایسے تمام جرائم کی تعزیرات مقرر کر سکتی ہے۔ اور اگر حکومت مقرر نہ کرے تو امام یا قاضی اپنی صوابدید کے مطابق مناسب سزا دے سکتا ہے البتہ یہ سزائیں قرآنی حدود سے عام حالات میں تجاوز نہ کرنی چاہئیں۔ چنانچہ فقہاء نے کہا ہے کہ تعزیر میں کم سے کم تین کوڑے اور زیادہ سے زیادہ انتالیس ۳۹ کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ غلاموں کے لئے قذف کی مشروع حد چالیس ۴۰ کوڑے ہے۔ لہٰذا اس سے ایک کم انتالیس ۳۹ کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ امام

ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اصل حد احرار کے متعلق اسّی کوڑے ہے لہٰذا اس سے کم پچھتر کوڑے مارے جاسکتے ہیں۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ اُناسی کوڑے مارنے چاہئیں۔ امام ابو یوسفؒ سے بھی ایک روایت امام زفرؒ کے مطابق ہے۔ کم سے کم تین کوڑے اس لئے رکھے گئے ہیں کہ اس سے کم میں کوئی مقصد ہی حاصل نہیں ہوتا۔ اگر امام چاہے تو کوڑوں کے ساتھ قید کی سزا بھی دے سکتا ہے۔

ہمارے نزدیک بہتر یہ ہے کہ حکومتِ وقت اہل حل وعقد (پارلیمنٹ کے ممبران) کی رائے سے مختلف جرائم کے لئے ان کی نوعیت کے پیش نظر جرائم کی شدت وخفت کو مدنظر رکھتے ہوئے نیز مملکت کے حالات وکوائف کے پیش نظر سزائیں مقرر کردے اور ان کے لئے ایک ضابطۂ تعزیرات مدوّن کرے تاکہ پوری مملکت میں سزائیں دینے میں یکسانیت پیدا ہوسکے۔

(شراب کی تعزیر)

شراب خوری کی سزا بیان کرنے سے پہلے چند امور پر بحث کرلینا ضروری ہے۔ یعنی پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم کی رو سے خَمْرٌ یعنی شراب کیا ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم نے شراب کے متعلق کیا حکم صادر فرمایا ہے اور کیا قرآن کریم نے اس کی کوئی حد مقرر فرمائی ہے۔ اگر کی ہے تو وہ کیا ہے۔

قرآن کریم نے شراب کے لئے خَمْرٌ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ شراب کے متعلق ہمیں قرآن کریم میں تین قسم کی آیات ملتی ہیں۔ سب سے پہلے آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں فرمایا گیا ہے:۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹)

ترجمہ:۔ اور اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ انہیں بتادیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے

ان میں کچھ منفعتیں بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کی منفعتوں سے زیادہ بڑا ہے۔

دوسری آیت سورۂ نساء میں ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (۴/۴۳)

ترجمہ:۔ نماز کے قریب بھی نہ جاؤ دراں حالیکہ تم مدہوش ہو تا آنکہ تم سمجھ سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

تیسری آیت سورۂ مائدہ کی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ○ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ (۵/۹۰-۹۲)

ترجمہ:۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! بات یہی ہے کہ شراب، جوا، بت اور پانسے سب گندی چیزیں اور شیطانی کام ہیں لہٰذا ان سے بچو، توقع ہے کہ (اس طرح) تم فلاح پا جاؤ گے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں شراب اور جوئے کے ذریعہ بغض اور عداوت کا بیج بو دے

اور تمہیں خدا کی یاد سے یعنی نماز سے روک دے تو کیا تم ان چیزوں سے باز آ رہے ہو؟ (یا نہیں)۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ڈرتے رہو۔ تو اگر تم نے اطاعت سے منہ موڑا تو اچھی طرح سمجھ لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف وضاحت سے پہنچا دینا ہے۔

ان آیات کریمہ میں بنیادی لفظ خَمْرٌ ہے جس سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ لہٰذا خَمْرٌ کے لفظ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ خَمْرٌ کے معنے کسی چیز کو ڈھانپ دینے اور چھپا دینے کے ہوتے ہیں۔ خَمَرَ الشَّيْءَ يَخْمُرُهُ اس کو چھپا دیا ڈھانپ دیا۔ خَمَرَ فُلَانٌ الشَّهَادَةَ۔ فلاں نے گواہی کو چھپا دیا اَلْخَمْرُ ہر نشہ آور چیز کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ دیتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا ہے کہ اَلْخَمْرُ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ یعنی خمر اسے کہتے ہیں جو عقل میں فتور اور اضمحلال پیدا کر دے۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ لِاَنَّهَا تُخَمِّرُ الْعَقْلَ یعنی شراب کو خَمْرٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ عرب عام طور پر شیرۂ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اور اسے خَمْرٌ کہتے تھے ویسے ان کے ہاں انگور کو بھی خَمْرٌ کہتے ہیں۔ تَخْمِيْرٌ کے معنے خمیر اُٹھانے کے ہیں۔

شراب کا حکم

تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ شراب جو شیرۂ انگور سے تیار کی جائے وہ مطلقاً حرام

ہے۔ خواہ تھوڑی پی جائے یا بہت پی جائے۔ اس سے نشہ کی کیفیت پیدا ہو یا نہ ہو۔ وہ ہر حال میں حرام ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ جو شراب شیرۂ انگور کے علاوہ دوسری چیزوں سے بنائی جائے مثلاً شہد، گیہوں، جَو، چاول، کھجور وغیرہ سے تیار کی جائے اس کے متعلق جمہور محدثین اور فقہائے حجاز تو اس کے قائل ہیں کہ شراب کسی چیز سے بھی بنائی جائے وہ حرام ہے، تھوڑی سی بھی جس سے نشہ نہ ہو حرام ہے اور زیادہ بھی جس سے نشہ ہوجائے۔ شراب کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ لیکن فقہائے عراق مثلاً نخعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، شریکؒ، ابن شبرمہؒ امام ابوحنیفہؒ اور تمام فقہائے کوفہ اور اکثر فقہائے بصرہ اس کے قائل ہیں کہ شیرۂ انگور کے علاوہ دوسری شرابیں صرف نشہ کی صورت میں حرام ہیں۔ اگر تھوڑی سی چکھ لی جائیں کہ ان سے نشہ نہ ہو تو وہ حرام نہیں ہیں۔ البتہ اگر اتنی پی لی جائیں کہ ان سے نشہ ہوجائے تو وہ حرام ہیں۔ عرب کے لوگ چونکہ شیرۂ انگور سے شراب تیار کرتے تھے اور اسی کو خَمْرٌ کہتے تھے اور قرآن کریم نے خَمْرٌ کو حرام قرار دیا ہے اس لئے اس کا ایک قطرہ بھی حرام ہے۔ شیرۂ انگور سے جو شراب تیار کی جائے اس کے پینے سے نشہ ہو یا نہ ہو، تھوڑی سی چکھی جائے یا بہت پی جائے ہر حالت میں حرام ہے۔

فقہائے عراق فرماتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کی حرمت کے ساتھ ساتھ اس کی علت بھی بتادی ہے اور وہ علت یہ ہے کہ خمر اور

میسرہ کے ذریعہ شیطان تمہارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دینا چاہتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ذکر الٰہی یعنی صلوٰۃ سے روک دے تو کیا تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ باہمی بغض اور عداوت ڈال دینا نیز ذکر الٰہی یعنی صلوٰۃ سے روک دینا اسی وقت ممکن ہے جب نشہ ہوجائے۔ اگر تھوڑی سی شراب چکھ لی جائے جس سے نشہ نہ ہو تو یہ کیفیتیں پیدا نہیں ہوتیں۔ لہٰذا وہ قرآن کی رو سے ممنوع بھی نہیں ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ دلیل کی رو سے فقہائے عراق کا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو شخص تھوڑی شراب پیتا ہے جس سے نشہ نہ ہو اس کے متعلق یہ اندیشہ موجود ہے کہ تھوڑی شراب پیتے پیتے وہ بالآخر زیادہ شراب بھی پینے لگے گا۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ شراب کو مطلقاً حرام قرار دیا جائے۔ البتہ بعض دوائیں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کی تیاری میں الکوحل شامل کرنی پڑتی ہے تاکہ وہ خراب نہ ہوجائیں مثلاً بعض شربت الکوحل کے بغیر تیار نہیں ہوسکتے یا ہومیوپیتھک دوائیں جو الکوحل ہی میں تیار کی جاتی ہیں۔ لیکن وہ قطرات کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں اور ان سے نشہ وغیرہ کا احتمال نہیں ہوتا ان کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

کیا شراب حرام ہے

آج کل بعض حضرات کی طرف سے عجیب وغریب سوالات اُٹھائے جارہے ہیں۔ مثلاً بعض لوگ یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ قرآن کریم

نے شراب کو حرام نہیں کہا۔ قرآن کریم نے تو صرف چار چیزیں حرام قرار دی ہیں :۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ (۲/۱۷۳)

ترجمہ :۔ اللہ نے تو تم پر صرف مُردار، تازہ خون، سُور کا گوشت اور جن جانوروں پر ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام پکارا جائے (ان کا گوشت) حرام قرار دیا ہے۔

تو شراب کو حرام کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسلام میں حرام کے معنے کیا ہیں؟ اس کا مادّہ اشتقاق حَرْمٌ ہے جس کے بنیادی معنے کسی چیز سے شدت کے ساتھ روک دینے اور ممانعت کر دینے کے ہیں (ابن فارس) اَلْحَرَامُ تمام وہ چیزیں جن کی ممانعت کر دی گئی ہو۔ جن کے کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ یہ اَلْحَلَالُ کی ضد ہے جس کے معنے ہیں۔ رسیاں کھول کر رکاوٹ اور بندش کا دور کر دینا۔ اَحْرَمَ الْحَاجُّ حاجی اس حالت میں پہنچ گیا جہاں اس پر کئی ایک چیزیں ممنوع ہو گئیں جنہیں وہ پہلے کر سکتا تھا۔ اسی کو حالتِ احرام کہتے ہیں (کتاب الحج میں بحث تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے) لہٰذا "حرام" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے شدت کے ساتھ روک دیا گیا اور ممانعت کر دی گئی ہو۔ اور فقہاء کی اصطلاح میں وہ چیزیں جو کتابِ الٰہی کی رو سے ممنوع ہوں حرام کہلاتی ہیں اور جو اخبار آحاد یعنی احادیث کی رو سے ممنوع ہوں وہ ناپسندیدہ اور مکروہ کہلاتی ہیں۔ اس کے

برعکس جو چیزیں کتاب الٰہی کی رو سے مامور بہا ہوں وہ فرض کہلاتی ہیں اور جو چیزیں اخبار آحاد یعنی احادیث کی رو سے مامور بہا ہوں وہ واجب یا سنت کہلاتی ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ آیات محولہ بالا میں شراب سے شدت کے ساتھ روکا اور منع کیا گیا ہے یا نہیں؟ آپ دیکھ چکے ہیں کہ شراب کو قرآن کریم رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ گندی چیز اور شیطانی کام فرمانے کے ساتھ ساتھ فَاجْتَنِبُوْهُ (لہٰذا اس سے بچو، اس سے الگ رہو) کے حکم کے ساتھ آگے پھر مزید تاکید فرمانے کے لئے فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (پھر تم اس سے باز رہتے ہو یا نہیں) کی تہدید بھی فرمائی گئی ہے۔ یہ ساری چیزیں ممانعت ہیں یا اجازت ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ممانعت ہی ہے اور بڑی ہی سخت قسم کی ممانعت ہے۔ جو چار چیزیں اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (خدا نے تو تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں) کے لفظ سے بیان فرمائی ہیں۔ اس قدر شدت کے ساتھ ممانعت تو ان کی بھی نہیں فرمائی گئی۔ ہم بتا چکے ہیں کہ کسی چیز کی ممانعت شدت کے ساتھ کی جائے تو اسی کو حرام کہتے ہیں۔ حرام اُسی کو نہیں کہتے جسے حرام کے لفظ سے بیان کیا جائے۔ فقہاء کرام کی اصطلاح کے مطابق بھی، چونکہ شراب کی ممانعت کتاب الٰہی سے ثابت ہے اس لئے فقہی اصطلاح میں بھی اس کو حرام ہی کہا جائے گا لہٰذا حَرَامٌ کے لفظ پر اصرار کرنا بے معنیٰ بات ہے۔ تاہم چونکہ عام طور پر لوگ حرام کے لفظ پر ہی مُصِر ہیں اس لئے ان کی تسلی کے لئے عرض ہے کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں

سورۂ اعراف میں یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ۫ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىِٕثَ وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ ؕ (ع ۱۵۷)

ترجمہ:۔ جو رسول، نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جسے وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔ جو انہیں دستور کے مطابق اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے اور سب پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتا ہے اور سب ناپاک چیزوں کو ان کے لئے حرام کرتا ہے اور ان سے ان کے اس بوجھ اور ان بیڑیوں کو اتار دیتا ہے جو ان پر پڑی ہوئی تھیں۔

اس آیت کریمہ کے ساتھ سورۂ مائدہ کی اس آیت کریمہ کو ملا لیجئے جس میں شراب کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وہ گندی چیز ہے شیطانی عمل ہے۔ اس سے بچو۔ پھر تم اس سے باز رہتے ہو یا نہیں؟ اب سوال یہ ہے کہ سورۂ مائدہ کی ان تصریحات کی روشنی میں شراب کو طیبات (پاکیزہ چیزوں) کی فہرست میں شامل کیا جائے گا یا خبائث (ناپاک چیزوں) کی فہرست میں؟ اگر شراب ناپاک چیزوں کی فہرست میں شامل ہے، اور یقیناً ہے، تو سورۂ اعراف کی

اس آیت کی رو سے وہ حرام بھی ہے۔ یہاں یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ (وہ ان پر حرام کرتا ہے) کا لفظ موجود ہے جو ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے کافی ہے جو قرآن کریم سے حرام ہی کا لفظ سننا چاہتے ہیں۔

شراب نوشی پر حد

تیسرا سوال یہ تھا کہ کیا قرآن کریم نے شراب نوشی کے لئے کوئی حد (سزا) مقرر فرمائی ہے۔ اس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حق تعالیٰ نے اس کی کوئی حد (سزا) مقرر نہیں فرمائی۔ قرآن کریم میں اس کی کوئی سزا بیان نہیں ہوئی۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی کوئی متعین سزا مقرر نہیں فرمائی۔ چنانچہ بخاری و مسلم، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت انسؓ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ:۔

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم اتی برجل قد شرب الخمر فجلدہ بجریدتین نحو اربعین وفعلہ ابوبکرؓ فلما کان عمرؓ استشار الناس فقال عبد الرحمٰن اخف الحدود ثمانون فامر بہ عمرؓ۔

ترجمہ:۔ یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص لایا گیا جس نے شراب پی تھی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے کھجور کی چھڑی سے کوئی چالیس ضربیں لگوائیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہی سزا دی لیکن جب دورِ فاروقی آیا تو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ حد کی سب سے کم مقدار اسّی کوڑے ہیں (بہتان زنا لگانے والے کے لئے) چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کو نافذ کر دیا۔

امام مالکؒ کی روایت میں جو ثورؓ بن زید سے مروی ہے ہے کہ حضرت علیؓ نے بھی اسّی کوڑے ہی کی تائید فرمائی تھی ور وجہ یہ بتائی تھی کہ ،

فانه اذا شرب سکر واذا سکر هذیٰ واذا هذیٰ افتریٰ فجلد عمر ثمانین۔

ترجمہ :۔ یعنی جو شراب پئے گا بدمست ہو گا، جو بدمست ہو گا بکواس کرے گا، جو بکواس کرے گا وہ بہتان طرازی بھی کرے گا۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے قذف کی حد ہی قائم کر دی۔

لیکن مسلم اور ابوداؤد میں حصین بن منذرؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ولید کو صرف چالیس کوڑے لگوائے تھے ور فرمایا تھا کہ ،

جلد النبی صلے اللہ علیہ وسلم وابوبکر اربعین وعمر ثمانین وکل سنة وهذا احب الی۔

ترجمہ :۔ یعنی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اور ابوبکرؓ نے چالیس کوڑے لگوائے تھے اور عمرؓ نے اسّی کوڑے لگوائے۔ دونوں ہی سنت ہیں۔ مگر مجھے چالیس ہی پسند ہیں۔

بخاری اور ابوداؤد کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک شرابی کی سزا کے سلسلہ میں صحابہ سے فرمایا اضربوہ (اسے مارو) اس کے بعد ،

فمنا الضارب بیدہ ومنا الضارب بنعله ومنا الضارب بثوبه ثم قال لنا بکتوہ فاقبلنا علیه نقول اما اتقیت اللہ؟ اما خشیت اللہ؟ اما استحییت من رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم۔

ترجمہ :۔ تو ہم میں سے کسی نے اسے اپنے ہاتھ سے مارا اور کسی نے اپنے جوتے سے مارا، کسی نے اسے اپنے کپڑے (کا کوڑا بنا کر اس) سے مارا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا، اسے شرمندہ کرو، تو ہم نے کہنا شروع کیا کہ تو اللہ سے نہیں ڈرتا، تجھے خوفِ الٰہی نہیں ہے، تجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے شرم نہیں آتی؟

ان تمام روایتوں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ میخواری کی کوئی تعزیر (سزا) مقرر نہیں ہے۔ ہر دور میں یہ سزا مناسب ترمیم قبول کر سکتی ہے۔ مطلب تو عادت چھڑانے سے ہے۔ سزا کی کسی مقدار کو باقی رکھنے سے نہیں ہے۔ کسی سوسائٹی میں کم سے کم سزا مؤثر ہو سکتی ہے تو وہ بھی دی جا سکتی ہے اور اگر اسّی کوڑوں سے بھی کام نہ چلے تو زیادہ میں بھی کوئی شرعی قباحت

نہیں ہے۔ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔

تعزیر کا مقصد یہاں ایک نکتہ پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ میخواری کی سزا اگر اسّی درّے ہی مان لی جائے تو اس کا مقصد پھر بھی مجرم کو جان سے مار ڈالنا نہیں ہے عہد نبوی نیز خلافت راشدہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کسی شرابی کو سزا دیتے دیتے اس کی جان لے لی گئی ہو۔ یہی صورت تہمت زنا کی حد میں بھی ہے لہٰذا یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ زنا کی حد میں بھی صرف بیس کوڑوں کا اضافہ کر کے زانی کو سو درّے لگانے کی غرض بھی اسے جان سے مار ڈالنا نہیں ہے جان صرف اس صورت میں لی جا سکتی ہے جب جرم کی نوعیت اپنی سنگینی کی وجہ سے اس کا مطالبہ کرتی ہو۔ اس وقت جان سے مار ڈالنا کچھ زنا ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر اس جرم پر سزائے موت دی جا سکتی ہے جو اپنی سنگینی کی وجہ سے سبوتاژ کی حد تک پہنچتا ہو۔

نسائیؒ اور ابو داؤد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ :-

ایک انصاری اس قدر بیمار تھے کہ ہڈی چمڑا ایک ہو گیا تھا اسی دوران ایک عورت کو دیکھ کر ولولۂ شباب عود کر آیا اور وہ حد شرعی کے مستحق ہو گئے۔ اس کے بعد جذبۂ ایمانی کے تقاضے ابھرے اور انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ لوگوں کو بھیج کر اپنے لئے حکم دریافت کرایا۔ لوگوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم

کو بتایا کہ وہ اس قدر بیمار ہیں کہ یہاں تک آنا بھی ان کے لئے سخت دشوار ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی ناتوانی پر رحم فرماتے ہوئے یہ سزا تجویز فرمائی کہ سو کوڑوں کے بجائے سو نرم ٹہنیوں کا مٹھا لے کر اس سے ان کو ایک ضرب لگا دو۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر جان سے مار ڈالنا مقصود ہوتا تو ان بیمار انصاری کو تو سو تنکے مارنے کی بجائے چند کوڑوں ہی سے ختم کیا جا سکتا تھا۔

سنن ابو داؤد میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ :-

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم لم یقت فی الخمر حدا وقال شرب رجل فسکر فلقی یمیل فی الفج فانطلق بہ الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فلما حاذی بدار العباس انفلت فدخل علی العباس فالتزمہ فذکروا ذلک للنبی صلے اللہ علیہ وسلم فضحک وقال افعلها؟ ولم یامر فیہ بشیء۔

ترجمہ :- یعنی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے میخواری کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی تھی۔ ایک شخص شراب پی کر بدمست ہو گیا اور گلی میں لڑکھڑاتا ہوا پایا گیا۔ اسے پکڑ کر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا جانے لگا۔ جب وہ حضرت عباسؓ کے مکان کے سامنے پہنچا تو لوگوں کے ہاتھ سے چھوٹ کر حضرت عباسؓ کے مکان میں

گھس گیا اور وہاں جاکر حضرت عباسؓ سے چمٹ گیا۔ لوگوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہنس دیئے اور فرمایا کہ کیا واقعی اس نے یہ حرکت کی ؟ لیکن اسے کسی سزا کا حکم نہیں دیا۔

امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں حضرت ابو محجن ثقفیؓ کا واقعہ نقل فرمایا ہے کہ :۔

قادسیہ کا میدان جنگ گرم ہے۔ ابو محجن کو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے شراب نوشی کے جرم میں قید کر رکھا ہے۔ قید خانہ کے دریچے سے جھانک کر ابو محجن نظارۂ جنگ دیکھ رہے ہیں اور جذبۂ جہاد اندر سے بے چین کر رہا ہے۔ ابو محجن سعد کی بیوی سلمہ سے التجا کرتے ہیں کہ میری بیڑیاں کھول دو، اگر میں زندہ رہ گیا تو واپس آکر خود ہی بیڑیاں پہن لوں گا۔ انہوں نے انکار کیا لیکن بار بار کے اصرار سے انہوں نے بیڑیاں کھول دیں۔ ابو محجن نے حضرت سعدؓ ہی کا گھوڑا لے کر نیزہ بازی کے وہ وہ جوہر دکھائے کہ دشمن کی صفیں درہم برہم ہوگئیں اور پھر واپس آکر خود ہی بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو ان کے کارنامے معلوم ہوئے تو انہیں بغیر کسی تعزیر کے رہا فرمادیا اور کہا کہ :۔

"بخدا میں ایسے شخص کو شراب نوشی کی سزا نہیں دے سکتا جو اہل اسلام کی حمایت اور جاں نثاری کے نشہ سے اتنا سرشار ہو۔ ابو محجن بھی غیرت و حمیت کا پتلا تھا۔ اس نے بھی قسم کھالی کہ آج سے شراب نہیں چکھوں گا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

حضرت سعد بن ابی وقاص عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ماموں ہیں اور سنت رسول کی اطاعت و محبت میں ماوشما کی ان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوسکتی۔ ان کے طرز عمل نے یہ بتا دیا کہ شراب نوشی کی کوئی تعزیر اور سزا مخصوص نہیں۔ اگر ہوتی تو وہ چالیس یا اسی کوڑے مارتے اور ابو محجن کو قید میں نہ ڈالتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ یہ موقعہ جہاد کا تھا جہاں تعزیرات و حدود کا قانون عام حالات سے مختلف ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہاں حدود بھی ساقط ہو جاتی ہیں چہ جائیکہ تعزیرات۔ علاوہ ازیں بہ فحوائے ان الحسنات یذھبن السیات (نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں) ایر یا قاضی کو اختیار ہے کہ اعلیٰ کارگزاری کے عوض تعزیر کو معاف کر دے۔

میخواری اگرچہ ام الخبائث ہے لیکن بفحوائے :۔

وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (۲/۲۱۹)

ترجمہ :۔ اس کے نقصانات اس کے نفع سے زیادہ ہیں۔

اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر رکھنی چاہیئے ؎

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

علامہ صبحی محمسانی نے بدایۃ المجتہد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ :۔

وکذلك ماجوزہ بعض الفقہاء من شرب الخمر للتداوی۔ (فلسفۃ التشریع الاسلامی)

ترجمہ :۔ اور اسی رخصت دینے کے ذیل میں یہ چیز بھی

آتی ہے کہ بعض فقہاء نے دوا کے طور پر شراب کے استعمال کو جائز کہا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ عرینہ کے لوگوں کو اونٹوں کے البان و ابوال بطور علاج کے استعمال کو جائز فرمایا تھا حالانکہ بول حرام بھی ہے اور نجس بھی۔

الغرض میخواری چوں کہ اپنے اندر ایک روشن پہلو بھی رکھتی ہے اس لئے اس کی تعزیر میں بھی زیادہ شدت نہیں ہے۔ اور صرف اسی ایک جرم کی وجہ سے کسی کی دوسری خوبیاں خاک میں نہیں ملائی جا سکتیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عبداللہ نامی (الملقب بہ حمار) ایک صحابی تھے جو اپنی خوش کلامی اور بذلہ سنجی سے حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی کبھی کبھی ہنسایا کرتے تھے۔ انہیں کئی بار شراب نوشی کے جرم میں تعزیر کی گئی۔ مگر ع

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

ایک بار پھر اسی جرم میں ماخوذ ہوئے اور سزا دی گئی۔ بعض صحابہ کی زبان سے نکل گیا اللھم العنہ ما اکثر ما یؤتیٰ بہ (اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ بار بار یہ اسی جرم میں ماخوذ ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ سن لیا تو فرمایا،

لا تلعنوہ فواللہ ما علمت الا انہ یحب اللہ ورسولہ۔ (بخاری عن عمر بن الخطاب)

ترجمہ:۔ اس پر لعنت نہ کرو، بخدا میں تو یہی جانتا

ہوں کہ یہ (باوجود شرابی ہونے کے) اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہی رکھتا ہے۔

یہ حدیث بڑی معنیٰ خیز ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ صرف اسی ایک برائی کو دیکھ کر یہ نہ سمجھو کہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کسی میں ایک برائی کے ساتھ ایسی دس خوبیاں بھی ہو سکتی ہیں جو دوسروں میں موجود نہ ہوں۔ اگرچہ وہ اس برائی سے پاک ہوں۔ بسا اوقات اس قسم کے مجرم وہ کام کر جاتے ہیں جو بے گناہ متقیوں سے نہیں ہوتے۔ کسی کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ اس کے اچھے برے سب کاموں کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے۔ آپ کو زندگی میں بیسیوں سابقے ایسے ہوئے ہوں گے کہ ایک فاسق نے مظلوم کی حمایت میں اپنی جان لڑا دی اور متقی خاموش بیٹھے رہے۔ گناہ گار نے اپنی پونجی کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دیدی اور پرہیزگار خزانہ کا سانپ بنے رہے۔ جاہل نے اپنی اسلامی خودی کو ہر قیمت پر باقی رکھا اور عالم کفر کے ہاتھوں بک گیا۔ پس انسان دراصل اپنے مجموعی کردار سے اپنا مقام متعین کرتا ہے نہ کہ صرف بادی النظر میں نظر آنے والے چند اعمال سے۔

حد نہیں بلکہ تعزیر ہے

اس سے معلوم ہو گیا کہ شراب نوشی پر کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ بلکہ حاکم وقت کو اس پر تعزیر جاری کرنے کا حق ہے۔ حدود میں یہ نہیں ہوتا کہ آج ایک سزا دی جا رہی ہے کل دوسری سزا دی جا رہی ہے یہ شان تعزیر کی ہوتی ہے کہ حاکم وقت حالات اور ضرورت کو

ملحوظ رکھتے ہوئے جو سزا مناسب سمجھے دیدے۔ یا سربراہِ مملکت اپنے اہل شوریٰ سے مشورہ کرکے کوئی ایک سزا مقرر کردے تاکہ اس کے قلم رَو میں سزاؤں میں یکسانیت قائم رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک شہر کا حاکم ایک سزا دے رہا ہے اور دوسرے شہر کا حاکم دوسری سزا دے رہا ہے۔ لیکن شوریٰ کے ذریعہ سے یہ مقرر کردہ سزا ہمیشہ کے لئے حتمی نہیں ہوگی کہ اس میں کوئی دوسرا سربراہِ مملکت کوئی تبدیلی ہی نہ کرسکے۔ ہر زمانہ کے حالات اور مقتضیات کے ماتحت مختلف فیصلے کئے جاسکتے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم نے اس کی کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی جسے قرآنی حد کہا جاسکے اور جسے حتمی قرار دیا جاسکے۔ البتہ شراب نوشی کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جس پر تعزیر ہونی چاہیئے۔

احکامِ مرتد

آپ کسی چھوٹی یا بڑی مشین کو لے لیجئے اس میں ہر پرزہ کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی محولہ ڈیوٹی انجام دے رہا ہے تو وہ مشین حرکت کرے گی ورنہ کھڑی ہوجائے گی، گھڑی کا ایک پرزہ، موٹر کا کوئی جزو اپنا کام چھوڑ دے تو نہ گھڑی چل سکے گی اور نہ موٹر حرکت کرسکے گی، یہی حال کائنات کا ہے۔ اس کی کارگاہ میں بھی لاکھوں، کروڑوں بلکہ اربوں چیزیں ہیں اور ہر چیز کا ایک مخصوص کام ہے جو وہ انجام دے رہی ہے۔ اگر کوئی چیز اپنا مفوّضہ کام انجام دینا چھوڑ دے تو کائنات کا تمام کارخانہ درہم برہم ہوجائے۔ اگر زمین اپنے راستہ سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہوجائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی تبدیلی پیدا کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رخ کو ایک سیکنڈ کے لئے خلاف قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی بجائے نشیب کی طرف بہنے کے فراز کی طرف بہنے لگے۔ اگر آگ حرارت کی بجائے برودت دینے لگے۔ اگر لکڑی دریا اور سمندر میں تہ نشین ہونے لگے۔ غرضکہ کارگہ عالم کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا پرزہ اپنے نظام اور قانون سے سرتابی اختیار کرے

تو یہ عظیم الشان پوری کائنات کا کارخانہ ٹھپ ہو جائے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (۵۷/۱، ۵۹/۱، ۶۱/۱)

ترجمہ:۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے قانون کے مطابق سرگرم عمل ہے۔

اور

لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا (۱۳/۱۵)

ترجمہ:۔ کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنی چیزیں ہیں وہ اللہ کے قانون کے سامنے خوشی اور ناخوشی سے سجدہ ریز ہیں۔

اور

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ (۱۶/۴۹)

ترجمہ:۔ اور کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں جتنے چلنے پھرنے والے جاندار اور فرشتے ہیں وہ سب اللہ کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور سرتابی نہیں کر سکتے۔

انہی چلنے پھرنے والی ہستیوں میں انسان بھی ہے۔ وہ قوانین الٰہی کے سامنے سجدہ ریز ہے اور سر مو ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ جتنے کچھ اس کے حیوانی تقاضے ہیں وہ ان میں قوانین فطرت سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کی زندگی کے چند محدود انسانی معاملات ہیں جو اس کی زندگی کا ۱/۴ بھی مشکل سے ہوں گے ان میں حق تعالیٰ نے اسے اختیار و ارادہ کی آزادی عطا فرما دی ہے

وہ ان میں قانون قدرت سے انحراف کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ قدرت کی طرف سے اسے یہ قدرت عطا فرمائی گئی ہے کہ وہ چاہے تو قوانین قدرت کی اتباع کرے اور چاہے تو ان سے انحراف کی صورت اختیار کرلے۔ یہ چند معاملات وہ ہیں جو انسانی شعور و ادراک سے متعلق ہیں۔ ان کے متعلق حق تعالیٰ نے آدم کو اس "دنیا" میں بھیجنے کے ساتھ ہی فرما دیا تھا کہ:۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (۲/۳۸)

ترجمہ:۔ تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئی تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا تو انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور اس کے برعکس:۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲/۳۹)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ (میری ہدایت کا) انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے تو یہی لوگ جہنمی ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

حق تعالیٰ نے ان دونوں راہوں کو بالکل واضح اور ممتاز کر دیا ہے۔ ہر انسان اپنی مرضی سے جونسی راہ چاہے اختیار کرے۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی جبر، اکراہ یا استبداد نہیں۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ○ (۹۰/۱۰)

ترجمہ:۔ اور ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

اس سے پہلے اس نے بتا دیا ہے کہ کیا ہم نے اسے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں اور بولنے کے لئے ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں فرما دیئے؟

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ○ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ ○

(۹۰/۸-۹)

ترجمہ:۔ کیا ہم نے اسے (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں اور (بولنے کے لئے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کر دیئے؟

اور ساتھ ہی گوش ہوش اور دیدۂ حق نیوش بھی عطا فرما دیئے۔

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ○ (۷۶/۲)

ترجمہ:۔ اور ہم نے اسے شنوا و بینا بنا دیا۔

اور اچھی طرح راستہ دکھا دیا تھا۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○

(۷۶/۳)

ترجمہ:۔ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا تھا (اس کے بعد) وہ جی چاہے تو شکر گذار بندہ بن جائے اور چاہے تو نافرمان منکر بن جائے۔

بہر حال حق تعالیٰ نے انسان کو پورا پورا اختیار عطا فرما دیا کہ وہ ایمان کی راہ اختیار کرے یا کفر کی راہ اختیار کرے۔ یعنی

ایمان اور کفر کے بارے میں اس پر کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں:۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹)

ترجمہ:۔ اور اے پیغمبر اسلام! آپ اعلان کر دیجئے کہ کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے تو (اب) جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کی راہ اختیار کرے۔

جو ایمان کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوگا اور جو کفر کی راہ اختیار کرے گا وہ اس کے عواقب و آلام سے حصہ پائے گا:۔

فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (۳۹/۴۱)

ترجمہ:۔ تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا اس کا فائدہ اس کی ذات کو ہوگا۔ اور جو گمراہی کی راہ اختیار کرے گا تو اس کی گمراہی کا وبال بھی اسی کی ذات کو بھگتنا پڑے گا۔

وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○ (۳۹/۴۱)

ترجمہ:۔ اور اے پیغمبر اسلام! آپ ان پر کوئی ذمہ دار نہیں ہیں۔

اگر حق تعالیٰ کی مشیت یوں ہوتی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں تو وہ انسان کو بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح ایک روش زندگی کا پابند بنا کر پیدا کر دیتا۔ کائنات میں اور بھی تو کروڑوں اربوں مخلوقات

ہیں جنہیں حق تعالیٰ نے اختیار و ارادہ کی آزادی مرحمت نہیں فرمائی وہ کبھی بھی اپنی مقررہ روش سے سرمو انحراف نہیں کرتیں۔ آپ نے بھیڑ بکریوں کو کبھی گوشت کھاتے اور شیر اور چیتے کو گھاس کھاتے نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کے لیئے جو قانون اس نے مقرر کر دیا ہے وہ سرمو اس سے انحراف نہیں کرتے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ انسان کو ہم نے شعوری امور میں ارادہ اور اختیار کی آزادی سے نوازا ہے اور اسے عقل و شعور عطا کر کے کائنات میں آزاد چھوڑا ہے۔ ہم اسے ان امور میں کسی ایک روش کا پابند بنانا نہیں چاہتے۔ ہماری مشیت کا تقاضا ہی یہ ہے:۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (۱۰/۹۹)

ترجمہ:۔ اور اے پیغمبر اسلام! اگر تیرے پروردگار کی مشیت ہوتی تو روئے زمین پر جتنے آدمی بستے ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے (مگر اللہ کی مشیت ہی یہ نہیں ہے) تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ حق تعالیٰ انسان کو با اختیار اور با ارادہ بھی بنائے اور پھر اس کو مجبور بھی بنا دے۔ ارشاد ہے کہ اے پیغمبر اسلام! آپ صاف صاف اعلان کر دیجئے کہ:۔

قَدْ جَاۗءَكُمْ بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ○ (۶/۱۰۴)

ترجمہ:۔ اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں آچکی ہیں۔ تو جو آنکھیں کھول کر چلے گا تو اس کا فائدہ اسی کو ہوگا اور جو آنکھیں بند کر کے اندھا بن کر چلے گا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہوگا اور میں تم پر کوئی نگران نہیں بنایا گیا ہوں۔

اور

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ○ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ○

(۶/۱۰۶-۱۰۷)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! آپ تو اس کی پیروی کیجئے جو آپ کی طرف آپ کے پروردگار کی طرف سے وحی کی جا رہی ہے۔ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور مشرکوں کی طرف سے کنارہ کیجئے (ان کی فکر ہی نہ کیجئے) اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ بھی مشرک نہ ہوتے۔ ہم نے آپ کو ان پر کوئی نگران نہیں بنایا اور نہ ہی آپ پر ان کی کوئی ذمہ داری ہے۔

انسان اگرچہ اب عہد شعور کو پہنچ چکا ہے لیکن پھر بھی ان کی اکثریت ابھی تک طبیعت کے اعتبار سے بڑی کمزور واقع ہوئی ہے۔ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ چند خوارق عادت (معجزات) کی رو سے اسے ورطۂ حیرت میں ڈال کر سیدھی راہ پر لانے کی کوشش کی جاتی لیکن یہ بھی اکراہ (MENTAL COMPULSION) ہی کی ایک صورت

ہوتی جو اختیار وارادہ کی حریت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو کوئی حسی معجزہ بھی عطا نہیں فرمایا۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ○ (۲۶/۳-۴)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! آپ تو شاید اپنے آپ کو اسی غم میں ہلاک کر ڈالیں کہ لوگ مؤمن کیوں نہیں ہوجاتے۔ اگر ہم (انہیں جبراً مؤمن بنانا) چاہتے تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی (معجزہ) اتار دیتے کہ ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جاتیں (لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا)۔

چنانچہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے واضح طور پر اعلان کرادیا گیا کہ اب خوارق عادات کا دور ختم ہوگیا اب دلائل و براہین کا دور ہے۔ اب اسلام کی دعوت علی وجہ البصیرت دی جائے گی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (۱۲/۱۰۸)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے۔ میں اور میرے پیروکار علیٰ وجہ البصیرت اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔

ہماری دعوت غور و فکر اور تدبر و تفکر کی دعوت ہے۔ ہم فہم و فراست اور عقل و بصیرت سے اپیل کرتے ہیں۔ سوچو، سمجھو غور و فکر کرو۔ اگر بات سمجھ میں آتی ہے تو مانو، نہیں سمجھ میں آتی

ہے تو نہ مانو۔ ہماری دعوت جور و اکراہ یا زبردستی اور جبر کی دعوت نہیں ہے۔ ہم نے انسان کو شعوری معاملات میں اختیار وارادہ کی آزادی بخشی ہے۔ اب کسی قسم کا جبر و اکراہ کرکے اس کے اختیار وارادہ کی آزادی کو سلب کرلینا ہمارے فیصلہ کے خلاف کھلی ہوئی بغاوت اور شرف انسانیت کا سلب و نہب ہے۔ اگر تم مشرکین سے برسرِ جنگ بھی ہو، وہ تمہیں قتل کر رہے ہوں اور تم ان کو قتل کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں کوئی مشرک تم سے اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے آئے تو بھی تم اس پر جبر نہ کرو:۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ (۹/۶)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر اسلام! اگر مشرکین میں سے کوئی آدمی (عین حالت جنگ میں) تم سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دیدو حتیٰ کہ وہ کلام الٰہی کو سن لے (اور اسلام کے متعلق معلومات حاصل کرلے) پھر اسے (اپنی حفاظت میں) اس کے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ حکم اس لئے دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔

اسے حالت جنگ میں بھی امان دیدو اسے اللہ کا کلام سناؤ اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرو۔ پھر اسے اس کے پڑاؤ تک جہاں وہ خود کو مأمون و مصئون سمجھتا ہو پہنچا دو۔ اور اس طرح اسے مہلت دو کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ اس پر تدبر و تفکر کرکے کسی نتیجہ

تک پہنچ سکے۔ اگر اس کا دل مطمئن ہو جائے تو وہ اسلام کو قبول کرلے اور اگر اسے اطمینان حاصل نہ ہو سکے تو اسلام کو قبول نہ کرے بغیر اطمینانِ قلبی کے ایمان لے آنے سے کچھ حاصل نہیں اس لئے کہ ایمان کا تعلق انسان کے دل سے ہے زبان سے نہیں۔ جب تک انسان کا دل ہی مطمئن نہ ہو وہ زبان سے لاکھ ایمان کے دعوے کرے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسے لوگوں کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ ایسے لوگ اللہ کی میزان میں منافق ہیں اور وہ کافروں سے بدتر ہیں۔

بہت سے لوگ زمانۂ عہد نبوت میں مسلمانوں کی روز افزوں فتوحات سے مرعوب ہو کر ایمان لے آئے تھے ان کا ایمان کچھ عقل و بصیرت پر مبنی نہیں تھا۔ حق تعالیٰ نے ان سے واضح طور پر فرما دیا تھا:۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ---------- اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (۴۹/۱۴-۱۵)

ترجمہ:۔ اعرابی کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں اے پیغمبر اسلام! آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ ایمان نہیں لائے البتہ یوں کہو کہ ہم مطیع و فرماں بردار ہو گئے ہیں۔ اور (یہ اس لئے کہ) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں جاگزیں نہیں

ہوا ---------- مؤمن تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر (دل سے) ایمان لائیں پھر کسی شک و شبہ میں گرفتار نہ ہوں اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ یہ لوگ ہیں سچے مؤمن۔

جس کا دل مطمئن نہ ہو اور وہ صرف زبان سے ایمان کا اقرار کر رہا ہو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کی میزان میں ایمان نہیں ہے۔ لیکن جس کا دل ایمان پر مطمئن ہو اور وہ بمجبوری زبان سے کفر کا اقرار کر رہا ہو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ کی میزان میں صحیح ایمان ہے:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (۱۶/۱۰۶)

ترجمہ:۔ جو لوگ اپنے ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کریں، بجز اس شخص کے جس پر جبر کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو، اور کفر کے ساتھ ان کا شرح صدر ہو گیا ہو تو ایسے لوگوں پر اللہ کی طرف سے غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کے یہاں وہی ایمان معتبر ہے جو اعماق قلب سے ابھرے، زبانی انکار و اقرار کا کوئی اعتبار نہیں جس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو وہ مؤمن ہے خواہ وہ زبان سے کفریہ کلمات (کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے) کہہ رہا ہو۔ اور جس کا

دل ایمان کے ساتھ مطمئن نہ ہو اور زبان سے ایمان کے بلند بانگ دعوے کر رہا ہو۔ اللہ کے ہاں اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے ایمان اور کفر کا مدار قلبی کیفیت پر ہے۔ زبانی دعووں پر نہیں ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

قرآن کریم نے واشگاف الفاظ میں اعلان فرمادیا ہے:۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔

(۲/۲۵۶)

ترجمہ:۔ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے ہدایت، گمراہی سے واضح اور متمیز ہوچکی ہے۔

اور

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔

(۱۸/۲۹)

ترجمہ:۔ اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے (آچکا) ہے تو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کردے۔

اور

اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○

(۸۸/۲۱-۲۲)

ترجمہ:۔ (اے پیغمبر!) آپ تو محض نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان کے اوپر کوئی داروغہ نہیں ہیں۔

آپ کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ آپ انہیں زور اور زبردستی سے

مسلمان بنائیں۔

ایک شخص جو مسلمان ہوا اور اس کے بعد اس کا دل ایمان پر مطمئن نہ رہا، اسے کسی دوسرے مذہب پر انشراح قلب ہوگیا ہے اور وہ اسلام کو چھوڑ دینا چاہتا ہے تو قرآن کی ہدایت کے مطابق اسے تبدیل دین کی اجازت نہ دینے اور تبدیل دین کے بعد اسے قتل کی سزا دینے کے معنے یہی تو ہیں کہ آپ اسے اسلام پر کاربند رہنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ آپ سوچئے تو سہی کہ دل میں ایمان نہیں مگر آپ زبردستی اسے مسلمان کہلوانے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ موت کے خوف سے اپنے آپ کو مسلمان کہہ رہا ہے اور کہلوا رہا ہے۔ کیا آپ اسے مسلمان کہہ سکتے ہیں؟ اگر اسے مسلمان کہا جاسکتا ہے تو مجھے بتایا جائے کہ منافق اور کسے کہتے ہیں؟ اس طرح تو ہم اپنے حلقہ میں منافقین کا ایک طبقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کی رو سے منافقین تو کفار اور مشرکین سے بھی بدتر ہیں:۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ○

(۴/۱۴۵)

ترجمہ:۔ منافقین تو جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور اے پیغمبر آپ ان کے لئے کوئی مددگار نہیں پائیں گے۔

ایسا آدمی جس کا دل اسلام پر مطمئن نہیں اور اسے کسی اور مذہب پر انشراح قلب ہوگیا ہے کیا اسلام کے لئے کسی درجہ میں بھی کچھ مفید ہوسکتا ہے؟ وہ یقیناً مفید نہیں ہوسکتا۔ وہ آگے چل کر مارِ آستین ہی ثابت ہوگا۔ یقیناً ایسے مسلمانوں کی اسلام کو ضرورت

نہیں ہے۔

قرآن کریم کی عام تعلیمات کا مآل یہی ہے کہ نہ کسی کو مسلمان بنانے کے لئے کسی قسم کا جبر و اکراہ کیا جا سکتا ہے نہ کسی کو مسلمان رہنے کے لئے کسی قسم کا جبر و اکراہ جائز ہے۔

ویسے قرآن کریم نے اشارۃً بھی مرتد کے لئے کسی قسم کی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ ملاحظہ فرمائیے سورۂ آل عمران میں ہے:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (۳/۸۴)

ترجمہ:۔ اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا خواہش مند ہوگا تو وہ اس سے کبھی بھی قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں ناکام و نامراد ہوگا۔

یہ تو ان لوگوں کا بیان ہوا جو دین اسلام قبول نہیں کرتے بلکہ وہ شروع ہی سے کسی اور دین کے پیرو ہیں۔ وہ جس دین کے بھی پیرو ہوں حق تعالیٰ کے ہاں اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد ان لوگوں کا بیان آ رہا ہے جو اسلام قبول کر لیتے ہیں اور پھر اسلام سے پھر جاتے ہیں اور کفر اختیار کر لیتے ہیں یعنی مرتد ہو جاتے ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد ہے:۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۳/۸۵-۸۸)

ترجمہ:۔ اللہ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ کیسے دکھا سکتا ہے جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں (یعنی مرتد ہو جائیں) حالانکہ وہ اس بات کی شہادت دے چکے تھے کہ رسول برحق ہے اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں آ چکی تھیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتے جو خود ہی اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہوں۔ ان لوگوں کا بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی، اور تمام لوگوں کی لعنت اور پھٹکار برستی رہے۔ وہ اس لعنت میں ہمیشہ ہمیشہ گرفتار رہیں اور اللہ کے عذاب میں ان سے کوئی تخفیف نہ کی جائے اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت دی جائے بجز ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اپنے اعمال درست کر لیں تو یقیناً حق تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔

قرآن کریم میں مرتدین کا بیان یہ ہے۔ اس بیان میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اشارۃً بھی نہیں فرمایا کہ ان لوگوں کو اس جرم کی پاداش میں قتل کر دیا جائے۔ قرآن کریم نے ان کی سزا (اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ) صراحت کے ساتھ یہی بتائی ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت اور پھٹکار برسے اور اس لعنت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرفتار رہیں، وہ عذاب الٰہی میں گرفتار رہیں اور

انہیں کوئی مہلت نہ دی جائے۔ یہ ساری اُخروی سزائیں ہیں۔ اس کے بعد پھر یہ بھی تصریح ہے کہ اس کے بعد بھی ان لوگوں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر اس کے بعد توبہ کرلیں اور اپنے اعمال درست کرلیں تو اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور بڑے مہربان ہیں۔ وَاَصْلَحُوْا کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ یعنی تقیہ کے طور پر موت کے خوف سے مسلمان ہونا سود مند نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ سچ مچ سچے دل سے مسلمان ہوں اور اپنے اعمال درست کریں تو حق تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت انہیں قبول کرنے کے لئے اب بھی تیار ہے۔ اگلی آیات میں ایسے لوگوں کے طبعی موت سے مرجانے کا ذکر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ○ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ کُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِهٖ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ○ (۳/۸۹-۹۰)

ترجمہ: جن لوگوں نے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرلیا، پھر وہ کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔ یہی لوگ تو گمراہ ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور کفار ہونے کی حالت میں ہی وہ مرگئے تو اگر وہ زمین بھر سونا بھی اپنے فدیہ میں پیش کریں تو ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہی لوگ تو ہیں جن کے لئے دردناک عذاب

ہوگا اور ان کے لئے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔

غور فرمائیے اس آیت کریمہ میں بھی ایمان لانے کے بعد لوگوں کے کفر کرنے کا ذکر ہے۔ نہ صرف کفر کرنے کا بلکہ کفر میں بڑھتے چلے جانے کا۔ یہ لوگ مرتد بلکہ شدید درجہ کے مرتد ہیں۔ ان کے متعلق قتل کرنے کے حکم کے بجائے یہی بتایا گیا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ پھر اگلی آیت میں ارتداد ہی کی حالت میں اپنی طبعی موت مرجانے کا بیان ہے اور ان کے لئے یہی بتایا گیا کہ ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا اور انہیں کوئی مددگار نہیں ملے گا۔ انہی کے متعلق یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر وہ عذابِ الٰہی سے چھوٹنے کے لئے زمین بھر سونا بھی فدیہ میں پیش کریں گے تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان آیات کریمہ میں ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا (پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے) کا ٹکڑا خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ یعنی وہ مرتد ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ وہ کفر میں بڑھتے چلے جائیں۔ قتل کرکے ان کی زندگی ختم نہیں کردی جاتی بلکہ وہ مرتد ہونے کے بعد اس قابل رہتے ہیں کہ وہ اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ کیونکہ اگر وہ ارتداد کے بعد ہی قتل کردیئے جاتے تو اپنے کفر میں اضافہ کرتے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

اس کے بعد آگے بڑھئے۔ سورۂ نساء میں ارشادِ الٰہی ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰهُ لِیَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِیَهْدِیَهُمْ سَبِیْلًا ○ (۴/۱۳۷)

ترجمہ:۔ یقیناً جو لوگ ایمان لائے۔ پھر کفر کیا (مرتد ہو گئے) پھر ایمان لائے۔ اس کے بعد پھر کافر (مرتد) ہو گئے۔ اس کے بعد کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں اور نہ انہیں ہدایت کی راہ دکھانے والا ہے۔

یہاں صرف ایک بار مرتد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دو بار مرتد ہونے کا ذکر ہے کہ وہ ایک بار اسلام لائے اور مرتد ہو گئے۔ اس کے بعد دوبارہ اسلام لائے اور پھر مرتد ہو گئے بلکہ اپنے کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان کا کفر شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم نے یہ حکم نہیں دیا کہ انہیں ارتداد کی سزا میں قتل کر دو۔ بلکہ یہی ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی بخشش نہیں ہو سکے گی اور اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت کی راہ نہیں دکھائے گا۔

اس کے بعد اور آگے بڑھئے۔ سورۂ مائدہ میں حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○

(۵/۵۴)

ترجمہ:۔ اے پیروان دعوتِ ایمانی! تم میں سے جو آدمی بھی اپنے دین سے پھر جائے گا (مرتد ہو جائے گا) تو ہو جائے

حق تعالیٰ ایسے لوگوں کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے اللہ بھی محبت کرتا ہو گا اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہوں گے۔ وہ مؤمنوں کے لئے نہایت نرم خو ہوں گے اور کافروں کے لئے نہایت سخت ہوں گے۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہے دیدے اور اللہ بڑی وسعتوں والا اور جاننے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں تو مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ (تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے) ارتداد کا لفظ ہی حق تعالیٰ نے استعمال فرما کر بات کو واضح سے واضح تر کر دیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تم میں سے کوئی مرتد ہو جاتا ہے تو مرتد ہو جائے وہ اسلام کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ایسے لوگوں کی جگہ ہم ان لوگوں کو لے آئیں گے جو صحیح مؤمنانہ صفات کے پیکر ہوں گے۔ یعنی مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو ہو جانے دو۔ تم اس کی ذرا پروا نہ کرو۔ اس آیت میں بھی کہیں اشارۃً تک نہیں فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو قتل کر دو۔ قتل کرنا تو درکنار یہاں تو صاف طریقہ سے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرما دیا گیا ہے کہ کوئی مرتد ہوتا ہے تو اسے ہونے دو۔ اس کی بالکل پروا نہ کرو۔ ایسے لوگوں کی جگہ دوسرے صحیح لوگ آجائیں گے جو اسلام کے لئے مفید ہوں گے۔

اس کے بعد سورۂ نحل کی اس آیت کریمہ پر پھر غور فرمائیے جس کا ایک حصہ پہلے بھی گذر چکا ہے۔ کیونکہ بعض حضرات اس سے قتل مرتد

پر استدلال کرتے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا تھا:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

(۱۶/۱۰۶)

ترجمہ:۔ جو آدمی اپنے ایمان لے آنے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے (کافر اور مرتد ہو جائے) بجز اس آدمی کے جس کو (کفر پر) مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو (تو وہ مستثنیٰ ہے) لیکن (بات اس کی ہو رہی ہے) جس کو کفر کے ساتھ شرح صدر ہو جائے تو ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوگا اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا۔

اس آیت کریمہ میں ارتداد کی سزا (قتل نہیں بلکہ) غضب الٰہی کا نزول اور آخرت کا بڑا عذاب بتائی گئی ہے۔ اس سے اگلی آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ سزا کیوں دی جائے گی:۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۱۶/۱۰۷)

ترجمہ:۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ان لوگوں نے آخرت کے مقابلے میں حیاتِ دنیوی ہی کو پسند کر لیا ہے اور اللہ کافروں کی قوم کو سیدھی راہ نہیں دکھایا کرتا۔

اس آیت کریمہ میں ان لوگوں پر غضب الٰہی نازل ہونے اور آخرت میں سخت عذاب دیئے جانے کی وجہ حق تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ

ان لوگوں نے آخرت کے مقابلہ میں حیاتِ دنیوی ہی کو پسند کر لیا ہے یا مستقبل کی کامرانیوں کے بجائے جو نظر نہیں آتیں پیش پا افتادہ مفادات کو جو سامنے نظر آ رہے ہیں اختیار کر لیا ہے۔ مگر یہ کیفیت انہی لوگوں کی انوکھی نہیں ہے جو ایمان لانے کے بعد کفر کرتے (مرتد ہو جاتے) ہیں۔ بعینہٖ یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کفر پہ پیدا ہوئے اور کفر پہ ہی زندہ رہے اور کفر پہ ہی مر گئے۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں ہے:۔

وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ○ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ○ (۱۴/۲-۳)

ترجمہ:۔ اور کفر کرنے والوں کے لئے سخت عذاب کی وجہ سے بڑی تباہی ہے جو حیاتِ دنیوی کو آخرت کے مقابلے میں بہت پسند کرتے ہیں، لوگوں کو (اللہ کی) راہ سے روکتے ہیں اور اس میں کجی کو تلاش کرتے ہیں یہی لوگ تو ہیں جو دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

نیز سورۂ بقرہ میں یہود کی بداعمالیوں کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے ان کے متعلق بھی فرمایا ہے:۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○

(۲/۸۶)

ترجمہ :۔ یہی لوگ تو ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے
میں حیات دنیوی ہی کو خرید لیا (اختیار کر لیا) ہے۔
تو ان سے عذاب میں تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ان کی
کوئی مدد کی جائے گی۔

ان تمام آیاتِ کریمہ سے ثابت ہے کہ بعینہٖ یہی کیفیت دوسرے کافروں کی بھی ہوتی ہے۔

اس کے بعد اگلی آیت میں ان لوگوں کی جو ایمان لانے کے بعد کفر کرتے (یعنی مرتد ہو جاتے) ہیں ایک دوسری خصوصیت یہ بیان فرمائی گئی ہے :۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ
وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○ (۱۶/۱۰۸)

ترجمہ :۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، جن کے
کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے (ان کی صلاحیت
گم کر دی ہے) اور یہی لوگ تو غافل ہیں۔

مگر یہ کیفیت بھی محض ایمان لانے کے بعد جو کافر (مرتد) ہو جائیں انہی کی نہیں ہوتی بلکہ تمام کفار کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے :۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ
أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ
قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ (۲/۶-۵)

ترجمہ :۔ یقیناً جو لوگ کافر ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے
اے پیغمبر! آپ انہیں (ان کے کفر کے نتائج سے) ڈرائیں
یا نہ ڈرائیں (وہ ایمان لانے والے نہیں) اللہ نے ان کے
دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں
پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

قرآن کریم تو بتا رہا ہے کہ شروع میں بھی اسلام سے انکار وہی لوگ کرتے ہیں جن میں صحیح بصیرت نہیں ہوتی اور جو اپنی صلاحیتوں (دلوں، کانوں اور آنکھوں) کو مردہ کر لیتے ہیں اور اسلام لانے کے بعد اسلام سے بھی وہی لوگ پھر جاتے ہیں جنہوں نے اپنی انہی صلاحیتوں کو ختم کر لیا ہو۔ لہٰذا اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شروع ہی سے انکار (کفر) کرنے والوں اور اسلام لانے کے بعد انکار (کفر) کرنے والوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لہٰذا جس طرح شروع ہی سے کفر کرنے والوں کو اسلام کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہی اسلام لا کر کفر کرنے والوں (مرتدوں) کو مسلمان رہنے کے لئے بھی مجبور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر قتل مرتد کا نظریہ پیدا کیسے ہو گیا جبکہ قرآن کریم اس سلسلہ میں اس قدر واضح ہدایات دے رہا ہے اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے متعلق جو روایات میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حضرات مرتدین کو قتل فرما دیا کرتے تھے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں عرب میں مسلمان اور مشرکین کے دو متخالف کیمپ تھے۔ جو شخص اسلام سے پھرتا (مرتد ہوتا) تھا وہ فوراً مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ یہ دونوں کیمپ متحارب کیمپوں میں شامل تھے وہ مخالف کیمپ میں شامل ہو کر اسلام کے خلاف سرگرمیاں شروع کر دیتا تھا اور باغیانہ حرکات کا صدور اس سے ہوتا تھا۔ ارتداد اور بغاوت ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ اس زمانہ میں ارتداد محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا نام نہیں تھا بلکہ نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تخریب کاری، قتل و غارت گری اور بغاوت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ ایسے مرتدین کو قتل کر دیا جاتا تھا۔

تمام صحاح ستہ کی کتابوں میں عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ارتداد کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے جو قبیلہ عکل اور عرینہ قبیلے کے آدمیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے کہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہونے کی باتیں کیں انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم جانور پالا کرتے تھے۔ کھیتی باڑی کے عادی نہیں ہیں۔ مدینہ کی آب و ہوا بھی ہمیں راس نہیں آ رہی ہے۔ چنانچہ ان کو استسقاء کی بیماری ہو گئی تھی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں صدقہ کے اونٹ دیئے اور ایک چرواہا بھی ساتھ کر دیا اور فرمایا کہ ان اونٹوں کو لے جاؤ اور کسی جنگل میں رہائش اختیار کر لو اور ان اونٹوں کا دودھ اور ان کا پیشاب پیو

(اس زمانہ میں استسقاء کی بیماری کا یہی علاج مشہور تھا) چنانچہ وہ مدینہ سے کچھ فاصلہ پر حرّہ کے ایک کنارے پر فروکش ہو گئے۔ کچھ عرصہ وہیں قیام کیا اور تندرست ہو گئے اور اس کے بعد شیطان نے انہیں بہکایا چنانچہ وہ اسلام سے پھر گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو راعی ان کے ساتھ کیا تھا اسے قتل کیا اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیں پھیریں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے اور اونٹوں کو ہانک کر چلتے بنے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ان کی تلاش کے لئے ایک دستہ بھیجا۔ وہ گرفتار کر کے لائے گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھروائیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور حرہ کے میدان میں انہیں چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ وہ اسی حال میں مر گئے۔

قتادہ کہتے ہیں کہ ابن سیرین نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ واقعہ حدود کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے جبکہ مثلہ کرنے (صورت بگاڑنے) کی ممانعت نہیں تھی۔ اسی روایت میں دوسری سند سے یہ بھی آیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چرواہے کے ساتھ یہی حرکات کی تھیں۔ ابو قلابہ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں نے چوری، ڈاکہ، قتل اور کفر کا ارتکاب کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ کی تھی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ہم تک یہ بات بھی پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس واقعہ کے بعد صدقے کا حکم فرمایا کرتے اور مُثلہ کرنے (صورتیں بگاڑنے) سے منع فرمایا کرتے تھے۔

(بخاری، مسلم و باقی صحاح ستہ و مؤطا امام مالکؒ بحوالہ

جمع الفوائد صفحہ ۲۸۴ ج ۱)

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنۂ ارتداد کا واقعہ بڑا مشہور ہے جس کو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسلح مزاحمت کے بعد بڑی تندہی کے ساتھ فرو فرمایا تھا۔ یہ بھی محض نظریئے اور عقیدے کی تبدیلی کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسلح بغاوت و مزاحمت اور مرکز کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار پر مشتمل تھا اور خود مرتدین کی طرف سے اس کی ابتداء ہوئی تھی۔ اور مدینہ منورہ پر ان کے حملے شروع ہو گئے تھے۔ یہ بھی مسلح بغاوت تھی۔ یہ اتنی واضح بات ہے جس کے لئے کسی حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی ہم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا ایک خطبہ طبری سے نقل کئے دیتے ہیں۔ جس میں اس تمام صورتِ حال کی پوری نشان دہی کر دی گئی ہے۔ مرتدین کے وفود کے مدینے سے چلے جانے کے بعد اہل مدینہ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا:۔

ان الارض کافرۃ وقد رأی وفدھم منکم قلۃ وانکم لاتدرون اللیلا تؤتون امرنھارا۔ و ادناھم منکم علی برید وکان القوم یأملون ان نقبل منھم ونواعھم۔ وقد ابینا علیھم ونبذنا الیھم عھدھم فاستعدوا واعدوا۔ فما لبثوا الا ثلاثا حتی طرقوا المدینۃ غارۃ مع اللیل وخلفوا بعضھم بذی حسیٰ لیکونوا لھم ردأ۔

(تاریخ طبری صفحہ ۱۸۷۴ ج ۴ مطبوعہ یورپ)

ترجمہ:۔ "ساری سرزمین (عرب) کافر ہو چکی ہے اور ان کے وفد نے تمہاری قلت تعداد دیکھ لی ہے۔ تمہیں کچھ پتہ نہیں کہ وہ تم پر رات کو چڑھ دوڑیں یا دن کو۔ اور ان کے قریب ترین لشکر تم سے ایک برید (منزل یعنی بارہ میل) کے فاصلے پر ہیں اور ان لوگوں کو یہ توقع تھی کہ ہم ان کے مطالبات مان لیں گے اور ان کے مطالبات تسلیم کر لیں گے۔ مگر ہم نے انکار کر دیا اور ان کا عہد ان کی طرف لوٹا دیا تو وہ جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ لہٰذا تم بھی تیاری کرو۔" تو تین دن ہی گذرے تھے کہ انہوں نے مدینہ منورہ پر حملہ کر دیا اور رات ہوتے ہی ہلّہ بول دیا اور اپنی ایک جمعیت کو اپنے پیچھے ذی حسیٰ کے مقام پر تعینات کر دیا تاکہ وہ ان کی پشت پناہ ثابت ہوں۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ ابتداء اسلام میں ارتداد اور بغاوت کچھ لازم و ملزوم سے تھے۔ جو مرتد ہوتا تھا وہ بغاوت بھی کرتا تھا۔ وہ اسلامی مملکت میں تبدیلیٔ دین کے بعد پُرامن شہری کی حیثیت سے ذمی بن کر نہیں رہتا تھا بلکہ مسلح بغاوت کرتا تھا اور مخالف کیمپ میں چلا جاتا تھا۔ اس وقت کے حالات کو عام حالات پر قیاس کر لینا صحیح نہیں ہے۔ اس وقت اسلامی مملکت اپنے ابتدائی دور میں تھی اور اسے مختلف قوموں سے نبرد آزمائی کرنی پڑ رہی تھی۔ اسلامی مملکت کی تمام سرحدوں پر جنگ و جدال کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اپنے ملک کے کسی آدمی

کے مرتد ہو جانے کے معنے صرف یہی نہیں تھے کہ اس نے اپنا نظریہ اور عقیدہ تبدیل کر لیا۔ بلکہ وہ محارب گروہ سے مل جاتا اور اپنی مملکت کے بہت سے قیمتی راز اپنے ساتھ لے جاتا اور دشمن کو بتا دیتا تھا۔ بہت سے لوگ محض جاسوسی کرنے اور ہمارے دفاعی راز معلوم کرنے کے لئے آجاتے اور بظاہر مسلمان ہو جاتے تھے۔ اور اپنا کام کر لینے کے بعد اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ان تمام باتوں کو سربراہِ مملکت اور عمائدین سلطنت ہی سمجھتے تھے اور جیسا مناسب سمجھتے فیصلے کرتے تھے۔ اس وقت کے ہنگامی حالات میں جبکہ اسلامی مملکت ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھی عمال حکومت نے جو فیصلے کئے تھے اُنہیں آج کے پُرامن حالات پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ روایات کے ذریعہ سے ہم تک جو کچھ پہنچا ہے وہ اس وقت کے فیصلے ہی فیصلے ہیں۔ ان فیصلوں کا پس منظر اور اس وقت کے خصوصی حالات کو راویوں نے بیان نہیں کیا۔ اس لئے محض روایات کے ذریعے سے قرآن کریم سے بے نیاز ہو کر ہم کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے فقہاء کرام میں خصوصیت کے ساتھ سادات حنفیہ نے (شکر اللہ سعیہم) اس حقیقت کو سمجھا ہے اور انہوں نے مرتد عورت، مرتد نابینا، مرتد معذور، مرتد شیخ فانی کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے صراحت فرما دی ہے کہ ان لوگوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ارتداد میں قتل کی اصل علت ارتداد نہیں ہے بلکہ حِرَابَہ (بغاوت اور مسلح جنگ) ہے۔ چونکہ یہ لوگ بغاوت اور

مسلح جنگ کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا ان کو قتل بھی نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ہدایہ میں وَاَمَّا الْمُرْتَدَّۃُ فَلَا تُقْتَلُ (اور مرتد عورت قتل نہیں کی جائے گی) کے تحت میں لکھا ہے:۔

وَلَنَا اَنَّ النبی صلے اللہ علیہ وسلم نھی عن قتل النساء۔ ولان الاصل تاخیر الاجزیۃ الی دار الاخرۃ اذ تعجیلھا یخل بمعنی الابتلاء وانما عدل عنہ دفعا لشرناجز وھو الحراب ولا یتوجہ ذالک من النساء لعدم صلاحیۃ البنیۃ بخلاف الرجال فصارت المرتدۃ کالاصلیۃ۔ (ہدایہ ج ۲ ص ۶۰۱)

ترجمہ:۔ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے اور کیونکہ سزاؤں میں اصول یہی ہے کہ اُنہیں دار آخرت تک مؤخر کیا جائے۔ کیونکہ (دنیا ہی میں) جلد سزا دینا (بندوں کی) آزمائش و ابتلاء کے مفہوم کو غلط کر دیتا ہے۔ کسی فوری شر کو دفع کرنے کے لئے ہی اس سے انحراف کیا جا سکتا ہے اور وہ مسلح جنگ ہے جو عورتوں کی طرف سے ممکن نہیں ہے کیونکہ عورتوں کی جسمانی ساخت ہی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بخلاف مردوں کے۔ اس لئے مرتد ہو جانے والی عورت کا حکم اس کافر عورت ہی کی طرح ہو گا جو شروع سے (اصل میں) کافر ہی ہو۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ صاحب ہدایہ بتا رہے ہیں کہ سزاؤں کے

معاملہ میں اصل قانون یہی ہے کہ اُنہیں دار الجزاء تک مؤخر رکھا جائے البتہ کسی فوری شر کے دفعیہ کے لئے اس اصل سے انحراف کرکے اس دنیا میں سزا دی جاسکتی ہے جیسے وہ جرائم جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو مثلاً چوری، زنا، قذف وغیرہ ایسے ہی ارتداد میں مرتد کی طرف سے مسلح جنگ اور بغاوت، عورت اور معذور افراد میں چونکہ مسلح جنگ اور بغاوت کا امکان نہیں ہوتا اس لئے ان کو قتل بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال مرتد کا قتل ارتداد کی وجہ سے نہیں بلکہ حرابہ کی وجہ سے ہے۔

ہدایہ کے اس مسئلہ کے ذیل میں محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ :-

وهذا اى قوله نهى عن قتل النساء مطلق يعم الكافرة اصليا وعارضا وثبت تعليله صلى الله عليه وسلم بالعلة المنصوصة فى الحديث من عدم حرابها بقوله (ما كانت هذه لتقاتل) فكان مخصصا لعموم ماروا ه الشافعيؒ من قوله صلى الله عليه وسلم (من بدل دينه فاقتلوه) بعد ان عمومه مخصص بمن بدل دينه من الاسلام الى الكفر وايضا فان الاصل تاخير الاجزية الى دار الاخرة وانما عدل عنه دفعا لشر ناجز لمصالح تعود الينا فى هذه الدار كالقصاص وحد القذف والشرب والزنا والسرقة شرعت لحفظ النفوس والاعراض

والعقول والانساب والاموال فكذا يجب فى القتل فى الردة ان يكون لدفع شر حرابة لاجزاءً على الكفر لان جزائه اعظم من ذلك عند الله تعالى فيختص بمن يتاتى منه الحراب وهو الرجل ولهذا نهى النبى صلى الله عليه وسلم عن قتل النساء وعلله بانها لم تكن تقاتل على ما صح من الحديث ولهذا قلنا لو كانت المرتدة ذات رأى و تبع تقتل لا لردتها بل لانها تسعى فى الارض بالفساد الخ

(فتح القدیر ص ۳۱۱ ج ۵)

ترجمہ :- حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ آپ نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے مطلق ہے جو اصلی کافر عورت کو اور اس عورت کو جو بعد میں کافر ہو گئی ہو شامل ہے اور آپؐ کا اس کی یہ علّت بیان کرنا (جو حدیث میں منصوص علّت ہے) یعنی اس کا جنگ نہ کرنا۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد ہے کہ " یہ تو جنگ کرنے والی نہیں تھی" تو یہ ارشاد اُس روایت کے عموم کو خاص کر دیتا ہے جو امام شافعیؒ نے بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کر دو" ہماری اس بیان کردہ تخصیص سے پہلے بھی تمام حضرات کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا عموم اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو اپنا دین اسلام سے کفر کی طرف تبدیل کرلے (یہ نہیں کہ اگر کوئی

یہودی ہے اور وہ عیسائی ہونا چاہتا ہے تو اسے بھی دین تبدیل کرنے پر قتل کر دیا جائے) نیز یہ بات بھی ہے کہ اصل قانون جزاؤں میں ان کو دار آخرت کی طرف مؤخر کرنے کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شر کی مدافعت کے لئے ان مصلحتوں کی خاطر کیا جاتا ہے جو ہم بندوں کی طرف اس دنیا میں عائد ہوتی ہوں۔ مثلاً قصاص، حد قذف، حد شرب حد زنا، حد سرقہ، نفوس، عزت و آبرو، دیات، انساب اور اموال وغیرہ کی حفاظت کے لئے تو ایسے ہی ارتداد کے اندر قتل میں بھی ضروری ہے کہ وہ بھی اس کے حرابہ (بغاوت و جنگ) کے شر کی مداخلت کے لئے ہو نہ کہ کفر کی جزاء کے لئے کیونکہ کفر کی جزاء تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی تو یہ جزاء اس شخص کے ساتھ مخصوص ہوگی جس سے بغاوت اور جنگ صادر ہو سکے اور وہ مرد ہی ہو سکتا ہے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو قتل کرنے سے منع فرما دیا ہے اور اس کی وجہ یہی بیان فرمائی کہ یہ بیچاری کونسی جنگ کر رہی تھی۔ جیسا کہ حدیث نبوی سے صحیح طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ اگر مرتد ہونے والی عورت صاحب رائے و اختیار ہو اور لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں تو وہ قتل کر دی جائے گی۔ لیکن اس کو اس کے مرتد ہونے کی وجہ سے قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ اس لئے قتل کیا جائے گا کہ وہ زمین میں فساد اور فتنہ پھیلانے کی

کوشش کر رہی ہے۔

اسی طرح صاحب ہدایہ کے اس قول پر کہ "ولا قتل الا بالحراب" (اور قتل نہیں کیا جا سکتا مگر بغاوت کے جرم میں) صاحب عنایہ (شرح ہدایہ) نے لکھا ہے:۔

فکان القتل ھٰھنا مستلزما للحراب لان نفس الکفر لیس بمبیح للقتل حتی لا یقتل الاعمیٰ والمقعد والشیخ الفانی۔ وقد تحقق الملزوم بالاتفاق وھو کونہ حربیا فمن یقتل فلا بد من کونہ حربیا۔

(عنایہ برحاشیہ ہدایہ ص ۶۰۱/۲)

ترجمہ:۔ تو اس سلسلہ میں قتل کی سزا جنگ اور بغاوت کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ نفس کفر قتل کو حلال کرنے والا نہیں ہے۔ حتی کہ نابینا آدمی، معذور آدمی، بوڑھا پھونس آدمی (اگر مرتد ہو جائیں) تو قتل نہیں کئے جاتے۔ جس امر پر قتل کرنا لازم آتا ہے وہ بالاتفاق متحقق ہو گیا ہے یعنی اس کا محارب ہونا تو جو شخص قتل کیا جائے گا اس کا محارب ہونا ضروری ہے۔

صاحب ہدایہ اور ہدایہ کے شارح محقق ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ نے معاملہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے کہ:۔

"اصل قانون سزاؤں میں ان کو دار آخرت تک مؤخر کرنے کا ہے۔ اس سے انحراف کسی فوری شر کے دفعیہ کے لئے ان مصلحتوں کی خاطر کیا جاتا ہے جن کا تعلق ہم بندوں سے ہوتا ہے۔ مثلاً قصاص

حد قذف، حد شرب، حد زنا، حد سرقہ، جو نفوس، عزت و آبرو، دیات، انساب و اموال کی حفاظت کا باعث ہیں۔ ایسے ہی ارتداد میں بھی ضروری ہے کہ قتل کی سزا، اس کے حرابہ (بغاوت و جنگ) کے شر کے دفعیہ کے لئے ہو نہ کہ کفر کی سزا کے لئے کیونکہ کفر کی سزا تو اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑی ہوگی۔"

پھر صاحبِ عنایہ نے نابینا مرد، معذور مرد، شیخ فانی کی مثالیں دے کر بتادیا ہے کہ صرف عورتوں ہی میں نہیں، مردوں میں بھی اگر ایسے کچھ لوگ ہوں جن سے حرابہ (جنگ اور بغاوت) کا احتمال نہ ہو تو وہاں بھی قتل نہیں کیا جاتا جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ قتل ارتداد کی سزا نہیں ہے بلکہ حرابہ یعنی جنگ اور بغاوت کی سزا ہے۔

شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں اعلاء السنن میں یہ ایک روایت نقل فرمائی ہے:۔

عن عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد اللہ بن عبدن القاری عن ابیہ عن عمرؓ انہ قال لوفد قدموا علیہ من بنی ثور ھل من مغرب خبر قالوا نعم اخذنا رجلا من العرب کفر بعد اسلامہ فقدمناہ فضربنا عنقہ قال ھلا ادخلتموہ جوف بیت فالقیتم الیہ کل یوم رغیفا ثلثۃ ایام واستتبتموہ لعلہ یتوب او یراجع امر اللہ۔ اللّٰھُمَّ لم اشھد و لم امر ولم ارض اذ بلغنی رواہ مالک فی الموطا

(زیلعی ص۳۳۲ ج۳) وابو یوسف الامام فی الخراج (ص۲۱۲) وھو مرسل ورواہ عبد الرزاق عن معمر وابن ابی شیبہ عن ابن عیینۃ کلاھما عن محمد بن عبد الرحمٰن بن عبدہ القاری عن ابیہ فعلیٰ ھٰذا ھو متصل لان عبد الرحمٰن بن عبد سمع عمر (الجوھر النقی ص۱۷۳ ج۲) ورواہ البیھقی عن انس قال لما نزلنا علیٰ تستر وفیہ فقد منا علی عمر فقال یا انس ما فعل الستۃ الرھط من بکر بن وائل الذین ارتدوا عن الاسلام فلحقوا بالمشرکین قال یا امیر المؤمنین! قتلوا فی المعرکۃ فاسترجع قلت وھل کان سبیلھم الا القتل قال نعم کنت اعرض علیھم الاسلام فان ابوا ودعتھم السجن ذکرہ الحافظ فی التلخیص (ص۳۵ ج۲) وسکت عنہ فھو حسن او صحیح واسندہ ابن حزم فی المحلی (ص۱۹۱ ج۱۱) حدثنا عبد اللہ ابن ربیع نا عبد اللہ بن محمد بن عثمان نا علی بن عبد العزیز نا الحجاج بن المنھال نا حماد بن سلمۃ انا داؤد وھو ابن ابی ھند عن الشعبی عن انس بن مالک وصححہ۔

(اعلاء السنن ص۴۳۲ ج۱۲)

ترجمہ:۔ عبد الرحمٰن بن محمد بن عبد اللہ بن عبد، قاری سے روایت ہے انہوں نے اپنے والد سے، انہوں نے حضرت عمرؓ

سے نقل کیا کہ بنو ثور کا جب وفد حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ مغرب کے متعلق کوئی خبر ہے؟ انہوں نے کہا، ہاں! ہم نے ایک عرب کے آدمی کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا تھا ہم نے اسے آگے بڑھایا اور اس کی گردن ماردی، حضرت عمرؓ نے فرمایا تم نے اسے کسی گھر کے اندر قید کیوں نہ کر دیا کہ تین دن تک روزانہ اس کی طرف ایک روٹی ڈال دیا کرتے اور اس سے توبہ کرانے کی کوشش کرتے شاید وہ توبہ کر لیتا یا اللہ کے حکم کی طرف مراجعت کر لیتا۔ اے اللہ! میں نہ اس واقعہ میں موجود تھا نہ میں نے اس کا حکم دیا اور جب یہ بات مجھ تک پہنچی نہ اس پر راضی ہوا۔ اسے امام مالکؒ نے مؤطا میں بیان کیا ہے۔ (زیلعی ص۱۵۹ ج۲) اور امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج (ص۲۱۲) میں اور وہ مرسل ہے اسی کو عبدالرزاق نے معمر اور ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے انہوں نے ابن عیینہؒ سے، دونوں نے محمد بن عبدالرحمٰن بن عبد، قاری سے انہوں نے اپنے والد سے اور اس سند سے یہ متصل ہے کیونکہ عبدالرحمٰن بن عبد نے حضرت عمرؓ سے سنا ہے (الجوہر النقی ص۱۷۳ ج۲) اور اس کو بیہقی نے حضرت انسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب تستر (ایک مقام ہے) پر اترے --- اسی میں ہے --- تو ہم حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو آپ نے فرمایا کہ بکر بن وائل کی ان چھ آدمیوں کی

جماعت کا کیا ہوا جو اسلام سے مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملے تھے تو حضرت انسؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! وہ معرکہ میں قتل ہو گئے تو آپ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ تو میں نے کہا کہ کیا قتل کے سوا ان کی کوئی اور بھی سبیل تھی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ہاں! میں تو ان پر اسلام پیش کرتا۔ اگر وہ انکار کر دیتے تو میں انہیں قید خانے میں بند کر دیتا۔ اسے حافظؒ نے التلخیص الجبیر (ص۳۵ ج۲) میں ذکر کیا ہے اور اس سے سکوت فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث حسن یا صحیح ہے۔ اور اسے سند کے ساتھ ابن حزم نے محلی (ص۱۹۱ ج۱۱) میں بیان کیا ہے کہ ہم سے عبداللہ بن ربیع نے حدیث بیان کی انہوں نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن محمد بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ہم سے علی بن عبدالعزیز نے، انہوں نے کہا کہ ہم سے حجاج بن منہال نے، کہ ہم سے حماد بن سلمہ نے حدیث بیان کی کہ ہمیں داؤد یعنی ابن ابی ہند نے شعبی سے خبر دی انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور اسی حدیث کو صحیح کہا ہے۔

یہ ایک ہی واقعہ ہے یا دو واقعے ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ایک ہی واقعہ قرار دیا ہے۔ لیکن بظاہر یہ دو الگ الگ واقعے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک واقعہ عبداللہ بن عبد، قاری نے کسی ایک آدمی کا نقل کیا ہے اور دوسرا واقعہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بکر بن وائل کے چھ آدمیوں کا

بیان کیا ہے۔ بہرحال یہ ایک ہی واقعہ ہو یا دو واقعے ہوں حضرت عمرؓ نے مرتد کو قتل کرنے کا انکار فرمایا ہے اور قید کرنے کا حکم بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کو نقل فرمانے کے بعد حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ :۔

قلت استدل به بعض العلماء على ان المرتد يستتاب ابدا ولا يقتل ويودع السجن لما ورد في رواية البيهقي من قوله فان ابوا اودعتهم السجن ولا حجة لهم فيه فقد ورد في مرسل محمد ابن عبد الله القاري عند مالك تقييد الحبس بثلثة ايام والطرق يفسر بعضها بعضا فعليه يحمل ما في رواية انس عند البيهقي وغيره من ايداعهما السجن بالاطلاق فان المطلق يحمل على المقيد اذا كان مخرج الحديث واحدا ومواسيل مالك موصولة محتج بها كما مر في المقدمة۔

(اعلاء السنن ص۴۳۴ ج۱۲)

ترجمہ :۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے بعض علماء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ ہی کرانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ اسے قید خانہ میں ڈال دیا جائے گا۔ کیونکہ بیہقی کی روایت میں یہ آگیا ہے کہ اگر وہ انکار کرتے تو میں انہیں قید خانے

میں ڈال دیتا۔ اور اس میں ان لوگوں کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ محمد بن عبداللہ بن عبد، قاری کی روایت میں جو امام مالکؒ نے نقل فرمائی ہے تین دن تک قید میں ڈال دینے کی قید آگئی ہے اور حدیث کے طریقے ایک دوسرے کی تفسیر کر دیتے ہیں تو بیہقی وغیرہ میں جو حضرت انسؓ کی روایت آئی ہے یعنی مطلقاً قید خانے میں ڈال دینے کی روایت تو اسے مقید روایت یعنی تین دن تک قید میں ڈالنے والی روایت پر محمول کیا جائے گا۔ کیونکہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے۔ جب احادیث کا مخرج ایک ہی ہو اور امام مالکؒ کی مراسیل موصول ہوتی ہیں اور ان سے احتجاج کیا جاتا ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔

افسوس ہے کہ میری سمجھ میں یہ تقریر بالکل نہیں آئی۔ اول تو دو طرح کی روایتوں کو ایک واقعہ سے متعلق قرار دینا خلاف ظاہر ہے۔ کیونکہ محمد بن عبداللہ بن عبد، قاری کی روایت میں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ عرب کے ایک آدمی کا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بنو وائل کے چھ آدمیوں کی جماعت کا واقعہ ہے جو ظاہر ہے کہ وہی واقعہ نہیں ہے جو محمد بن عبداللہ بن عبد، قاری نے بیان کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد بھی محل نظر ہے کہ چونکہ محمد بن عبداللہ بن عبد کی روایت میں تین دن تک قید خانہ میں ڈال دینے کا بیان آگیا ہے اور حضرت انسؓ کی روایت میں مطلقاً قید خانہ میں ڈال دینے کا بیان ہے۔ لہٰذا یہاں مطلق (حضرت

انسؓ کی روایت) کو مقید (محمد بن عبداللہ بن عبد، قاری) کی روایت پر محمول کیا جائے گا جس میں تین دن تک قید رکھنے کا ذکر ہے۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مطلق روایت کو مقید روایت پر محمول کرنا شافعیہؒ کا مسلک تو ہے مگر حنفیہؒ کا مسلک نہیں ہے۔ اصول فقہ کی بنیادی درسی کتاب نورالانوار میں ہے:

والمطلق محمول علی المقید وان کانا فی حادثتین عند الشافعیؒ ویعلم منه انهما ان کانا فی حادثة واحدة فهو محمول علی المقید عنده ۔۔۔۔۔۔۔۔

وعندنا لایحمل المطلق علی المقید وان کانا فی حادثة واحدة لامکان العمل بهما اذ لا تضاد ولا تنافی بینهما فیکون فی الظهار الصیام والتحریر قبل التماس والطعام اعم من ان یکون قبل التماس او بعده۔ واذا کان فی حادثة واحدة ففی الحادثتین بالطریق الاولیٰ۔ (نورالانوار ص۱۵۸-۱۵۹ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی کراچی)

ترجمہ:۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک مطلق، مقید پر محمول ہوگا۔ اگرچہ وہ دونوں دو حادثوں کے متعلق ہوں اور اس سے معلوم ہوگیا کہ اگر دونوں ایک حادثہ کے متعلق ہوں تب بھی ان کے نزدیک مطلق، مقید پر ہی محمول ہوگا۔۔۔ ۔۔۔ اور ہمارے نزدیک مطلق، مقید پر محمول نہیں ہوتا خواہ وہ دونوں ایک حادثے کے متعلق ہی کیوں نہ

ہوں کیونکہ دونوں پر عمل ممکن ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان کوئی تضاد یا تنافی نہیں ہوتی۔ چنانچہ کفارۂ ظہار میں روزے رکھنا اور غلام آزاد کرنا بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ضروری ہے اور کھانا کھلانے میں کوئی پابندی نہیں۔ وہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور بعد میں بھی اور اگر مطلق اور مقید کا ایک حادثہ میں یہ حال ہے تو اگر وہ دو حادثوں میں واقع ہوں تو بطریق اولیٰ اسی پر عمل ہوگا۔

جبکہ فقہائے حنفیہؒ کا مسلک ہی یہ نہیں ہے کہ مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے۔ چنانچہ کفارۂ ظہار میں اگر روزے رکھ کر کفارہ ادا کرے یا غلام آزاد کر کے کفارہ ادا کرے تو اسے بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے یہ کفارے ادا کرنے چاہئیں کیونکہ کفارہ کی آیت (۵۸/۴-۳) میں ان دونوں کفاروں کے ساتھ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا کی قید لگی ہوئی ہے اور مساکین کو کھانا کھلانے کے کفارہ میں (۵۸/۴) یہ قید لگی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ حکم مطلق ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ یہاں مطلق روایت کو مقید روایت پر محمول کر لیا جائے ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

بہرحال امام مالکؒ کی روایت جو مرسل ہے وہ حضرت انسؓ کی روایت کا جو مسند ہے مقابلہ نہیں کر سکتی۔ حضرت انسؓ کی روایت کو ترجیح ہونی چاہیئے۔ لہٰذا بعض اہل علم کا استدلال کرنا ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے ان بعض اہل علم

کا نام نہیں بتایا جنہوں نے یہ استدلال فرمایا ہے۔ لیکن اجمالاً اتنا معلوم ہوگیا کہ سلف میں سے بعض اہل علم قتل مرتد کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اسی کے قائل ہیں کہ مرتدین سے توبہ کرانے کی کوشش کی جائے گی ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلہ میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :-

قال الموفق فی المغنی واجمع اهل العلم علیٰ وجوب قتل المرتد روی ذٰلك عن ابی بکر وعمر وعثمان وعلی ومعاذ وابی موسیٰ وابن عباس وغیرهم ولم ینکر ذٰلك فکان اجماعًا وقال النخعی لیستتاب ابدا وهٰذا یفضی الی ان لا یقتل ابدا وهو مخالف للسنة والاجماع الخ ملخصًا (اعلاء السنن ص ۴۳۴ ج ۱۲)

ترجمہ :- موفق نے المغنی میں لکھا ہے کہ اہل علم نے مرتد کے قتل پر اجماع کیا ہے چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ علیؓ، معاذ بن جبلؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ، ابن عباسؓ وغیرہم رضی اللہ عنہم سے ایسا ہی مروی ہے اور اس کا انکار نہیں کیا گیا تو یہ اجماع ہوگیا اور امام ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے ہمیشہ توبہ ہی کرائی جائے گی۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ مرتد کو کبھی بھی قتل نہیں کیا جا سکتا اور یہ قول سنت اور اجماع کے خلاف ہے۔

صاحبِ مغنی اور دیگر فقہاء کا یہ ارشاد کہ اس مسئلہ پر کہ مرتد کو قتل کر دینا واجب ہے اجماع ہو چکا ہے محل نظر ہے جبکہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ پہلے بعض اہل علم کا یہ قول نقل فرما چکے ہیں کہ مرتد سے ہمیشہ توبہ کرانے کی کوشش کی جائے گی اور اسے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ نیز خود صاحب مغنی نے امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے کہ وہ بھی توبہ کرانے کے قائل ہیں، قتل کر دینے کے قائل نہیں ہیں۔ حضرت امام ابراہیم نخعیؒ کبار تابعین میں سے ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ الاستاذ ہیں۔ کیونکہ امام ابوحنیفہؒ امام حماد کے شاگرد ہیں اور امام حمادؒ، ابراہیم نخعیؒ کے شاگرد ہیں۔ تو امام نخعیؒ جیسے امام اور فقیہ کے اس قول کے بعد اجماع کا دعویٰ کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں کہ جو حضرات قتل مرتد کے قائل ہیں وہ اس مرتد کے قتل کے قائل ہیں جو محارب بھی ہو۔ لیکن جو محارب نہ ہو اس کو قتل کرنے کے قائل تو خود فقہائے حنفیہؒ بھی نہیں ہیں چنانچہ ہم ہدایہ، فتح القدیر اور عنایہ کے تصریحات سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عورتوں کو، اندھوں کو، اپاہجوں کو، شیوخ فانی کو اگر وہ مرتد ہو جائیں خود فقہائے حنفیہؒ کے نزدیک بھی قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان سے بغاوت اور محاربت کا اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔

قتل مرتد کے سلسلہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت (بخاری) اور معاویہ بن حیدہ کی روایت (طبرانی کبیر) سے نقل کی

جاتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ (جو اپنا دین بدل دے اسے قتل کردو) تو اس حدیث سے قتل مرتد پر استدلال کرنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس حدیث کا مآل تو یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنا دین تبدیل کرلے اسے قتل کردینا چاہیئے۔ جو کفر و شرک سے توبہ کرکے مسلمان ہو جائے اسے بھی قتل کر دینا ضروری ہو۔ کیونکہ اپنا دین تو وہ بھی تبدیل کرتا ہے۔ جو یہودی یہودیت سے تائب ہو کر عیسائی ہو جائے اسے بھی قتل کردو۔ کیونکہ وہ بھی اپنا دین تبدیل کر رہا ہے ظاہر ہے کہ حدیث نبوی کا یہ مقصد نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ دین کا لفظ عربی میں بہت سے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ازاں جملہ غلبہ، اقتدار، حکومت، مملکت آئین، قانون، نظم و نسق، فیصلہ، کھٹوس نتیجہ، جزاء و سزا، بدلہ کے معنوں میں۔ دوسری طرف یہ لفظ اطاعت اور فرماں برداری کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ (تاج العروس و محیط المحیط)

قرآن کریم میں بھی دین کا لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں نظام معاشرہ، ضابطۂ زندگی، قانون حکومت، آئین مملکت، نظم اجتماعی، عدل وغیرہ کی مختلف اصطلاحات رائج ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے ان سب کی جگہ ایک جامع اصطلاح دی ہے اور وہ ہے الدین۔ یہی ہمارے معاشرہ کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین ہے۔

لہٰذا جو فرد بھی ہمارے معاشرے کا نظام، ہماری زندگی کا ضابطہ، ہماری حکومت کا قانون اور ہماری مملکت کا آئین بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں بغاوت، انارکی اور فتنہ و فساد پھیلائے اس کی سزا قتل ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے عین مطابق ہے:۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ (۵/۳۳)

ترجمہ:۔ ان لوگوں کی جزاء جو اللہ اور اس رسول سے جنگ کریں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں صرف یہی ہے کہ انہیں بری طرح قتل کیا جائے۔ انہیں پھانسی دیدی جائے، ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہت سے کاٹ دیئے جائیں۔ انہیں سرزمین اسلام سے ملک بدر کردیا جائے۔ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

لہٰذا جو شخص اپنے دین کو اس معنی میں بدلنا چاہے یعنی اسلامی معاشرتی نظام، اسلامی ضابطۂ زندگی، اسلامی قانون حکومت، اسلامی آئین مملکت کو بدلنے کی کوشش کرے اور ملک میں فتنہ و فساد پھیلا کر بغاوت کا ارتکاب کرے اس کو قتل کردینا

واجب ہے۔

اس حدیث کا یہ مطلب لینا اس لئے ضروری ہے کہ اسی طرح اس ارشاد نبوی کو (اگر یہ واقعی ارشاد نبوی ہے اور اس کا ارشاد نبوی ہونا ثابت ہوجائے) قرآن کریم کی تصریحات اور نصوص صریحہ سے جن کو ہم شروع باب میں بیان کر چکے ہیں تطبیق دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ صحیحین (بخاری و مسلم) اور حدیث کی باقی کتابوں میں ایسی واضح احادیث بھی ملتی ہیں جن میں صرف دین بدل دینے کو تعزیری جرم قرار نہیں دیا بلکہ اسے محاربہ (بغاوت) کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس کے لئے کہیں حادب اللہ و رسولہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور کہیں المفارق للجماعۃ (دشمن سے جا ملنے) کے۔ یہ احادیث بھی متعدد صحابہ و صحابیات سے مروی ہیں جو حضرت ابن عباسؓ سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہیں۔ ظاہر ہے ایک ہی موضوع سے متعلق روایات کو یکجا کر کے اور ان کے تمام الفاظ کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالنا چاہیئے کیونکہ کوئی راوی کسی نکتہ کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی راوی سے کوئی دوسری تفصیل رہ جاتی ہے۔ روایات قرآن مجید کی طرح لفظاً لفظاً تو محفوظ ہیں نہیں اس لئے حقیقت تک رسائی کے لئے تمام روایات پر نگاہ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ بہرحال اب وہ روایات ملاحظہ ہوں جن میں محاربہ کی شرط ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابو قلابہ کی حدیث ہے:۔

حدثنی سلمان ابو رجاء مولیٰ ابی قلابہ ----

فقال (عمر بن عبد العزیز) ما تقول یا عبد اللہ بن زید قلت ما علمت نفسا حل قتلھا فی الاسلام الا رجل زنی بعد احصان او قتل نفسا بغیر نفس او حادب اللہ و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(بخاری کتاب التفسیر باب انما جزاء الذین یحاربون اللہ ص ۶۶۳ ج ۲ مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی)

ترجمہ:۔ مجھ سے سلمان ابو رجاء، ابو قلابہؓ کے آزاد کردہ غلام نے بیان کیا کہ ابو قلابہؓ سے عمرؓ بن عبد العزیز نے پوچھا کہ اے عبد اللہ بن زید تم کیا کہتے ہو تو میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ اسلام میں کسی جان کو قتل کرنا جائز ہو بجز اس کے کہ کسی[1] نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو یا کسی[2] جان کو بلا قصاص کے قتل کر دیا ہو یا اللہ[3] اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگ کی ہو۔

نیز بخاری ہی میں حضرت ابو قلابہ کی حدیث ہے کہ:۔

حدثنی ابو قلابۃ (فی حدیث طویل) فواللہ ما قتل رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم احدا الا فی احدی ثلث خصال۔ رجل قتل بجریرۃ نفسہ فقتل، او رجل زنی بعد احصان، او رجل حارب اللہ و رسولہ و ارتد من الاسلام۔

(بخاری کتاب الدیات، باب القسامۃ ص ۱۰۱۸ ج ۲)

ترجمہ:۔ مجھ سے ابو قلابہ نے (ایک طویل حدیث میں) بیان

کیا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین صورتوں کے علاوہ کسی کو قتل نہیں کیا، ایک[1] تو آدمی جس نے اپنے ذاتی جرم سے کسی کو قتل کر دیا اور اس کے بدلے میں قتل کر دیا گیا یا کسی[2] آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کر لیا یا کسی[3] شخص نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی اور اسلام سے مرتد ہو گیا۔

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی حدیث ہے کہ :۔

عن عائشةؓ قالت قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لایحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ الا فی احدی ثلٰث، رجل زنی بعد احصان فانہ یرجم ورجل خرج محاربا باللہ ورسولہ فانہ یقتل او یصلب او ینفی او یقتل نفسا فیقتل بھا۔

(ابوداؤد کتاب الحدود - باب الحکم فی من ارتد ص۵۹۸ ج۲)

ترجمہ :۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں جو لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دیتا ہو مگر تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ۱؎ کسی آدمی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کیا ہو تو اسے رجم کیا جائے گا۔ ۲؎ کسی نے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کے لئے خروج کیا ہو تو اسے قتل کیا جائے گا

یا سولی پر چڑھایا جائے گا یا ملک بدر کر دیا جائے گا ۳؎ یا کسی نفس کو قتل کر دیا ہو تو اس کے بدلے میں قتل کر دیا جائے گا۔

نسائی میں اسی حضرت عائشہؓ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

عن عائشة ------ اورجل یخرج من الاسلام فیحارب اللہ عزوجل ورسولہ فیقتل او یصلب او ینفی من الارض۔

(نسائی کتاب المحاربۃ باب الصلب ص۱۶۱ ج۲ مطبوعہ مطبع سلفیہ لاہور)

ترجمہ :۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ------ یا کوئی[3] آدمی اسلام سے خارج (مرتد) ہو جائے اور اللہ عزوجل اور اس کے رسول سے جنگ کرے تو اسے قتل کیا جائے گا یا پھانسی دی جائے گی یا سرزمین اسلام سے ملک بدر کر دیا جائے گا۔

نیز صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ :۔

عن عبد اللہ (بن مسعودؓ) قال قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لایحل دم امرئ مسلم یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانی رسول اللہ الا باحدی ثلٰث النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینہ التارک للجماعۃ۔

(بخاری کتاب الدیات باب قول اللہ ان النفس بالنفس ص۱۰۱۶ ج۲)

ترجمہ :۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان آدمی کا خون حلال نہیں ہے جو اس بات کی شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین وجہوں میں سے کسی وجہ میں۔ ایک[1] تو جان کے بدلے جان دوسرے[2] شادی شدہ زنا کار اور تیسرے[3] اپنے دین کو چھوڑ دینے اور جماعت سے الگ ہو جانے والا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت مسلم کتاب القسامۃ والمحاربین والقصاص والدیات ص ۹۳ ج ۲ میں اور سنن ابوداؤد کتاب الحدود باب الحکم من ارتد میں ص ۵۹۸ ج ۲ اور جامع ترمذی ابواب الدیات باب ماجاء لایحل دم امرئ مسلم ص ۲۲۱ ج ۱ میں بھی ہے۔

حارب اللہ ورسولہ کے ذیل میں ہر وہ شخص آجاتا ہے جو تلوار سے جنگ کرتا ہو، زبان سے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتا ہو یا کوئی ایسی حرکت کرتا ہو جس کا مقصد اسلامی ریاست کی تخریب ہو مثلاً دوسروں کو جنگ پر اُکسانا، مسجد ضرار بنانا یا اس کی تیاری میں دشمن کی مدد کرنا، جاسوسی کرنا وغیرہ۔

بحث غالباً نامکمل رہ جائے گی اگر اس سلسلے میں ان دلائل پر بحث نہ کی جائے جو ہمارے بعض علمائے کرام نے اس موضوع پر قرآن کریم سے پیش فرمائے ہیں۔

عرصہ دراز ہوا مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے اپنے روزنامہ ہمدرد میں قتل مرتد کے خلاف مضامین لکھے تھے اور ثابت کیا تھا کہ قرآن نے قتل مرتد کا حکم کہیں نہیں دیا تو ہمارے محترم شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے ان کے جواب میں ایک کتابچہ تحریر فرمایا تھا جس میں مولانا عثمانی مرحوم نے قتل مرتد پر قرآن کی اس آیت کریمہ سے استدلال فرمایا تھا جو سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے کہ :۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (۲/۵۴)

ترجمہ :۔ اور یاد کرو! جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا۔ اے میری قوم تم نے گوسالہ بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے تو اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے توبہ کرو، پھر اپنی جانوں کو قتل کرو۔ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ تو اللہ نے تم پر توجہ فرمائی (توبہ قبول کرلی) یقیناً وہ توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب کا استدلال یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی کر کے کفر کا ارتکاب کیا تھا اور وہ مرتد ہو گئے تھے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو قتل کرنے کا حکم دیا

اور فرمایا کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی وہ ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے گوسالہ پرستی کی ہے۔ لہٰذا مرتد کی سزا قتل ہوگئی۔

حق تعالیٰ مجھے اور حضرت مولانا مرحوم کو معاف فرمائیں۔ مولانا نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کو دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں تو یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ پہلے توبہ کریں اور پھر قتل کر دیئے جائیں۔ اسلام میں مرتد کے متعلق کوئی فقیہ بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ مرتد پہلے توبہ بھی کرلے اور اس کے بعد اسے قتل بھی کر دیا جائے۔ پوری امت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر مرتد توبہ کرے تو ارتداد کا گناہ معاف ہو جاتا ہے اور پھر اس کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔

نیز اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ان لوگوں کے لئے جو گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوئے تھے توبہ کی یہی صورت تجویز فرمائی تھی کہ وہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کریں اور آیت کا یہ ترجمہ ہے کہ "تم اپنے خالق کے سامنے توبہ کرو۔ لہٰذا اپنے نفسوں کو قتل کرو۔" توبہ کی یہ صورت کہ لوگ اپنی جانوں کو قتل کریں اسلام میں نہیں ہے۔ ہمارے یہاں توبہ کی صرف یہ صورت ہے کہ آدمی نادم ہو جائے اور آئندہ کے لئے دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا عزم صمیم کرلے۔ اسلام میں توبہ کی یہ صورت نہیں ہے جو بنی اسرائیل کے لئے تھی۔

بنی اسرائیل کے لئے حق تعالیٰ نے جہاں اور بہت سے سخت

احکام نازل فرمائے تھے، انہی میں سے ایک یہ حکم بھی تھا جو آج نافذ العمل نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے قتل مرتد کا حکم نکالنا ناقابلِ فہم ہے۔

اسی سلسلے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں"، جس میں انہوں نے "قتل مرتد کا ثبوت قرآن سے" کا عنوان قائم فرما کر سورۂ توبہ کی آیت (۹/۱۲) اپنی دلیل میں پیش فرمائی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس سلسلہ کی پوری آیتیں پیش کر دیں تاکہ ناظرین خود فیصلہ کرسکیں کہ مولانا مرحوم کا استدلال کس قدر خلاف واقعہ ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:-

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ○ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ○ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا
فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ
لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ
وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ
فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝

(۹/۷-۱۳)

ترجمہ:- یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ (ان) مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے قریب (حدیبیہ میں) عہد و پیمان باندھا تھا (اور انہوں نے اسے نہیں توڑا) تو (ان کا عہد ضرور عہد ہے، اور) جب تک وہ تمہارے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے ساتھ (اپنے عہد پر) قائم رہو۔ اللہ انہیں دوست رکھتا ہے جو (اپنے تمام کاموں میں) متقی ہوتے ہیں۔ ان مشرکوں کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لئے قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد و پیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو فاسق ہیں (یعنی راستبازی کے تمام طریقوں اور پابندیوں

سے باہر ہو چکے ہیں) ان لوگوں نے اللہ کی آیتیں ایک بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالیں (یعنی ہوائے نفس کے تابع ہو گئے اور اللہ کی آیتوں پر یقین نہیں کیا) پس اس کی راہ سے لوگوں کو روکنے لگے (افسوس ان پر!) کیا ہی برا ہے جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں! کسی مؤمن کے لئے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں نہ عہد و قرار کا۔ یہی لوگ ہیں کہ ظلم میں حد سے گذر گئے ہیں۔ بہر حال اگر یہ باز آئیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، تو (پھر ان کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اُٹھنا چاہیئے۔ وہ) تمہارے دینی بھائی ہو گئے ان لوگوں کے لئے جو جاننے والے ہیں، ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ اپنے عہد و پیمان جو خود کر چکے ہیں توڑ ڈالیں اور تمہارے دین کو برا بھلا کہیں تو پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کی سوگند سوگند نہیں (اور تمہیں جنگ اس لئے کرنی چاہیئے) تاکہ یہ (ظلم و بدعہدی سے) باز آجائیں۔ (مسلمانو!) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنے عہد و پیمان کی قسمیں توڑ ڈالیں جنہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کے منصوبے کئے اور پھر تمہارے برخلاف لڑائی میں پہل بھی انہی کی طرف سے ہوئی؟ کیا تم ان سے ڈرتے ہو؟ (اگر ڈرتے ہو تو تم مؤمن نہیں۔ کیونکہ) اگر مؤمن ہو تو اللہ

اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ اس کا ڈر تمہارے دلوں
میں بسا ہو!

(تفسیر ترجمان القرآن مولانا آزاد مرحوم ص ۷۷ ج ۲)

ہم نے آیات مذکورہ بالا کا ترجمہ خود نہیں کیا بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس میں آپ ملاحظہ فرمائیں کہ بات مشرکین کی ہو رہی ہے اور ابتداء اس فقرہ سے ہوئی ہے کہ "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکوں کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو؟" ان مشرکین عرب میں تین طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جن سے مسلمانوں کا کوئی معاہدہ نہیں تھا۔ دوسرے وہ جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا اور انہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق حج کے موقعہ پر جب سارے مشرک قبائل کے نمائندے مکہ معظمہ میں جمع تھے اعلان کرایا گیا کہ ان لوگوں کو چار مہینے کی مہلت ہے وہ آزادی سے نقل و حمل کر سکتے ہیں اور امن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن چار مہینے کے بعد مسلمان ان سے برسرِ جنگ ہوں گے۔ تیسرا گروہ وہ تھا جن سے مسلمانوں کے معاہدے تھے اور انہوں نے کوئی عہد شکنی نہیں کی تھی۔ ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ جب تک وہ اپنے معاہدوں پر قائم ہیں تم بھی قائم رہو۔ ان سے تمہاری کوئی جنگ نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ لوگ بھی عہد شکنی کا ارتکاب کریں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے ان سرغنوں سے تمہیں جنگ کرنی چاہیئے۔ انہی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمہیں ان لوگوں سے جنگ کرنے میں کونسی چیز مانع ہے۔ یہی تو وہ لوگ ہیں

جنہوں نے اپنے معاہدوں کو توڑا ہے (واضح رہے کہ صلح حدیبیہ میں دس سال کے لئے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ بنو خزاعہ مسلمانوں کے حلیف تھے اور بنو بکر مشرکین قریش کے حلیف تھے۔ بنو بکر نے دو سال بعد ہی بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ بنو خزاعہ نے حرم میں پناہ لی مگر بنو بکر نے انہیں وہاں بھی قتل کر دیا اور قریش مکہ نے عہد نامے کے خلاف بنو بکر کی مدد کی جس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۸ھ میں مکہ معظمہ پر لشکر کشی کرنی پڑی اور مکہ معظمہ فتح ہو گیا) اور اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکالا ہے اور جنگ میں انہوں نے ہی پہل کی ہے۔

سورۂ توبہ کی ابتدائی تیس چالیس آیتیں انہیں مشرکین سے متعلق ہیں جس کا اعلان حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ۹ھ میں حج کے موقعہ پر امیر الحج حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے کرایا تھا۔ اور یہ مشرکین عرب کے خلاف اعلان جنگ تھا جس کی ابتداء ان الفاظ سے ہوئی ہے:۔

(مسلمانو!) جن مشرکوں کے ساتھ تم نے (صلح و امن کا)
معاہدہ کیا تھا، اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے
بری الذمہ ہونے کا ان کے لئے اعلان ہے کہ چار مہینے
تک ملک میں چلو پھرو (کوئی روک ٹوک نہیں) اس
کے بعد جنگ کی حالت قائم ہو جائے گی۔ (۹/۱-۳)

(ترجمان القرآن ص ۷۴ ج ۲ مولانا آزاد)

اس پوری تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ آیاتِ مذکورہ بالا

کا تعلق مسئلۂ ارتداد سے دور کا بھی نہیں ہے بلکہ یہ صراحتہً عرب کے مشرکین سے متعلق ہیں جنہوں نے عہد شکنی کا ارتکاب کیا تھا۔
لیکن مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" آیات (۱۱-۱۲) نقل فرماکر ان کا ترجمہ یوں فرماتے ہیں:۔

"پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لئے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر زبانِ طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو۔ کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں شاید وہ اس طرح باز آجائیں۔"

یہ ترجمہ فرمانے کے بعد مودودی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ آیت سورۂ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور رسول سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی

ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کرلیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو اسلام قبول کرلیں۔ معاف کر دیئے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو نکل جائیں۔ مدتِ مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنہوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو نہ ملک چھوڑا ہو، ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ توبہ کرکے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جاسکتی۔ بلکہ سیاق عبارت صریح طور پر اس کے معنے "اقرار اسلام سے پھر جانا" متعین کر دیتا ہے۔ اور اس کے بعد فقاتلوا ائمۃ الکفر کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔"

(مرتد کی سزا اسلامی قانون میں ص۹-۱۰)

آیت مذکورہ بالا میں یہ الفاظ آئے تھے وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ (اور اگر وہ معاہدہ کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں) مگر مودودی صاحب اس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے "اگر وہ عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو تو

دیں"۔ اس آیت کریمہ میں "عہد" سے مراد اگر قبول اسلام کا عہد ہے تو نَکَثُوْا اَیْمَانَھُمْ سے کیا مراد ہوگا؟ مولانا کو یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ اقرار اسلام کا عہد کرنے کے بعد دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے قسمیں کھانا بھی ضروری ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر قسمیں کھانا بھی ضروری ہے تو کتنی قسمیں کھانا ضروری ہیں؟ کیونکہ آیت کریمہ میں اَیْمَانَھُمْ (جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے) یہاں ایک قسم کو توڑنے کا ذکر نہیں ہے بلکہ متعدد قسموں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار ہی دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد قسمیں کھانی بھی ضروری ہوتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو مولانا کو اس کا بیان کر دینا بھی ضروری تھا۔

اس کے بعد فَقَاتِلُوْا اَئِمَّۃَ الْکُفْرِ کا فقرہ آیا ہے۔ اس میں فَقَاتِلُوْا باب مفاعلت سے امر کا صیغہ ہے جو مشارکت کو چاہتا ہے یعنی ایک دوسرے سے جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو قتل کرنا۔ لہٰذا قَاتِلُوْا کے معنے تو یہ ہوں گے کہ ائمہ کفر بھی جنگ کریں گے اور مسلمان بھی جنگ کریں گے۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو قتل کریں گے۔ اس کے معنے ائمہ کفر کو قتل کر دینے کے تو نہیں ہیں۔ اس کے معنے تو باہمی جنگ کرنے کے ہیں۔ جنگ میں دونوں فریق ایک دوسرے کو قتل کرتے ہیں۔ مرتدوں کو مسلمان قتل کریں گے اور مسلمانوں کو

مرتد قتل کریں گے۔ تو مودودی صاحب کو یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ مرتد تو ارتداد کے جرم میں قتل ہوں گے مگر مسلمانوں کا وہ کونسا جرم ہوگا جس میں وہ قتل کئے جائیں گے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اگر طرفین کی طرف سے جنگ ہوگی تو یہ مرتدین تو محاربین بن گئے اور محاربین کو تو قتل کرنے کے ہم بھی قائل ہیں۔ زیر بحث تو وہ مرتدین ہیں جو محاربین نہیں ہیں۔ یہ آیت کریمہ بجائے مودودی صاحب کی دلیل بننے کے خود ہماری دلیل بنی جا رہی ہے۔

پھر بقول مولانا "تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے گی" تو کیا جو لوگ محض تحریک ارتداد کے ہمنوا یا متبع ہوں۔ لیڈر نہ ہوں تو کیا ان کا ارتداد اس قابل ہے کہ اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے اور ان کو بالکل معاف کر دیا جائے؟

اس کے بعد قرآن کریم نے ان سے جنگ کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اِنَّھُمْ لَآ اَیْمَانَ لَھُمْ (یعنی ان کے عہد و میثاق کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر ان کا جرم صرف ارتداد ہی تھا تو قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ ان کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ بے معنیٰ سی بات ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ دائرۂ اسلام سے خارج ہونے کا اگر یہاں تذکرہ ہوتا تو قرآن کریم اس کے بجائے اِنَّھُمْ لَآ اِیْمَانَ لَھُمْ فرماتا یعنی اب ان میں ایمان نہیں رہا۔ لیکن یہاں اِیمان کا نہیں اَیمان (وعدوں) کا ذکر ہے۔

آخر میں قرآن کریم نے اس جنگ کا مقصد یہ بتایا تھا کہ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ (کہ شاید وہ اس طرح باز آجائیں) مولانا کے استدلال سے یہ نظر آرہا ہے کہ وہ جہاں لَا اَيْمَانَ لَهُمْ اور لَا اِيْمَانَ لَهُمْ میں فرق نہیں فرمارہے ہیں۔ ایسے ہی وہ فَقَاتِلُوْا اور فَقُتِّلُوْا میں بھی کوئی فرق نہیں سمجھ رہے لہٰذا اگر فَقَاتِلُوْا کے یہ معنے لئے جائیں کہ "مرتدین کو قتل کردو" تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قتل کر دیئے جانے کے بعد ان کے باز آجانے کی توقع کے کیا معنے ہیں۔

پھر اس سے اگلی آیت میں دوبارہ وہی الفاظ آرہے ہیں۔ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ (کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قسمیں توڑ دی ہیں)۔ اس میں پھر وہی نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ کا لفظ رکھا ہوا ہے جس کے معنے مودودی صاحب نے اقرار اسلام یا قبولِ اسلام کے کئے ہیں لیکن اس کے فوراً بعد وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ بھی آرہا ہے یعنی انہوں نے ہی تو رسول کو اس کے وطن سے باہر کرنے کے منصوبے کئے تھے پھر انہوں نے ہی تمہارے خلاف لڑائی میں پہل بھی کی تھی۔ یہاں مولانا کو یہ بھی بتانا چاہیئے تھا کہ مشرکین مکہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ سے باہر کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور جنہوں نے آپ سے جنگیں لڑنے میں پہل کی تھی۔ وہ بھی (جیسا کہ آج تک سمجھا جاتا رہا ہے) مکہ کے مشرکین نہیں تھے۔ بلکہ

وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے اور مسلمان ہو جانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے۔ کیونکہ مولانا نے نَكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ کا ترجمہ اس سے پچھلی آیات میں "عہد (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑنے" یعنی مرتد ہو جانے سے فرمایا ہے ان الفاظ کا ترجمہ دونوں آیتوں میں وہی فرمانا چاہیئے جو وہ ایک جگہ فرما چکے ہیں اور اگر وہ دونوں آیتوں میں اس لفظ کے ترجمہ میں فرق کرتے ہیں تو اس کی وجہ بھی بتانی چاہیئے۔ اس آیت میں جن لوگوں کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قسموں کو توڑ دیا ہے انہی کے متعلق دو اور جرائم بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو اس کے وطن سے نکال باہر کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی اور دوسرے یہ کہ انہوں نے تمہارے ساتھ لڑائیوں میں پہل کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ جن کے متعلق قرآن کریم نے یہ تین جرائم شمار کرائے ہیں کیا اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے تھے یا شروع سے مشرک ہی تھے؟ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے وہ یہی ہے کہ یہ لوگ مشرکین مکہ تھے۔ وہ ایک منٹ کے لئے بھی کبھی مسلمان نہیں ہوئے تھے اگر مولانا کی تحقیق اس کے خلاف ہے تو مولانا کو اس تحقیق انیق کی پردہ کشائی بھی فرما دینی چاہیئے تھی۔

(باب الرجم)

رجم اصل حد ہے یا تعزیر؟ اس کے متعلق ہم نے ایک مستقل کتاب اسی نام سے اکتوبر ۱۹۸۱ء میں شائع کی ہے۔ جس میں ہم نے تفصیل سے بتایا ہے کہ قرآن کریم سے کسی طرح بھی رجم کی سزا کا ثبوت نہیں ملتا۔ ہم نے اس میں سیر اور احادیث سے اسلام میں رجم کی تاریخ بیان کر کے بتایا ہے کہ زنا کے سلسلہ میں قرآن کریم میں سورۂ نور کی ایک ہی آیت میں سزا کا بیان آیا ہے۔ یعنی :-

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (۲۴/۲)

ترجمہ :- ہر زنا کار عورت اور ہر زنا کار مرد کو، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس آیت کریمہ میں اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فقہائے حنفیہؒ کے اصول کے مطابق عام لفظ ہیں جو ہر زنا کار کو شامل ہیں۔ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ۔ جوان ہو یا بوڑھا۔ عورت ہو یا مرد۔ آزاد ہو یا غلام۔ یہ الفاظ سب کو شامل ہیں۔ اور کلمۂ عام فقہائے حنفیہ کے نزدیک قطعی ہوتا ہے جس کی تخصیص کسی غیر قطعی نص سے نہیں کی جا سکتی۔ جو احادیث رجم کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں وہ سب کی سب ظنی اور غیر قطعی ہیں ان کی وجہ سے سورۂ نور کی آیت کریمہ کو غیر شادی شدہ زانیوں کے لئے خاص نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد ادیب صالح تفسیر النصوص میں فرماتے ہیں کہ :-

وبناء على هذا : نقل الينا اجماعهم على اجراء قوله تعالى "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي"، "اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ"، "وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا"، "وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا"، "وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ"، "وَلَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ" وقوله عليه الصلوٰة والسلام "لا وصية لوارث"، "من القى السلاح فهو امن" ..... الى غير ذلك مما لا يحصى على العموم۔

(ص ۶۳ ج ۲ تفسیر النصوص)

ترجمہ :- اسی بناء پر فقہاء کا اجماع ہمارے سامنے

نقل کیا گیا ہے کہ آیات ذیل الزانیة والزانی ، السارق والسارقة ۔ من قتل مظلوما ۔ وذروا ما بقی من الربٰوا ۔ لا تقتلوا انفسکم ۔ ولا تقتلوا الصید وانتم حرم ۔ اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد لا وصیة لوارث ۔ من القی السلاح فھو امن ۔ وغیرہ وغیرہ بے شمار آیات و احادیث ، سب کو عموم پر منطبق کیا جائے گا ۔

اس تصریح سے معلوم ہو گیا کہ تمام فقہاء کرام نے متفقہ طور پر اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ کو عام تسلیم کیا ہے بلکہ اس پر ان کا اجماع ہے ۔ اور عام کے متعلق حکم یہی ہے کہ وہ قطعی الثبوت اور قطعی الدلالت ہوتا ہے جس کی تخصیص ظنی دلائل سے نہیں کی جا سکتی ۔ چنانچہ علامہ ڈاکٹر محمد ادیب صالح دمشقی آگے چل کر فرماتے ہیں کہ :۔

فالحنفیة لا یجیزون ھٰذا التخصیص ، لان العام من الکتاب والسنة المتواترة قطعی فی ثبوته وفی دلالته ، والقطعی لا یصح تخصیصه بالظنی ، قال عبد العزیز البخاری : "العام من الکتاب والسنة المتواترة لا یحتمل الخصوص ای لا یجوز تخصیصه بخبر الواحد والقیاس لانھما ظنیان فلا یجوز تخصیص القطعی بھما ، لان التخصیص بطریق المعارضة والظنی لا یعارض

القطعی ۔ (تفسیر النصوص ص ۲۶۶ ج ۲)

ترجمہ :۔ تو حنفیہ اس تخصیص کو جائز نہیں رکھتے ۔ کیونکہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کے عام کلمات اپنے ثبوت اور اپنی دلالت میں قطعی ہوتے ہیں اور دلیل ظنی کے ساتھ اس کی تخصیص صحیح نہیں ہو سکتی ۔ امام عبد العزیز بخاری رح کا ارشاد ہے کہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ کا کلمہ "عام" خصوصیت کا احتمال ہی نہیں رکھتا ۔ یعنی اس کی تخصیص خبر واحد اور قیاس سے جائز نہیں ہو سکتی ۔ کیونکہ خبر واحد اور قیاس دونوں ظنی ہوتے ہیں تو ان دونوں کے ذریعہ سے قطعی کی تخصیص جائز نہیں ہوگی ۔ کیونکہ تخصیص بطور معارضہ کے ہو سکتی ہے اور ظنی ، قطعی کا معارض نہیں ہو سکتا ۔

نیز علامہ محمد معروف دوالیبی فرماتے ہیں کہ :۔

وقال الاحناف : ان العام قطعی فی دلالته ای انه یوجب الحکم قطعا ویقینا فیما تناوله من الافراد ۔ وقال بقول الاحناف والامام الشاطبی من المالکیة واحتج الاحناف لذلك وقالوا : ان اللفظ متی وضع لمعنیً کان ذلك المعنی عند اطلاقه واجبا ۔ ای لازما وثابتا بذلك اللفظ حتی یقوم الدلیل علی خلافه ۔ وقالوا بناء علی ذلك : ان "صیغة العموم"

لما كانت موضوعة للدلالة على العموم، وهي فيه حقيقة۔ كان "معنى العموم" واجبا و ثابتا بها قطعًا حتى يقوم الدليل على خلافه۔

(المدخل الى علم الاصول الفقه ص۱۵۵-۱۵۶)

ترجمہ:۔ فقہائے احناف نے کہا ہے کہ کلمۂ عام اپنی دلالت میں قطعی ہوتا ہے یعنی وہ حکم کو قطعیت اور یقین کے ساتھ واجب کر دیتا ہے ان تمام افراد میں جن کو وہ شامل ہو۔ اور فقہائے احناف کے قول کے مطابق ہی مالکیہ میں سے امام شاطبیؒ نے بھی فرمایا ہے۔ اور احناف نے اس کے لئے دلیل قائم کی ہے اور کہا ہے کہ لفظ جب کسی معنے کے لئے وضع کیا جائے تو اس کو بولنے کے وقت وہ معنی اس کے لئے واجب یعنی اس لفظ کے ساتھ لازم اور ثابت ہوتے ہیں جب تک اس کے خلاف کوئی دلیل ہی قائم نہ ہو جائے۔ اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے فرمایا ہے کہ عموم کا صیغہ جبکہ عموم پر دلالت کرنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ اور اس کے یہ معنے حقیقی ہیں تو عموم کے معنے اس کے ساتھ واجب اور ثابت ہوں گے حتیٰ کہ کوئی دلیل اس کے خلاف پہ قائم ہو جائے۔

ہمارے فقہائے حنفیہ رحمہم اللہ تعالےٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے کتاب اللہ کے عام کی تخصیص خبر واحد سے تو نہیں ہو سکتی لیکن خبر مشہور سے ہو سکتی ہے اور رجم کی احادیث خبر واحد نہیں

ہیں بلکہ خبر مشہور ہیں جس سے کتاب اللہ کے عام کو خاص کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے کتاب اللہ پر زیادتی بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس اصول کی تائید نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خبر مشہور اپنی اصل کے اعتبار سے خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات وہ خبر واحد سے بھی کمتر ہوتی ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۔

والمشهور ما له طرق محصورة باكثر من اثنين ولم يبلغ حد التواتر، اى لم يفد بمجرده العلم۔ وهو المستفيض على راى جماعة من ائمة الفقهاء، وقيل المستفيض يكون طرفيه ووسطه سواء، والمشهور اعم من ذلك وقد يطلق المشهور على ما اشتهر على الالسنة مطلقا، اى وان لم يكن له اسناد واحد۔ (من قفو الاثر ص۵)

(قواعد فی علوم الحدیث ص۳۲)

ترجمہ:۔ مشہور وہ حدیث ہے جس کی دو سے زیادہ محدود سندیں ہوں اور تواتر کی حد تک نہ پہنچتی ہوں۔ یعنی محض اس سے علم کا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ائمۂ فقہاء کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق وہ مستفیض (جس کی دو سندیں ہوں) ہی ہوتی ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ مستفیض اس حدیث کو کہتے ہیں
جس کے طرفین اور درمیان برابر ہوں (یعنی جس کے ہر درجہ
میں دو راوی ہوں) اور مشہور اس سے عام ہے اور کبھی
مشہور کا اطلاق اس حدیث پر بھی کر دیا جاتا ہے جو لوگوں
کی زبانوں پر مشہور ہو گئی ہو، خواہ اس کی ایک سند
بھی نہ ہو۔ (قفو الاثر ص۵)

درس نظامی میں داخل اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار
میں ہے:۔

کالمشهور وهو ما كان من الاحاد فی الاصل
ای فی القرن الاول وهو قرن الصحابة ثم
انتشر حتی ینقله قوم لا یتوهم تواطؤهم
علی الکذب وهو القرن الثانی و من بعدهم
یعنی قرن التابعین و تبع التابعین ولا اعتبار
للشهرة بعد ذلك فان عامة اخبار الاحاد
قد اشتهرت فی هذا الزمان فلم یبق
شیء منها احادا وانه یوجب علم طمانینة
ای اطمینان یرجح الصدق فهو دون المتواتر
وفوق الواحد۔ (نور الانوار ص۱۷۶-۱۷۷)

ترجمہ:۔ مثلاً مشہور اور وہ دراصل اخبار احاد ہی
میں سے ہوتی ہے یعنی قرن اول میں اور وہ صحابہؓ کا
عہد ہے۔ پھر وہ پھیل جاتی ہے حتی کہ اسے ایک قوم نقل

کرنے لگتی ہے جن کے جھوٹ پر اتفاق کا وہم نہ کیا جا سکے
یہ شہرت قرن دوم اور اس کے بعد حاصل ہوتی ہے یعنی
تابعین اور تبع تابعین کے عہد میں اور اس کے بعد
کسی شہرت کا اعتبار نہیں کیونکہ اس زمانہ میں تو تمام
احادیث ہی مشہور ہو چکی تھیں اور کوئی بھی حدیث تبع تابعین
کے عہد کے بعد خبر واحد نہیں رہی۔ اس قسم کی احادیث
سے علم طمانینت حاصل ہوتا ہے۔ یعنی ایک طرح کا اطمینان
حاصل ہو جاتا ہے جو جہت صدق کو ترجیح دیدیتا ہے۔
یہ خبر مشہور متواتر سے کم اور خبر واحد سے زیادہ ہوتی
ہے۔

اسی کے حاشیہ پر محشی نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب
نخبۃ الفکر اور شرح نخبۃ الفکر سے نقل کیا ہے کہ:۔

وهو ما كان من الاحاد فی الاصل ای كان روایة
من الصحابة اقل من عدد التواتر واحدا كان
راویه او اكثر۔ وهو علی رأی الاصولیین
واما علی رای اهل الحدیث فالسنة قسمان
متواتر وهو ما یكون له اسانید كثیرة۔ بلا حصر
عدد معین والعادة احالت تواطؤهم علی
الكذب وخبر الواحد وهو ما لا یكون كذلك۔
(حاشیہ نور الانوار ص۱۷۶)

ترجمہ:۔ مشہور دراصل اخبار آحاد ہی میں سے ہوتی

ہے یعنی اس کی صحابہ سے روایت عدد تواتر سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس کا راوی ایک ہی ہوتا ہے یا زیادہ مشہور حدیث کا وجود اہل اصول کی رائے پر ہے۔ لیکن اہل حدیث کی رائے کے مطابق سنت کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک تو متواتر یعنی جس کی سندیں بہت ہوں۔ عدد معین کے حصر کے بغیر کہ عادت ان سب کے جھوٹ پر اتفاق کو نا ممکن سمجھتی ہو۔ اور دوسرے خبر واحد۔ اور خبر واحد وہ ہے جو ایسی نہ ہو۔

ان تصریحات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ محدثین تو حدیث مشہور کا وجود ہی تسلیم نہیں فرماتے اور جو اہل اصول اور فقہائے حنفیہؒ مشہور حدیث کا وجود تسلیم فرمارہے ہیں وہ بھی اس کا اعتراف فرمارہے ہیں کہ حدیث مشہور دراصل خبر واحد ہی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تابعین یا تبع تابعین کے عہد میں پھیل جاتی ہے۔ کسی بات کا پھیل جانا اور زبان زد عوام ہوجانا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہے۔ موضوعات کی کتابوں میں آپ کو ہزاروں ایسی حدیثیں ملیں گی کہ وہ آج تک زبان زد عوام ہیں اور لوگ انہیں ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام سمجھے ہوئے ہیں مگر وہ موضوع اور من گھڑت ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہم اوپر نقل کرچکے ہیں کہ بعض مرتبہ اس حدیث کو بھی مشہور شمار کرلیا جاتا ہے جو زبان زد عوام ہوگئی ہے اور اس کی ایک بھی سند نہیں ہے۔ یعنی وہ خبر واحد سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔

اب آپ خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا ایسی حدیثوں سے قرآن کے عام کی تخصیص اور کتاب اللہ پر زیادتی جائز ہوسکتی ہے ہمیں بڑا افسوس ہے کہ ہم اس کی تائید کرنے کی اپنے اندر جرأت نہیں پاتے حضرات فقہائے حنفیہؒ شکر اللہ سعیہم کی جانب ایسی غلط بات کی نسبت ہمارے نزدیک درست نہیں۔

بہر حال ہم نے اپنی کتاب "رجم اصل ہے یا تعزیر؟" میں ان تمام عنوانات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے جب تک قرآن کریم میں زنا کی سزا کا حکم نازل نہیں ہوا تھا تورات کی متابعت میں چند مجرموں (مثلاً ماعز اسلمی، غامدیہ اور جہینہ) کو رجم فرمایا تھا لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ سورۂ نور کی آیت کے نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں، بہ سند اسحاق، خالد شیبانی کہ شیبانی نے کہا کہ میں نے عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی کو سنگسار فرمایا تھا۔ انہوں نے فرمایا "ہاں"، میں نے پوچھا کہ کیا "سورۂ النور کے نازل ہونے سے پہلے یا نازل ہونے کے بعد؟" آپ نے فرمایا ــــ "یہ بات مجھے معلوم نہیں"۔

ہم نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مفسرین نے مکی اور مدنی سورتوں کی جو ترتیب نزول تحریر فرمائی ہے وہ ہماری تمام بڑی بڑی تفسیروں میں مذکور ہے اس کے مطابق مدنی سورتوں

کی کل تعداد اکتیس ہے۔ ان کی ترتیب نزول میں اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ کا اٹھارھواں نمبر ہے۔ سورۃ النور کا انیسواں نمبر ہے اور سورۃ الحج کا بیسواں نمبر ہے۔

(ملاحظہ ہو النظرات فی القرآن للشیخ محمد الغزالی ص۲۵۸-۲۵۹ طبع دوم مصر اور الاتقان فی علوم القرآن ص۱۹-۲۰ ج۱ اردو ترجمہ مطبوعہ نور محمد آرام باغ کراچی)

حج متفقہ طور پر ۹ھ میں فرض ہوا ہے۔ لہٰذا سورۃ حج ۹ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اور اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ جس میں بقول حضرت عمرؓ و حضرت ابن عباسؓ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے۔ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے۔ ان دونوں کے درمیان میں سورۃ النور نازل ہوئی تھی۔ لہٰذا اس کی تاریخ نزول لامحالہ ۸ھ کا آخر یا ۹ھ ہونا چاہیئے۔ یہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حیات کا آخری عہد ہے۔ جب تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائے کہ ۹ھ میں سورۃ النور کی آیات نازل ہونے کے بعد بھی آپ نے کسی کو رجم کیا ہے۔ اس وقت تک رجم کی سزا کو اسلامی سزا قرار دے لینا صریحاً زیادتی ہے۔ کیونکہ رجم میں ایک مسلمان کی جان لینے کا سوال ہے اور کسی ایسی دلیل سے جس میں ذرا بھی شک و شبہ کیا جا سکے ایک مسلمان کی جان نہیں لی جا سکتی۔ ویسے بھی حدود شبہات سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا روایات اور اخبار احاد سے ایک مسلمان کی جان سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

قرآن کریم میں زنا سے متعلق جتنی آیاتِ کریمہ ہیں ان سب سے رجم کے ثبوت کے بجائے رجم کی نفی ہی کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ تفصیل کے لئے اسی کتاب کا باب الزنا ملاحظہ ہو۔

آخر میں ہم اس باب کو علامہ محمد سلام مدکور، استاذ الشریعۃ بکلیۂ حقوق (القاہرہ) کے ایک اقتباس پر ختم کر رہے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ہمارے دور کے محقق علماء کا اس مسئلہ میں نقطۂ نظر کیا ہے۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں:۔

کوڑوں کی سزا

یہ سزا عزت و آبرو پر زنا کے ساتھ زیادتی کرنے پر دی جاتی ہے۔ حق تعالےٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ۔ (۲۴/۲)

ترجمہ:۔ زنا کار عورت اور زنا کار مرد، ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

خوارج کے علاوہ دوسرے لوگوں نے کہا ہے کہ یہ آیت غیر شادی شدہ زانیوں کے لئے مخصوص ہے۔ اور شادی شدہ زانیوں کی سزا سنگسار کرنا ہے حتیٰ کہ وہ مر جائیں۔ انہوں نے اس پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے عمل اور قولی روایات سے استدلال کیا ہے۔ لیکن خوارج کی رائے یہ ہے کہ قرآنی نص عام ہے اور اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زنا کی سزا سو کوڑے مارنا ہے اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں کوئی فرق نہیں ہے[1] انہوں نے اس پر ہر طرح کی دلیلوں سے استدلال

[1] اور ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے کہ آیت وَاللّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ

کیا ہے۔ جنہیں امام فخر الدین رازیؒ نے اپنی تفسیر میں تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ غالباً حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں جو کچھ پیش آیا وہ بر سبیل سیاست اور از روئے تعزیر ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے عام شرعی حکم نہیں تھا۔

پھر اخبار آحاد سے اس جیسا فیصلہ دوام قائم نہیں کی جا سکتیں اور یہ کہنا کہ قرآن کریم میں رجم کا حکم نازل ہوا تھا لیکن وہ آیت منسوخ ہو گئی مگر اس کا حکم باقی ہے قطعاً محل نظر ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ آیت جو بذریعہ وحی نازل ہوئی تھی اللہ تعالیٰ نے تو اس کی تلاوت منسوخ کر دی مگر ہم اس آیت کا حکم برقرار رکھنے پر مصر ہیں۔ (المدخل للفقہ الاسلامی لمحمد سلام مدکور ص ۷۳۶-۷۳۷)

نِسَآئِكُمْ (۴/۱۵) [اور جو عورتیں تم میں سے فاحشہ کی مرتکب ہوں] سحاق (چٹی) کے لئے مخصوص ہے جو دو عورتوں کے درمیان رونما ہوا اور آیت وَاللَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا مِنْكُمْ فَآذُوهُمَا (۴/۱۶) [اور جو دو مرد تم میں سے اس کا ارتکاب کریں تو انہیں اذیت دو] لواطت کے ساتھ مخصوص ہے جس میں دو مرد ملوث ہوتے ہیں۔ اور آیت اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي (۲۴/۲) [زناکار عورت اور زناکار مرد] اس فعل زنا کے ساتھ مخصوص ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ان کے اشتراک سے رونما ہو۔ اس طرح امام ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک عزت و آبرو سے متعلق سزا مکمل ہو جاتی ہے (اور تینوں صورتوں کا حکم واضح ہو جاتا ہے)۔ اس طرح یہ تینوں آیتیں محکم ہیں اور ان میں سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔